

چشمِ حیران

نوشابہ صدیقی

چشمِ حیران

نوشابہ صدیقی

AB
ACADEMY BAZYAFT

مشتاق احمد یوسفی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''اگر کوئی شخص ایک بار پروفیسر ہو جائے تب وہ ساری عمر پروفیسر ہی رہتا ہے خواہ بعد میں وہ سمجھ داری کی باتیں کیوں نہ کرنے لگے۔''

یوسفی صاحب کے اس جملے کی تشریح تو ممکن نہیں، مگر ہاں میں اس بات کی گواہی دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نوشابہ نے ہرا گاؤن اتارا ضرور ہے، مگر پروفیسری ان کی ذات سے ہرگز جدا نہیں ہوئی ہے۔ وہ اب بھی صبح سویرے ہی اُٹھتی ہیں۔ وہی صبح کی مصروفیات ہیں جنھیں وہ پروفیسری کے دوران ادا کیا کرتی تھیں۔ بچے البتہ بڑے ہوگئے ہیں اور بڑے ہوکر اپنا گھر دوسرے ممالک میں بسا چکے ہیں۔ لہٰذا صبح صرف ایک پراٹھا بناتی ہیں، مگر ناشتے کی میز پر چاروں بچوں کو آواز دے کر بلاتی ہیں۔ کبھی ان کے لیے پلیٹ رکھتی ہیں اور کبھی یہ مان لیتی ہیں کہ اب ان کے کمروں تک ان کی آواز نہیں جائے گی۔

مجھے یہ بتانے میں کیا عار ہوسکتا ہے کہ ان کا محبوب مشغلہ کوئی ایک نہیں: برتن مانجنا، کھانا پکانا، جھاڑو لگانا، جھاڑ پونچھ کرنا، کپڑے دھونا، استری کرنا اور پودوں کو محبت کی نظر سے دیکھنا سب ہی ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ بہ قول پروفیسر صاحبہ'' گھر جب اپنا ہے تب یہ سارے کام ملازم کیسے کرسکتا ہے۔'' لہٰذا سمجھ لیجیے یہ تمام کام ہمارے گھر دو دو بار ہوتے ہیں۔ ایک بار ملازم کے ہاتھ سے اور دوسری بار مطمئن نہ ہونے پر پروفیسر صاحبہ کے ہاتھوں۔ گویا گھر میں وہ مکمل خاتونِ خانہ ہیں۔

وقت کی پابندی، مطالعہ اور وقت ناوقت لیکچر۔ ایک اچھے پروفیسر کی یہی تو پہچان ہوتی ہے۔ یہ اچھائی ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ بس غنیمت یہ ہے کہ لیکچر معاشیات پر نہیں ہوتا ورنہ قانونِ تقلیل افادہ یا ریکارڈو کا نظریۂ لگان مع فیگر ہمیں پڑھنا پڑتا۔ گھر سے باہر سراپا پروفیسر ہو جاتی ہیں۔

چشمِ حیراں | نوشابہ صدیقی

چشمِ حیراں

(خاکے- مضامین)

نوشابہ صدیقی

اکادمی بازیافت

پہلی اشاعت : جون ۲۰۱۹ء
لے آؤٹ : لیزر پلس،فون:32751324
قیمت : ۵۰۰روپے

contact author:ashernoor@gmail.com

Chashm-e-Hairaan

(Sketches)

By: Naushaba Siddiqui

Kitab Market, Office# 17, St.# 3,
Urdu Bazar, Karachi, Pakistan
Ph: (92-21) 32751428
e-mail: a.bazyaft@gmail.com

ابّا اور امّاں
کے نام
میں جن کی چشمِ حیراں ہوں

حُسنِ ترتیب

اپنی بات

لیجیے ''چشمِ حیراں'' ٹھہر گئی۔ تین سال سے بھٹک رہی تھی۔ جی ہاں بیس سو پندرہ کے درمیان تیار ہوئی اور مع پیشگی زرِ اشاعت پبلشر کے ہاتھوں تک پہنچی اور پھر یہ اندوہ ناک اعلان ہوا کہ آپ کی ''چشمِ حیراں'' تو وہیں کہیں آپ کے گھر میں ہوگی۔

اُس لمحے ایسا چکر آیا کہ میں دروازے کا سہارا لے کر گرنے سے بچ گئی۔ یوں جسم کی ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ گئیں، لیکن دل کرچی کرچی ہو گیا۔

گھر کی تلاشی یوں ضروری نہیں تھی کہ یقین سو فی صدی سے تجاوز کر چکا تھا۔ دفتر کی تلاشی لی گئی اور ذاتی میز کے خانے سے وہ لفافہ دریافت یا بازیافت ہوا جس میں زرِ اشاعت مسودے کے ہم راہ بھیجا گیا تھا۔ ہوتا تو یہ ہوتا کہ لفافہ غائب ہو جاتا کہ وہ اپنے وجود میں چھوٹا اور رقم کی صورت میں بڑا تھا اور مسودہ جو جسمانی طور پر موٹا تھا نہ چُھپ سکتا تھا نہ چُھپایا جا سکتا تھا۔

صبر کرنا دشوار تھا۔ جی جانا محال تھا۔ جی کا جانا لازمی تھا۔ جس کیفیت میں بیس سو سالہ گزرا وہ ایک اذیت ناک طویل بیماری سے کم نہ تھا۔ انتظار رہا کہ چھاپنے والا میرے پاس آئے گا۔ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لفافہ ہوگا جس میں رقم ہوگی، اور وہ کہے گا کہ اگرچہ مسودے کے مقابلے میں رقم کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن اصولاً میں واپس کر رہا ہوں۔ مسودے کی غیر

حاضری پر معاف کر دیں جو نا قابلِ معافی بھی ہے۔ بِن چھپی تحریر کا گم ہو جانا نئے نئے پیدا ہونے والے بچّے کو دفنا دینے والا غم ہوتا ہے جس کا مداوا ممکن نہیں، مگر میں پھر بھی دل بڑا کرتی اور یہی کہتی چلو جانے دو۔ رقم تمھاری ہے۔ تم رکھ لو۔ تمھارا اعترافِ گناہ اور معافی طلب کرنا مجھے میرے دل کو بڑا کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

مگر وہ بڑے ظرف والا نہیں تھا۔ نہ لفافہ آیا، نہ اعتراف، نہ معافی۔ ہاں میرے قلم کو زنگ لگ گیا۔ ان تین سالوں میں مضامین تو کئی لکھے اور چھپے، مگر ''چشمِ حیراں'' کے خاکے ایک ایک لائن سے آگے بڑھ کے نہ دے رہے تھے۔

شخصیات وہ تھیں کہ میں جن کی قلمی مقروض تھی، اور مقروض مرنا کسے پسند ہوتا ہے اور مرنے سے کون بچ پاتا ہے۔ قلم سے بارہا خوشامد کی۔ اُس نے بتایا بھی کہ ایک بار شخصیت پر لکھ دینے کے بعد قلم دوبارہ چل بھی جائے تو تحریر میں وہ مزہ نہیں رہتا ایسا ہی جیسا پہلی محبت کے بعد قصداً کی گئی دوسری محبت ہو۔

سو، یہ قصداً کی گئی دوسری محبت ہے جو اپنی زندگی میں قیمتی لوگوں سے مل کر پہلی محبت کے طور پر کی گئی تھی۔ تحریر اچھی لگے نہ لگے کہ وہ تمام ہستیاں تو دنیا سے جا چکی ہیں کہ وہ شکوہ بھی نہیں کریں گی ماسوائے ایک دو کہ جن کی درازیِ عمر کے لیے دعا گو بھی ہوں۔ قرض ادا کرنے پر خوش ہوں آپ بھی بخوشی اسے پڑھ لیں بین السطور وہ جذبہ بھی پڑھ لیں جو دوسری بار لکھنے پر رہ گیا ہے۔ آپ سے مجھے اچھی امیدیں ہیں کہ مجھے شخص کے طور پر اپنی زندگی میں جتنے لوگ بھی ملے میری چشم نے انھیں حیرانی سے دیکھا۔ کتنے اچھے لوگ ہیں، ایک میں بھی تو کڑواہٹ نہیں تھی۔ ایک بھی تو ایسے نہیں تھے جنھوں نے دل توڑا ہو۔ ایک بھی تو ایسا نہیں تھا جس کے مر جانے پر میں نے ڈھیروں آنسو نہ بہائے ہوں۔ میری چشمِ حیراں ان کے جدا ہو جانے پر چشمِ نم، چشمِ غم بنی رہی۔

دو چار مضامین وہ ہیں جو جلسوں میں پڑھے گئے۔ شخصیات بڑی تھیں سو، دل میں سما گئیں۔ اگرچہ میری چشمِ جستجو نے انھیں دُو بہ دُو نہیں دیکھا، مگر کتابوں کی زینت اور تاریخ میں زندہ تھیں لہٰذا قیمتی تھیں، شامل ہوئیں۔

تحریریں چھپ جانے پر محفوظ ہو جاتی ہیں، بس یہی تو رہ جاتی ہیں ورنہ قلم اور انگلیاں فانی ہیں خواہ انھوں نے شاہ کار ہی تخلیق کیے ہوں۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ایک نصیحت کرنا چاہتی ہوں کہ دنیا میں سب سے آسان کام نصیحت کرنا یا مشورہ دینا ہے۔ ہر تحریر کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مشورہ میں نے خود کو کیوں نہیں دیا؟ یقین جانیے، نہ صرف دیا تھا، بلکہ زندگی بھر اُس پر سختی سے عمل بھی کیا۔

مگر بھروسا ہی تو بھروسے کے قابل لفظ نہیں ہے۔ ایک بار کی غلطی پر بھی معاف نہیں کرتا۔ اسی بھروسے نے میرا اصول توڑا، اور اسی بھروسے نے میری زندگی کے تین سال مجھے ذہنی طور پر بیمار بنائے رکھا۔

اگر آپ کا کوئی اصول نہیں ہے تو بنائیے، اور بنا کر بھروسے کی نذر کرنے کی غلطی کبھی نہ کیجیے گا۔

اپنی بات یہاں تک لکھ کر ایک دوسرے پبلشر صاحب تک پہنچائی جو بارہا یہ فرمائش کر چکے تھے کہ میں اپنی ایک کتاب اُن سے ضرور چھپواؤں۔

میں باتوں میں آ گئی۔ پرانی کہانی سنا کر اُن سے بس ایک التجا کی، ''دیکھیے اب مجھے تحریر گم ہو جانے کا ڈر نہیں کہ اس کی نقل میرے پاس موجود ہے۔ نمونے کے لیے ایک کتاب ہے اسے ساتھ لے جائیے۔ بس میری ''چشمِ حیراں'' کو ایسی ہی پوشاک پہنا دیجیے گا۔ کہیں سے دامن اونچا نیچا یا ٹیڑھا نہ ہو۔ سلائی اُدھڑی ہوئی نہ ہو کہ میں لباس کے معاملے میں ایک اصول پر کاربند ہوں کہ خواہ کپڑا کم قیمت ہو، مگر سلائی میں نفاست ہو۔ آدمی انسان نظر آئے۔''

''میں سمجھ گیا۔ فکر ہی نہ کیجیے۔'' پبلشر صاحب نے میری ایک اور صرف ایک شرط کو بہ قول ان کے انھوں نے پلّو سے باندھ لیا۔ نمونے والی کتاب مسودے کے ساتھ لے کر چلے گئے۔ میں نے ایک بار پھر بھروسے والی غلطی کر لی۔ زیرِ اشاعت ان کے اشاعت گھر پر کتاب چھپنے سے پہلے پہنچا دی۔

''چشمِ حیراں'' مقررہ وقت سے چار ماہ بعد تیار ہو کر جب سامنے آئی تو میری ایک اور صرف ایک شرط کے اس طرح پرخچے اڑائے گئے تھے کہ میری آنکھوں میں پہلے سے

زیادہ حیرانی اتر آئی۔ کئی رات اور کئی دن تو ایسے کٹے جیسے میں زندہ ہی نہیں ہوں، مگر میں زندہ رہی۔ زندگی بھر اللہ نے ایسے منصب پر فائز رکھا جہاں معاف کرنا اور درگزر کرنا ضروری ہوتا ہے کہ سامنے طالب علم ہوتے ہیں۔ جو بچے ہوتے ہیں غلطیاں کرنا جن کا حق اور معاف کرنا استاد کا فرض ہوتا ہے۔ اپنی اسی پختہ عادت کو میں پھر سے استعمال میں لاتی، مگر قصوروار کو نہ معذرت کرنی آتی تھی نہ شرمندہ ہونا۔ مجھے نہ رقم کی واپسی کا مطالبہ آتا ہے نہ اپنے دکھ کا اظہار کرنا۔ ایک بار پھر ٹوٹ پھوٹ گئی۔ کچھ عرصے بعد جب شفایاب ہوئی تب تیسری میز پر ازخود جا کر مسودہ رکھ دیا۔

کہا، ''کتاب خواہ پھٹی پرانی ہو، صفحات خواہ زرد پڑ گئے ہوں، سلائی چاہے جا بہ جا سے اُدھڑ گئی ہو، حروف مٹ بھی گئے ہوں، جلد دہری ہوگئی ہو، کتاب تو کتاب ہوتی ہے۔ بیٹھے ہوں تو آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے، لیٹے ہوں تو سینے پر سوار ہو کر اپنی اہمیت جتاتی ہے اور رکھ دی جائے تو اونچائی پر اپنی جگہ بناتی ہے۔ خواہ میز ہو، الماری ہو یا شیلف ہو۔''

''مگر...'' میں نے اٹکتے اٹکتے آگے کہا، ''اگر وسائل ہوں، اگر ہنر ہو، چاہت ہو، سلیقہ ہو تو کتاب کو بھی ایسا ہی پیرہن پہنانا چاہیے جیسا اہتمام ہم اپنے لباس کے لیے کرتے ہیں۔ اونچا نیچا دامن نہ ہو، کمر چست نہ ہو، لمبائی پاؤں کو نہ چھوتی ہو، رنگ جاذبِ نظر ہو۔ تب لباس پہننے والا شخص معقول ٹھہرایا جاتا ہے کہ میں اس قول کی پابند ہوں کہ کسی فرد سے فرد کی ملاقات بعد میں ہوتی ہے لباس سے ملاقات پہلے ہوجاتی ہے۔'' نمونے کی کتاب اُن ہی کی میز سے اٹھا کر ان ہی کی میز پر رکھ کر چلی آئی۔ اللہ کرے انھیں میری بات سمجھ میں آ گئی ہو۔

بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ اب جہاں میں گئی ہوں وہاں میں پہلی بار بھی گئی تھی۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر اتر آئی تھی کہ میں جانتی تھی میری تحریروں میں اتنا دم کہاں کہ میں ساری سیڑھیاں چڑھ جاؤں، مگر اب میں اپنی یہی تحریر لے کر معیاری ادارے کو سونپ کر آ گئی ہوں۔ بغیر شرمائے۔ بغیر جھجکے۔ اب میں ہرگز ایک بار اور ''اپنی بات'' تحریر کرنے کے قابل نہیں، اور آپ بھی یقیناً تیسرے چوتھے پبلشرز کی کہانی سننے سے کترا رہے ہوں گے۔

شخصیتوں کی کہانیاں آپ کے سامنے ہیں۔ انھیں ادبی اور تنقیدی نظروں سے نہیں، بلکہ انھیں چلتے پھرتے دیکھیے۔

○

مسکراتے ہوئے... جالبی صاحب

اسّی کی دہائی تھی، جالبی صاحب عمرہ کر کے لوٹے تھے۔ میرا بے اختیار جی چاہا کہ اپنے گھر پر ان کی دعوت کروں۔ خواہش کا اظہار خاور سے کیا۔ خاور نے کہا ابّا سے بات کر کے بتاؤں گا۔ ان دنوں ہم لوگ ہفتے میں دو تین روز ضرور ملا کرتے تھے۔ خاور نے ایک ملاقات میں خوش خبری سنائی، میں ابا اور امی کو لے کر کل آپ کے گھر آ رہا ہوں۔ مجھے اچھا کھانا پکانا نہ پہلے آتا تھا نہ اب، لیکن دعوتیں کرنا میرا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ رہا ہے۔ ذائقہ اچھا نہ بھی ہو، مگر میز سجانا اور ڈش کی ڈیکوریشن میں مجھے خاصی دل چسپی رہی ہے۔ اپنے گھر میں ہر طرح کی ہلکی اور تیز رنگ برنگی روشنی حتیٰ کہ اسپاٹ لائٹ تک کا اہتمام کر رکھا ہے، تاکہ میز پر رکھا کھانا ذائقے میں نہ سہی رنگ میں خوب صورت ضرور نظر آئے۔ اس دن سجاوٹ خصوصی طور پر کی۔ سجاوٹ میں سلاد کی ڈش بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ میں نے کھیرا، گاجر، ٹماٹر اور دیگر سبزیوں کی کاٹ چھانٹ کر کے ایک درخت کی شکل دی اور پلیٹ میں یوں سجایا کہ میز کی شان دوبالا ہوگئی۔ بریانی کے علاوہ سادے چاول کو ایک ڈش میں ایسے سجایا کہ وہ پاکستان کا جھنڈا نظر آئے۔ جس کے لیے ایک ایسی پلیٹ استعمال کی کہ جس میں زیادہ حصہ سبز چاول اور بائیں ہاتھ پر مختصر حصہ سفید چاولوں کا تھا۔ سبز حصے میں سفید چاول سے چاند ستارہ بنایا اور پلیٹ کو بائیں جانب ہری پیاز کی لمبی سی ڈنڈی سے ڈنڈے کی

شکل دے کر میز کے درمیان رکھ دیا کہ وہ اور بھی نمایاں ہو جائے۔

سوپ بنانے میں مجھے اعتماد حاصل ہے۔ اس کے لیے برتن بطورِ خاص جمع کیے ہوئے ہیں۔ میز سجا کر جالبی صاحب کا انتظار بے چینی سے کرنے لگی۔ اس دن میرا جوش ہمیشہ سے زیادہ تھا اور یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اُردو ادب کا چاند ستارہ میرے گھر اترنے والا ہے۔

مجھے جالبی صاحب ہمیشہ بہت اچھے لگے۔ اچھے یوں کہ مجھے دیکھ کر وہ ایسے مسکراتے جیسے کہ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوں۔ وہ خوش ہوتے ہوں یا نہیں، مگر مجھے ایسا محسوس کرنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اپنے اندر اپنے آپ وقار پیدا کرنے میں تو آزاد تھی نا۔ سو، یہ آزادی میں ہمیشہ محسوس کر لیا کرتی، لیکن میں اس کے لیے دلیل بھی رکھتی تھی۔ ''پاکستان نیشنل اکیڈمی'' جس کے روحِ رواں خاور جمیل تھے، اس کی تقاریب کراچی کی ادبی فضا میں مثال کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس سلیقے اور قرینے سے اس کا انعقاد ہوتا تھا وہ ہی جانتا ہے جس نے ان تقاریب میں شرکت کی ہو۔ ہر تقریب میں جالبی صاحب ضرور شرکت کرتے، ہمیشہ حاضرین میں بیٹھنے کو ترجیح دیتے، لیکن اکثر ہمارے اصرار پر اسٹیج پر بھی آ جاتے۔

یہ ادبی تنظیم کم از کم پچیس سال یوں رنگ بکھیرتی رہی کہ اگر اس کی باقاعدہ تاریخ لکھی جائے تو کراچی شہر کی ادبی تاریخ کا باقاعدہ ایک باب بن جائے۔ ہم نے ان تقاریب میں کمال کے لوگوں کو مدعو کیا۔ انھوں نے کمال باتیں کیں۔ حاضرین کی دل چسپی کا حال یوں تھا کہ ہر ایک اپنی رائے سے ہمیں نوازتا۔ کوئی غیر متعلق فرد موجود نہ ہوتا جسے ادب سے لگاؤ نہ ہوتا۔ مجھے یہ جملہ یوں لکھنا پڑا کہ آج کی تقاریب میں ڈھونڈے سے کوئی شاعر ادیب شرکت کرتا ہے۔ بس اسٹیج پر بیٹھے لائق لوگ اپنی خوب صورت باتیں تو کرتے ہیں، لیکن سننے والا، سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ ان دنوں ان تقاریب سے میں نے جتنا کچھ سیکھا ہے آج تک وہی کام آ رہا ہے۔ ان تقاریب کی نظامت میرے حصے میں آتی۔ اگر مجھے کوئی دقت پیش آتی اور میں ان تاریخوں میں شرکت نہ کر پاتی تب وہ تقریب منعقد ہی نہیں ہوتی، ملتوی کر دی جاتی۔

جالبی صاحب میری نظامت سنتے اور اسے بہتر بنانے میں جو مشورہ دیتے وہ میرے

بہت کام آتا۔ ایک بار انھوں نے مجھے یوں بولتے سنا، ''صدرِ محفل، مہمانِ خصوصی اور محترم سامعین!'' تقریب کے اختتام پر مجھے سمجھایا کہ کسی تقریب میں ''سامعین'' کہہ کر مخاطب نہیں کیا جاتا، آئندہ احتیاط کرنا۔ سامعین ریڈیو کے لیے مخصوص ہے۔ میں نے یہ اصلاح پلّو سے باندھ لی۔ ایک بار یہ کہہ کر انھوں نے میرے خون کی روانی تیز کر دی کہ ''تم نے بہت اچھی نظامت کی ہے۔ نظامت کے لیے موضوع پر مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے تم نے خاطر خواہ مطالعہ کیا ہے''۔ مجھے آج تک یاد ہے وہ تقریب خاکہ نویسی پر تھی اور میں نے نظامت میں جا بہ جا اردو میں خاکہ نویسی کے مختلف ادوار کو مختصراً اُجاگر کیا تھا، جب کہ خاکے پر گفتگو کرنے والوں نے محنت نہیں کی تھی۔

میں بہت محنتی بھی نہیں تھی، مگر مجھے ہمیشہ یہ احساس رہتا کہ جالبی صاحب حاضرین میں موجود ہوں گے، تب تقریب سے پہلے والی رات موضوع پر پڑھنے میں گزرتی۔ ایک بار میں نے تلفظ کی بھی غلطی کی۔ لفظ 'الفاظ' کے الف کے نیچے زیر لگا کر تواتر سے بولتی رہی۔ نماز کے وقفے میں جالبی صاحب نے زبر لگانے کی تلقین کی۔

ہر تقریب میں مجھے جالبی صاحب سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا۔ ان کے ستائشی جملے مجھے رات بھر سونے نہیں دیتے کہ بھلا جمیل جالبی صاحب جیسے دانش ور اور ادیب میرے لیے کچھ اچھا کہیں، نصیب نہیں تو اور کیا ہے؟

خاور سے ملاقات کیا ہوئی کہ جالبی صاحب کی قربت مل گئی۔ عام حالات میں صرف تقاریب کی ملاقات ہی تو ہو پاتی جیسا کہ دوسروں سے ہوتی رہی۔

خاور سے ملاقات بھی ڈرامائی تھی۔ میں صدر کے علاقے کے اسٹیٹ بینک فلیٹ میں رہتی تھی۔ ہمارے سامنے والے پڑوسی نے ایک دن میرے میاں سے کہا کہ ''آپ کی بیگم سے ہمیں کچھ کام ہے، کیا ملاقات ہو سکتی ہے؟''

میرے میاں نے کام کی نوعیت جانے بغیر مجھے ان سے ملا دیا۔ وہ صاحب بھی اسٹیٹ بینک ہی میں ملازم تھے۔ کہنے لگے، ہمارے ایک دوست ہیں وہ ایک ادبی انجمن کے تحت تقاریب کرتے رہتے ہیں۔ انھیں نظامت کے لیے کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جو ادب

سے دل چسپی رکھتا ہو اور تقریب میں بول سکتا ہو۔

میری بھی نو جوانی تھی۔ ایسی باتوں پر جلد ہی خوش ہو جاتی تھی کہ کسی نے مجھ میں یہ صلاحیت دیکھی ہے۔ پوچھا بھی نہیں کہ آپ کو کیسے پتا کہ میں ادب میں دل چسپی رکھتی ہوں اور بول بھی لیتی ہوں۔ فرض کرلیا کہ میری پروفیسری سے انھوں نے یہ بھی اخذ کرلیا ہوگا کہ بول تو سکتی ہوں۔ راضی ہوگئی۔

اگر چہ یہ وہ وقت تھا کہ زندگی میں وقت ہی نہ تھا۔ دو بچے تھے۔ صبح سے شام تک کی ملازمت تھی۔ گھریلو ذمے داریاں تھیں، مگر شوق اپنی جگہ۔ یوں خاور جمیل سے ملاقات ہوئی اور جالبی صاحب کا کہنا تھا کہ اب نیشنل اکیڈمی میں نظامت کی ملازمت بس میرے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا۔

جالبی صاحب اس دن جب میرے گھر آئے تب میری خوشی دیدنی تھی۔ وہی صاف ستھرا لباس، خوب صورت زیرِلب مسکراہٹ، حوصلہ بڑھانے والا انداز، نپی تلی گفتگو اور جب انھوں نے بچی سجائی میز دیکھی تب ان کی پسندیدگی میری زندگی کو بہت سارے حوصلے بخش گئی۔ پاکستانی جھنڈے والی ڈش انھوں نے کھانے سے انکار کردیا۔ ''بھئی جھنڈا کیسے کھالوں؟''

ان کا یہ جملہ آج بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ میں نے کہا بھی، یہ صرف سجاوٹ کے لیے ہے۔ سوپ کی تعریف کچھ یوں کی کہ اگلی دو چار ملاقات میں بھی سوپ کا تذکرہ کیے بغیر نہ رہتے۔ کہنے بھی لگے، یوں ہی تعریف نہیں کر رہا ہوں واقعی سوپ بہت اچھا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک میں نے اپنے آپ کو سب سے اچھا سوپ بنانے والا مان لیا۔

ان دنوں ہم ہفتے میں کم از کم دو دن ضرور جالبی صاحب کے گھر جاتے۔ ہمارا چھ لوگوں کا گروپ تھا۔ خاور، ان کی بیگم، نذر بھائی معروف افسانہ نگار، طلعت مقامی کالج میں تاریخ کی پروفیسر، میں اور میرے میاں نثار۔ ہمارے درمیان اتنی باتیں ہوتیں کہ ناقابلِ یقین۔ آج سوچیں تو موضوع کچھ ہوتا ہی نہیں تھا۔ بس دو چار جملے کچھ ایسے گڑھ لیے جاتے کہ اس پر ہنستے ہنستے ہم دہرے ہو جاتے۔ آئندہ ملاقات میں کچھ اور جملے مل جاتے۔

ہم لوگوں سے ملنے جالبی صاحب ضرور آتے خواہ دو چار منٹ کے لیے ہی، یہ دو چار

منٹ بالخصوص میرے لیے بہت قیمتی ہوتے۔

ان ہی دنوں میں بہت بیمار ہوئی۔ بیماری طویل ہوگئی۔ ہماری محفل تقریباً سال بھر کے لیے بکھر گئی اور جب میں صحت یاب ہوگئی تب جالبی صاحب نے مجھ سے کہا، ''میں نے تمھاری صحت یابی کے لیے بہت دعا مانگی تھی۔'' میرے لیے ان کے یہ جملے کتنے قیمتی تھے، یہ میں ہی جانتی تھی۔

ہم نے نیشنل اکیڈمی کی سلور جوبلی منائی۔ ان دنوں ہماری محفل روزانہ جالبی صاحب ہی کے گھر منعقد ہوتی۔ ہم سب ملازمت کرتے تھے۔ شام میں گھر آتے، بچوں کو پڑھاتے، کھلاتے، سلاتے اور پھر رات گئے ایک دوسرے سے ملتے گھروں کے درمیان فاصلہ تھا، ہم کلفٹن میں، خاور ناظم آباد میں، طلعت اور نذر بھائی فیڈرل بی ایریا میں، لیکن کراچی ان دنوں پرسکون تھا۔ رات رات بھر سڑکوں پر پھریں کوئی ڈر نہ ہوتا۔ ہم سب سلور جوبلی کے لیے کام کرتے۔ جالبی صاحب وقفے وقفے سے ہماری محفل میں آجاتے۔ لگن سے کام کرتا دیکھ کر بہت خوش ہوتے، ہماری ہمت بڑھاتے، مشورے دیتے، تحریروں کی اصلاح کرتے۔ ہمارے سامنے کھانے پینے کی چیزیں سجی رہتیں۔ یہ ڈیوٹی زینت کی تھی اور وہ کھانے پلانے کا ازحد شوق رکھتی تھیں۔ یہ دن بہت خوب صورت تھے، جالبی صاحب کی لائبریری دیکھی، کتابوں سے ان کا عشق دیکھا۔ ان کی گھریلو خوش حال زندگی دیکھی۔ ان سے خوب باتیں کیں۔ بے تکلف ہوئے اور بات بات میں بہت سی بات سیکھ گئے۔

ان ہی دنوں ایک دن انھوں نے مجھے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان پر گفتگو کرنے کے لیے تیار کیا۔ کہنے لگے، میں تمھیں ایک روز کا واقعہ بتاتا ہوں۔ وہ مصطفیٰ صاحب کا نام بہت احترام سے لیتے۔ کہنے لگے، دسترخوان لگا تھا۔ ہم کھانے کے لیے بیٹھے تھے۔ دونوں آمنے سامنے تھے کہ یکا یک مصطفیٰ صاحب نے ایک نوالہ میرے منہ کے آگے بڑھایا۔ میں نے ان کی جانب دیکھا، مصطفیٰ صاحب کی آنکھوں سے روشنی کی ایک لکیر نکلی جو میرے جسم میں سرایت ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ میں ڈر گیا اور سمجھ بھی گیا۔ میں نے کہا، ''استادمحترم! میں یہ بار برداشت نہیں کر پاؤں گا، میں اس کام کے لیے بنا ہی نہیں، مجھ پر رحم کریں۔'' انھوں نے

نوالہ اپنے منہ میں ڈال لیا۔ نظریں نیچی کرلیں اور بقیہ کھانا میں نے جس طرح کھایا میں ہی جانتا ہوں۔

کچھ دنوں بعد انھوں نے مجھ سے کہا، میں اپنی شخصیت تم میں منتقل کرنا چاہتا تھا، تم نے انکار کردیا۔

میں نے شرمندگی اور عاجزی سے کہا، میں اس کام کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ پھر انھوں نے مجھے دعا دی، تم نے ادب کا جوراستہ اپنے لیے چنا ہے، اللہ تعالیٰ تمھیں اس میدان کا شہسوار بنائے۔

نوشابہ انھوں نے مجھے دل سے مخاطب کیا تھا۔ یہ جو میں نے اردو ادب کی تاریخ لکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے، یہ کام بڑی قوت اور طاقت مانگتا ہے۔ میں اس کام کا بھی اہل نہیں ہوں کہ یہ کام اداروں کا ہے، ایک فرد کا نہیں۔ میں اکیلا نہیں کرسکتا ہوں یہ کام۔ جگہ جگہ رک جاتا ہوں۔ حوصلہ ہار بیٹھتا ہوں پھر کرنے لگتا ہوں، اور جب کرنے لگتا ہوں تب مجھے مصطفیٰ صاحب کی دعا یاد آجاتی ہے۔ بس یقین کرو اسی دعا کے سہارے میرا قلم اور میرا ذہن چل رہا ہے۔ جانتی ہو دعا کی زندگی میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ میں خوش نصیب ہوں مجھے مصطفیٰ صاحب جیسی شخصیت کی دعا ملی ہے۔

میں نے بھی دعا کے بارے میں بہت پڑھ رکھا تھا کہ دعا بھی دراصل عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ تقدیر تو لکھ دی جاتی ہے۔ لکھی ہوئی یہ تحریر پھر بدلتی نہیں، مگر ہاں صرف دعا میں یہ طاقت ہے کہ تقدیر کی تحریر کو بھی بدل ڈالتی ہے۔ میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ عاجزی سے مانگنے والی کوئی بھی جائز دعا قدرت رد نہیں کرتی۔ دنیا میں ہی پوری کردی جاتی ہے۔ اگر جیتے جی نہیں پوری ہوتی تب فضا میں معلق ہوجاتی ہے اور روزِ جزا وہ پوری ہوجاتی ہے۔ اللہ مانگی ہوئی دعا کو رد ہی نہیں کرتا۔

یہ سب پڑھی ہوئی باتیں تھیں میرا اس پر یقین بھی تھا، مگر جالبی صاحب کی گفتگو کے بعد کہ مصطفیٰ صاحب کی دعا نے انھیں اردو ادب کا بادشاہ بنادیا، یقین اور بھی پختہ ہوگیا۔

ایک دن میں نے جالبی صاحب سے شکوہ کیا، آپ شہر میں ہونے والی تقاریب میں نہیں آتے۔ آپ کی باتیں سننے ہم جاتے ہیں۔ ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے، تشنگی دور ہوتی ہے۔

کہنے لگے، لوگوں کی مہربانی کہ مجھے بلاتے ہیں، منصبِ صدارت پر بٹھانے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور پھر معذرت کرلیتا ہوں کہ میں تقریب کا آدمی ہی نہیں ہوں۔

لیکن جالبی صاحب ،ہمارا کیا قصور؟ ہم تو محروم رہ جاتے ہیں نا، میں نے شکوہ کیا۔

اپنی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ بولے، تمھاری محبت ہے، گھر آجایا کرو،تم تو اپنی محرومی مطالعے سے بھی دور کرسکتی ہو، مگر مجھے بھی تو صرف ایک ہی زندگی ملی ہے۔ میرے پاس لکھنے کے لیے وقت کم ہے کام بہت زیادہ ہے۔ ایک زندگی اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ مجھے تاریخِ ادبِ اردو مکمل کرنی ہے۔ جو مجھ سے میرا وقت مانگتی ہے۔ تقاریب کوتو لوگ وقت کے ساتھ بھول جائیں گے،مگر لکھی ہوئی میری کتاب ہمیشہ زندہ رہے گی اور ہمیشہ پڑھی بھی جائے گی۔

جالبی صاحب کی یہ بات سو فی صد درست ہے۔ تحریر ہمیشہ زندہ رہتی ہے، سانس لیتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو یہ صلاحیت دی ہے انھیں لکھتے رہنا چاہیے۔ لائبریری کی بک شیلف کتابوں سے کبھی دغا نہیں کرتی۔ تقاریب کے لوگ بھلا دیے جاتے ہیں، صاحبِ صدر بننا یا مہمانِ خصوصی بننا وقتی تسکین ہے۔ یہ تسکین وقت گزرنے کے ساتھ مرجاتی ہے۔

میں جب بھی جالبی صاحب کے ہاتھوں کو دیکھتی جوش صاحب کا مصرع فوراً یاد آجاتا:

لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں انگلیاں

جالبی صاحب ۱۹۸۳ء میں جب کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بنے تب میں نے انھیں مبارک باد دی۔

وہ میرے برابر بیٹھ گئے۔ سرگوشی میں کہنے لگے، آج تمھیں ایک بات بتاؤں؟ میں ہمہ تن گوش تھی۔

میں انکم ٹیکس کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ ابھی ترقی کے اور بھی امکانات تھے، میں مطمئن تھا، مگر مصطفیٰ صاحب کا اصرار تھا کہ میں پی ایچ ڈی کرلوں۔ میں نے ان سے جرح بھی کی کہ میرا شعبہ قطعی مختلف ہے، مجھے اس سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟

اچھا تو میرے کہنے سے ہی کرلو۔ مصطفیٰ صاحب نے کہا۔ ڈگری حاصل کرکے گھر

کے کسی کونے میں ڈال دینا۔

میرے لیے ان کا اصرار بہت اہمیت رکھتا تھا۔ میں نے یہ کام کر ڈالا۔

آج دیکھو جب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کے انتخاب کے لیے میرا نام منظور کیا گیا تب مجھے مصطفیٰ صاحب کی بات یاد آ گئی۔ کونے میں پڑی پی ایچ ڈی کی ڈگری نے مجھے وائس چانسلر بنا دیا۔ یقیناً یہ عہدہ میرے لیے باعثِ اعزاز ہے۔ جانتی ہو میں انکم ٹیکس کے محکمے میں تھا، لیکن میرے کام کی ابتدا تدریس سے ہوئی تھی۔ میں بہادر یار جنگ اسکول، کراچی میں ہیڈ ماسٹر تھا، آج وائس چانسلر بن کر اپنی ہیڈ ماسٹری یاد کر رہا ہوں۔ جو ابتدا تھی اختتام بھی تو اسی پر ہونا تھا۔ یہ قدرت کے کھیل ہوتے ہیں۔

کہنے لگے، بڑوں کی باتوں پر جرح نہیں کرنی چاہیے۔ ہم جہاں تک دیکھ سکتے ہیں بڑے اس سے بھی آگے دیکھ سکتے ہیں۔

جالبی صاحب سے جب بھی بات ہوتی مجھے زندگی گزارنے کے کتنے ہی نکتے ہاتھ آ جاتے ہیں۔

ایک بار کہنے لگے، اگر تمھیں کچھ چاہیے تو اپنی خواہش کو اتنا شدید بنالو کہ خواہش کو پورا ہی ہونا پڑے۔ اب میری سنو، انھوں نے کہا۔ مجھے کتاب لکھنے کی بچپن ہی میں بڑی خواہش تھی۔ میں اسکول میں پڑھتا تھا اور ان دنوں ہی چاہتا تھا کہ کسی کتاب پر بطور مصنف میرا نام ہو۔ میں چپکے سے مختلف کتابوں کے اوراق پھاڑتا۔ اِدھر اُدھر کے اوراق کو جمع کر کے ایک نئی کتاب بناتا اور ایک سادہ صفحہ شروع میں لگا کر اس پر اپنا نام لکھ دیتا اور کئی دنوں تک، اسے تکیے کے نیچے سے نکال کر دیکھتا اور خوش ہوتا رہتا کہ میں نے ایک کتاب لکھ لی ہے اور مصنف بن گیا ہوں۔

اس شدید خواہش نے مجھے آخر کار ادیب بنا دیا۔ اب دیکھو سچ مچ کی کئی کتابوں پر میرا نام لکھا ہوا ہے۔ اگر میں اس بات کی شدید خواہش نہیں رکھتا تب میں آج ایک انکم ٹیکس کمشنر سے آگے اور کیا بنتا، اور کون جانتا یا یاد رکھتا کہ میں بھی کبھی اس عہدے پر فائز تھا، لیکن کتابیں میرا تعارف ہر زمانے میں کراتی رہیں گی۔

گفتگو کے آخر میں پھر ہلکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آئی جو مجھے ہمیشہ بہت اچھی لگتی۔ پان کی ہلکی سی لکیر بھی اس مسکراہٹ میں ان کا ساتھ دیتی۔

وہ ہمیشہ کہتے خاور سے تمھاری دوستی ہے، مجھے یہ دوستی بہت اچھی لگتی ہے۔تم لوگوں کی دوستی کو کسی کی نظر نہیں لگنی چاہیے۔ میں اکثر خاور کو فون کرتی،فون جالبی صاحب ہی اٹھاتے، کہ ان دنوں موبائل ایجاد نہیں ہوا تھا۔ کہتے، بھئی میں تو ڈاکیا ہوں تمھاری بات اس تک پہنچادوں گا۔ میں ہر بار شرمندہ ہوتی وہ ہر بار اپنے آپ کو ڈاکیا ہی کہتے۔

ملتے جلتے، ہنستے مسکراتے بہت سارے سال گزر گئے۔ ہم لوگوں کے بچے بڑے ہوگئے، ہماری عمریں آگے بڑھ گئیں۔ دوستی اللہ کے فضل سے سلامت ہے، مگر اب نیشنل اکیڈمی کی تقاریب ماضی بن گئیں، جب کہ ہر بار جالبی صاحب اپنی خواہش دہراتے رہے، اکیڈمی کو پھر سے فعال کرو، مگر نذر بھائی جنھوں نذرالحسن صدیقی کے نام سے افسانے کی دنیا میں نام کمایا تھا، اس دنیا میں نہیں رہے اور خاور ملازمت کے تبادلوں کے باعث ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے رہے۔ ہم اس امید پر آج بھی بچے کھچے لوگ ملتے ہیں کہ زندگی میں شاید پھر فرصت مل جائے تو جالبی صاحب کی خواہش پوری کریں گے۔ہاں جالبی صاحب کا قلم ان تمام دنوں میں بھی مسلسل چلتا رہا۔

''تاریخِ ادب اردو'' مکمل ہوئی۔ لغت پر بھی کام تمام ہوا، مگر زندگی نے جو وقت انھیں لکھتے رہنے کے لیے دیا تھا وہ بھی ختم ہوگیا۔انسان کے جسم میں بس ایک وقت تک ہی طاقت رہتی ہے پھر دل و دماغ، انگلیاں اور احساس سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ قائم رہ جانے والی ذات بس اللہ کی ہے، اور اللہ جسے شہرت دے،عزت دے وہ ضرور قائم رہتی ہے۔ اللہ نے جالبی صاحب کے حصے میں جو شہرت اور عزت لکھ دی تھی وہ انھیں مل کر رہی کہ انھوں نے اللہ کی دی ہوئی مہلت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

جالبی صاحب آرٹس کونسل کی اس آخری تقریب میں شریک ہوئے جو پرتو روہیلہ کی کتاب کے سلسلے میں منعقد ہوئی تھی۔

میں بھی حاضرین میں سے ایک تھی اور کیوں نہ ہوتی پرتو روہیلہ کی کئی کتابوں کی

نظامت میرے حصے میں آئی تھی اور اب بہت دنوں بعد میری ان سے ملاقات اسی تقریب میں ممکن تھی کہ اب وہ کراچی میں نہیں رہتے۔ پھر جالبی صاحب بھی حقِ رفاقت نبھانے موجود تھے۔

صدارتی خطبہ پڑھنے کا وقت آیا تب جالبی صاحب کی نظر دوسری لائن میں بیٹھی مجھ پر پڑی۔ انھوں نے خاور کو اشارے سے بلایا اور اپنی لکھی ہوئی تحریر اسے پکڑا کر ہدایت کی، ''نوشابہ سے پڑھوادو۔''

میرے لیے یہ سخت امتحان تھا۔ میں بہت بار ان کی موجودگی میں بولی تھی، مگر ان کی لکھی تقریر میں پڑھوں، یہ میرے بس سے باہر بات تھی، اگرچہ سعادت بھی بڑی تھی۔

''نہیں میں کیسے پڑھ سکتی ہوں؟'' میں نے خاور سے گھبرا کر کہا۔ ''بھئی ابا کی خواہش ہے انھیں بولنے میں بھی دقت ہے، لکھ کر تو لائے ہیں، آئے صرف پرتو روہیلہ کی محبت میں ہیں۔'' خاور نے مجھے آمادہ کیا۔

یہ میرا بہت بڑا امتحان تھا۔ نام جالبی صاحب کا پکارا گیا اور خطبۂ صدارت پڑھنے حاضرین میں سے میں اٹھی۔

لوگوں نے پریشانی سے دیکھا، مگر مجھ سے زیادہ کون پریشان تھا۔ بہرحال ہمت کی، محسوس ہوا کہ پہلی بار اسٹیج پر جارہی ہوں۔ پہلی بار روسٹرم کے سامنے کھڑی ہورہی ہوں اور پہلی بار مائک سامنے ہے، زندگی بھر کا تجربہ بے کار گیا۔

میں نے ابتدا ان الفاظ سے کی کہ جالبی صاحب کی تحریر ہے مجھ سے یقیناً غلطی سرزد ہوگی۔ الفاظ کی بھی اور تلفظ کی بھی۔ مجھے معاف کردیجیے گا اور پرتو روہیلہ صاحب آپ کی کئی کتابوں کی نظامت میں نے کی تھی، آج آپ نے اپنی اس تازہ کتاب کی نظامت مجھ سے نہیں کرائی، اتنے بہت سارے سال گزر گئے اس لیے آپ مجھے بھول گئے، مگر مجھے دیکھیے کسی نہ کسی طرح میں آپ کی تقریب میں داخل تو ہو ہی گئی۔ جالبی صاحب مسکرائے، اور پرتو روہیلہ کو ماضی یاد آ گیا اور انھوں نے ہمیشہ کی طرح قہقہہ لگایا۔ مسکراہٹ اور قہقہے دونوں نے مل کر میرا حوصلہ بحال کردیا۔ جالبی صاحب کا خطبۂ صدارت یوں پڑھا کہ سچ مچ صاحبِ صدر میں ہی تو ہوں۔

جب حاضرین کے درمیان جا کر بیٹھ گئی تب جالبی صاحب نے اپنی روایتی محبت کے

ساتھ مجھے پورے نمبر دے دیے اور کسی غلطی کے نمبر بھی نہیں کاٹے۔

بڑے لوگ کس کس طرح چھوٹے لوگوں کو جینے کا حوصلہ فراہم کرتے ہیں، ان میں کیسی جوت جگاتے ہیں، میں پورے طور پر محسوس کر رہی تھی۔

اس تقریب کے بعد جالبی صاحب اب کسی تقریب میں شرکت کے قابل نہیں۔ وہ اپنا بھرپور کام مکمل کر کے اپنے مضمحل قویٰ کے ساتھ سرخ رو ہوئے گھر پر ہی ہیں۔

میں ان سے ملنے جاتی رہی، اب ان کے اور میرے گھر کے درمیان صرف پانچ منٹ کا فاصلہ ہے کہ وہ ناظم آباد سے ڈیفنس آ چکے ہیں۔ کراچی کی راتیں ہی نہیں دن بھی خوف ناک ہیں۔ ہم سب پر بھی وقت بہت گزر چکا ہے۔ کم کم گھر سے نکلتے ہیں۔ ہفتے میں دو دن کبھی میریٹ کبھی شیرٹن ہوٹل میں رات گئے دیر تک بیٹھنے کے دن بھی گئے۔ جب ہم وہاں کے گلوکار سے پرانی فلموں کے گانوں کی فرمائش کرتے اور نامعلوم موسیقاروں سے کہتے، میوزک ہلکی کرو کہ ہم چھ عدد دوستوں کو دنیا جہان کی باتیں کرنی ہیں۔ وہاں ہمیں شہر کے شناسا لوگ بیٹھے ملتے۔ عجیب و غریب حرکات کے ساتھ کہ یقین بھی نہیں آتا تھا کہ دن کے اُجالے میں وہ اجلے کیسے ہو جاتے ہیں۔

ہم دوستوں کا گروپ بکھر چکا ہے۔ چھوٹے بچے بڑے ہو گئے، دوسرے ملک میں تیسرے درجے کے شہری بن کر روزی کما رہے ہیں۔ ہمارے پاس اب وقت ہے، مگر عمر اپنے آپ کو جتانے لگتی ہے۔ میں جالبی صاحب سے کیے گئے اپنے اس وعدے پر قائم ہوں۔ دوستی برقرار رکھنا۔ خاور سے آج بھی دوستی ہے اور یہی دکھانے کل میں جالبی صاحب کے پاس جاتی ہوں۔ وہ وہیل چیئر پر ہوتے ہیں۔ آنٹی گم صم مجھے دیکھتی رہتی ہیں۔ ذہن میں شاید بھولی بسری کوئی شناخت موجود ہے۔ جالبی صاحب نے البتہ پہچان کرا پنی اسی خوب صورت مسکراہٹ سے ہمیشہ استقبال کیا۔ جو مجھے ان کی شخصیت کا سب سے اہم حصہ لگتی تھی اور لگتی ہے۔

مگر اپریل کی اٹھارہ تاریخ اُن کی زندگی کی آخری تاریخ تھی، آ کر رہی۔ اسی دن میری فلائٹ بحرین کے لیے بک تھی، اور اسی دن خاور کو میرے گھر آنا بھی تھا کہ ہمیں بیٹھ کر بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ گزرے دنوں کو یاد کرنا تھا، مگر جب خاور تیار ہو کر میرے گھر آنے

سے پہلے جالبی صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تب جالبی صاحب نے دنیا کو خداحافظ کہہ دیا۔ خاور نے مجھے فون کیا۔ ایسے فون بہت برے ہوتے ہیں خواہ دوسری طرف کوئی بہت محبوب شخص ہی مخاطب ہو۔

میں جالبی صاحب کے آخری دیدار کو پہنچ گئی۔ بہت سارے لوگوں کے موجود ہونے کے باوجود گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ آناً فاناً یہ افسوس ناک خبر شہر ہی کیا ملک بھر میں پھیل گئی۔ میڈیا کا ایک ہجوم تھا جو خاور کے گرد گھوم رہا تھا۔

خاور جو جالبی صاحب کی سب سے بڑے اور لائق بیٹے ہیں، اور جنھوں نے جالبی صاحب کو اسی محبت سے سالوں رکھا جس محبت سے جالبی صاحب نے ان کی پرورش کی تھی۔ مجھے دیکھ کر خاور نے میڈیا کا رخ میری طرف موڑ دیا۔ ایسے جیسے کہ میں بھی جالبی صاحب کی ہی اولاد ہوں یہ فریضہ اب میں ادا کروں۔ پھر میں نے ٹی وی کے ہر چینل کو اپنی یادوں سے بھری گفتگو سونپ دی، مگر میں تو میڈیا سے نہیں جالبی صاحب سے مخاطب ہونا چاہتی تھی۔ مجھے پوچھنا تھا کہ آپ نے آج ہی دنیا سے جانے کا کیوں کر سوچا کہ آج ہی میں وطن سے بس کچھ عرصے کے لیے دور جا رہی ہوں۔ آج کے بعد شہر میں بہت ساری تقاریب ہوں گی جس میں، میں موجود نہیں ہوں گی۔ آپ پر گفتگو کرنے والے شہر میں بہت سے استاد شاعر ادیب دانش ور موجود ہیں۔ وہ اظہارِ خیال کریں گے۔ آپ تو اردو ادب کے بادشاہ ہیں۔ آپ کی تحریریں خود بولیں گی، مگر آپ کے ساتھ گزارے ہوئے وہ بے شمار لمحے، وہ چھوٹی چھوٹی دل نشیں باتیں حاضرین کو کون بتائے گا۔ ہاں مجھے یہ خوش فہمی ہے کہ آپ بھی اپنے تعزیتی اجلاس میں میری کمی ضرور محسوس کریں گے اور مجھے معاف بھی کر دیں گے۔ میں جب گلف ایئر کی شام پانچ بجے والی فلائٹ سے ہوا میں اڑ رہی ہوں گی اسی لمحے شام پانچ بجے عصر کی نماز کے بعد آپ کی روح بھی دنیا سے مکمل طور پر رشتہ توڑ کر آسمان کی جانب پرواز کر رہی ہوگی۔

O

پان کی لالی کے ساتھ... حسن مثنیٰ ندوی

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم بہت عرصہ کسی بڑے شخص سے مسلسل ملتے رہتے ہیں، لیکن اسے مکمل طور پر نہیں جان پاتے۔ شاید اس لیے کہ وہ ہماری نو عمری اور کم علمی کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب ہمیں ان کی علمیت کا پتا چلتا ہے تب یا تو وہ ہستی دنیا سے رخصت ہو چکی ہوتی ہے یا ہماری پہنچ سے دور ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی دو شخصیات میری زندگی میں بھی آئیں۔ دونوں ادبی، علمی اور شخصی اعتبار سے بڑی حیثیت والی تھیں اور تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا، اور ان کے دائرۂ کار میں ان کا جو مقام متعین ہو چکا ہے وہ کبھی کم نہیں ہو پائے گا۔

یہ دو شخصیات پروفیسر احمد علی اور حسن مثنیٰ ندوی ہیں۔ یہ دونوں حضرات میرے استاد تھے اور استاد بھی کب جب، میں میٹرک پاس کر کے نئی نئی کالج میں داخل ہوئی تھی۔

میری خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ زمانہ نہ ٹی وی کا تھا نہ ہاتھ میں موبائل لے کر پھرنے کا، نہ آنکھوں کے سامنے اور گود میں لیپ ٹاپ یا آئی پیڈ لے کر بیٹھنے کا۔ ہمارے پاس کتابیں ہوتی تھیں۔ ایک ختم نہیں ہو پاتی تھی کہ دوسری کتاب کے حصول میں لگ جاتے۔ یوں ہم اپنا تمام تر وقت کتابوں کو دیا کرتے اور درس گاہوں میں استاد کو اپنا آئیڈیل چن کر ان کی ہدایت پر زندگی گزارنے کی کوشش کرتے۔ آج کے بچے یقیناً ہم سب سے زیادہ ذہین ہیں اور دنیا بھر کی معلومات کو اپنی مٹھی میں بند کیے ہوئے ہیں، لیکن کتاب اور استاد جو سبق کے دو

اہم ذرائع ہیں، ان سے محروم ہیں۔

ہمیں بہت عظیم استاد اور علم بانٹنے والی درس گاہیں میسر تھیں جہاں سے ہم اپنے اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق تہذیب اور ادب حاصل کر لیتے تھے۔

ہمیں اپنی درس گاہوں میں اسٹیج حاصل تھے جہاں ہماری صلاحیتیں جِلا پاتی تھیں۔ ہم جب اپنی درس گاہ سے نکلتے تھے تب ایک ہاتھ میں سند ہوتی تو دوسرے ہاتھ میں تربیت، اور صلاحیت کا بے پناہ خزانہ ہوتا جو زندگی گزارنے کے عمل میں ہماری رہنمائی کرتا۔ ہم وہاں ہی مقرر بن چکے ہوتے تھے۔ لکھنا آچکا ہوتا تھا۔ دیگر فنون جو بھی ہم نے اپنے اپنے شوق کے مطابق چنے ہوتے، اس کی ابجد سے واقف ہو چکے ہوتے تھے۔ پھر زندگی کے تجربات ہماری محنت کے مطابق ہمیں مالا مال کرتے رہتے۔ شاید آج کے طالب علموں کو اب یہ کچھ حاصل نہیں اور نہ ہی وہ اس کی طلب رکھتے ہیں۔

حسن مثنیٰ ندوی بحیثیت استاد ہمیں اس وقت ملے جب ہم میں سب کچھ حاصل کرنے کی لگن شروع ہوئی تھی اور شدید بھی تھی۔ سب کچھ میں ادب، مباحثہ، تحریر اور کتب بینی کا نشہ ہم پر چڑھ چکا تھا۔

لمبا قد، دبلا بدن، جسم پر قاعدے سے سلی شیروانی، سیدھا پائجامہ، سر پر جناح کیپ، منہ میں پان اور ہونٹوں پر باریک سی لال لکیر۔ چہرے پر نہ ہنسنے کے باوجود ہنستے رہنے جیسا نقشہ، یہ تھے حسن مثنیٰ ندوی۔

دینیات پڑھانے آتے تو جیسے کلاس میں خوش گوار ماحول کی آندھی سی چل جاتی۔ ان کے آتے ہی طالب علم یوں اطمینان کا سانس لیتے جیسے کوئی استاد نہیں بس اپنا کوئی ساتھی ہی روسٹرم سنبھالے کھڑا ہے۔ اس سے پہلے کے سیاسیات، معاشیات، نفسیات وغیرہ جیسے مضامین کے لیکچر جو ہمیں مردہ بنا چکے ہوتے تھے، مثنیٰ صاحب کی قدرتی مسکراتے چہرے کے ساتھ اختیاری مسکراہٹ میں دب جاتے۔ کلاس میں جب لڑکے بھی ہوں تو شور شرابا لازمی مضمون کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

مثنیٰ صاحب کی عادت تھی کلاس میں آتے ہی ہماری خیریت پوچھتے، اب بھلا ہم

خیریت سے کیا ہوتے ہوں گے مندرجہ بالا مضامین کی خشکی اور سنگینی ہمیں شہید کر چکی ہوتی تھی۔ ان مشکل مضامین کے الجھے الجھے اساتذہ سے ہم نبرد آزما ہوتے ہوئے نحیف اور ضعیف کے درجے پر فائز ہو کر نیند کی آغوش میں جانے کی تیاری کر رہے ہوتے کہ مثنیٰ صاحب کی آمد ان کی مزاج پُرسی اور جان لیوا مسکراہٹ ہمارے لیے دوبارہ زندہ ہوجانے کی نوید لے آتی۔

مثنیٰ صاحب کی آمد پر ہم زندگی سے بھرپور سانس لیتے، لیکن چوں کہ ناشتا ہضم ہو چکا ہوتا اور اب بھوک کی شدت ہمیں وہ حدیث یاددلا رہی ہوتی کہ نماز کا وقت ہو اور بھوک کی شدت بھی تو پہلے کھانا کھالینا چاہیے۔ سو، ہم ایک زبان ہو کر حدیث پر عمل پیرا ہونے کی ضد کرتے۔ یعنی کینٹین کے اُن سموسوں کی فرمائش کر دیتے جس میں آلو بھرے ہوتے اور ان کی شکل تکون ہوتی، اور آج تک وہ تکون ہی ہیں، اور آلو سے بھرے ہوئے بھی۔ زمانہ قیامت کی چال چل گیا، مگر سموسہ آج تک اپنے آباواجداد کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔

مثنیٰ صاحب ہماری فرمائش کے عادی ہو چکے تھے۔ لہٰذا ایک لڑکا مقرر تھا جو بغیر آرڈر دیے چھلانگیں مارتا کینٹین کی جانب دوڑ لگا دیتا اور چشمِ زدن میں ٹین کی مخصوص ٹرے پر سجے سجائے سموسے میز پر رکھ دیتا۔ شاید کینٹین والے کے پاس بھی ہماری کلاس کا ٹائم ٹیبل موجود تھا اور شاید وہ پہلے ہی سے گن، گن، کر سموسے ٹرے میں سجا کر بیٹھا ہوتا۔ بس انتظار رہتا تو کسی ایک لڑکے کا جو آرڈر کے نام پر ٹرے اٹھائے گا۔ ویسے ہمیں بارہا یہ شک بھی گزرا تھا کہ وہ لڑکا جو روز اپنی خدمات مفت پیش کرتا ہے، معاوضہ کینٹین سے وصول کرتا ہوگا۔ وہ یوں کہ کئی عدد سموسوں کو پیٹ میں رازداری کے ساتھ وہیں ڈپازٹ کر کے کلاس میں آتا ہے۔ ہم فراخ دلی سے اس ''ڈپازٹ'' کو اس کی ٹپ قرار دے کر اپنے دل کو سمجھا لیتے۔

جب ہم سیر ہو چکے ہوتے تب باری باری پیاس لگتی اور جب کھانے پینے سے فارغ ہو چکتے تب مثنیٰ صاحب کو اجازت دے دیتے کہ وہ چاہیں تو ہمیں پڑھالیں۔ یہ اور بات کہ زیادہ تر لڑکوں کی آنکھیں بند ہوتیں اور ڈیسک کے نیچے ٹانگیں پھیلا چکتے۔ یہ ان کا قیلولہ تھا۔

مثنیٰ صاحب ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ گھڑی دیکھتے اور لیکچر شروع کرتے۔ ان کی آواز میں استاد کی جھلک کم اور کسی ماں کی لوری کی مٹھاس زیادہ ہوتی۔ ان کے الفاظ کا

چناؤ اتنا خوب صورت ہوتا کہ ہم مسئلے سے زیادہ جملوں پر زیادہ توجہ دے رہے ہوتے۔

ہم آج بھی آنکھیں بند کر کے ذہن کے دریچے کھولتے ہیں تب سب سے پہلے ہمیں منشیٰ صاحب کی کلاس اور ان کی میٹھی آواز کانوں میں رس گھولنے لگ جاتی ہے۔ ہم اتنے عرصے استاد رہے، یہی گتھی سلجھاتے گزر گئی کہ منشیٰ صاحب کیسے استاد تھے کہ انھیں کبھی غصہ ہی نہیں آتا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ ہم بڑے باادب طالب علم تھے۔ ہماری کلاس میں تو سدا سے رانا اظہر علی خاں پڑھتے نہیں تو بیٹھتے ضرور چلے آرہے تھے جنھوں نے اپنے ہی نہیں پورے شہر کے کالجوں کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ ہر سال امتحان میں ضرور شرکت کرتے، پہلے چاقو ڈیسک پر مار کر کھڑا کرتے، پھر کتاب کھول کر حرف بہ حرف نقل کر کے کاپی پکڑاتے اور خراماں خراماں کمرے سے نکل جاتے، مگر کالج کی تاریخ بتاتی تھی کہ نجانے کتنے سالوں سے وہ مستقل مزاجی دکھاتے چلے آرہے تھے۔ ہر سال طالبِ علم بدل جاتے سوائے ان کے۔ رانا اظہر علی اپنی جگہ ''گل محمد'' کے خطاب کا تاج سجائے بیٹھے رہ جاتے۔ غصے کے بھی تیز تھے اور چاقو بھی ہمراہ ہوتا۔ بعض کم زور دل طالبات ان کو دیکھتے ہی بے ہوش ہونے کی تیاری مکمل کر لیتیں اور لڑکے ان کی جی حضوری میں عافیت محسوس کرتے۔ اساتذہ اپنی نصیحتوں کو ان پر ضائع کرنے سے اجتناب برتتے، ہاں بس ایک حسن منشیٰ صاحب تھے کہ ان سے براہِ راست مخاطب ہوتے، ''خان صاحب اجازت ہو تو اب کچھ پڑھا لوں؟''

خان صاحب فراخ دلی سے نہ صرف اجازت دیتے، بلکہ سروقد کھڑے ہو کر تعظیم بجالاتے۔ ہم حیران پریشان ان دونوں کو دیکھتے رہ جاتے اور سمجھ جاتے سموسہ اور مسکراہٹ خان صاحب پر جادو کی طرح اثر کر جاتا ہے۔

اکثر ہم نے رانا اظہر علی کو ان سے بھڑتے بھی دیکھا تھا، مگر واہ رے منشیٰ صاحب، ان کے پاس پان کی لالی والی مسکراہٹ بڑا اوزار اور ہتھیار تھی۔ نہ خان صاحب کا برتاؤ بدلتا نہ منشیٰ صاحب کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں مجال ہے کہ بال برابر فرق آئے۔

ہمارا نصاب زندگی کے بنیادی مسائل پر دینی نکتہ نظر تھا۔ جیسے وراثت، طلاق، نکاح، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد وغیرہ۔ ان کی عادت تھی لیکچر شروع کرنے سے پہلے ہم سے پوچھتے،

''آج کیا پڑھنا ہے؟'' ہمیں نصاب کی فہرست از بر تھی۔

لڑکے کہتے، ''سر نکاح۔''

''بڑے شوقین معلوم ہوتے ہو۔'' وہ اپنی مسکراہٹ کی لکیر کو پھیلا دیتے۔ دوسرے دن سوال پھر وہی ہوتا، ''ہاں بھئی بچو! آج کیا پڑھنا ہے؟''

لڑکے جھٹ بولے، ''سر طلاق۔''

اب مثنیٰ صاحب کی مسکراہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی۔

''بھئی واہ، کل نکاح اور آج طلاق۔''

پوری کلاس قہقہے میں ڈوب جاتی۔

''اس قدر جلد فیصلہ کرو گے تو کام کیسے چلے گا؟'' وہ جانے یوں ہی کہہ رہے تھے یا اس جملے میں کوئی نصیحت پوشیدہ تھی۔ ہم ان دنوں نہیں جان پائے تھے۔

ایک دن لڑکوں نے پوچھا، ''سر آپ کا دل شیروانی سے نہیں بھرا۔ روز روز شیروانی ہی پہنتے ہیں۔'' دوسرے لڑکے نے کہا، ''سر کیا کسی نے آپ کی تعریف کر دی تھی؟''

''جی ہاں۔'' وہ پھر مسکرائے۔ کچھ بولنے سے پہلے مسکراتے ضرور تھے۔

''انھوں نے کچھ ایسا ہی کہا تھا۔''

'سر 'انھوں' کون ہیں؟'' ہم سب پوچھتے رہ گئے گھنٹا بج گیا اور وہ کلاس روم سے نکل گئے۔

''سر جناح کیپ کیا جناح صاحب کی وصیت میں شامل تھی؟''

''وصیت نہیں تقلید کہو۔''

پھر ہم غور کرتے اگر قائد اعظم اور مثنیٰ صاحب کو برابر کھڑا کر دیا جائے تو دونوں کی جسامت میں کوئی فرق نہیں ملتا۔ ایک سا قد، ایک سی شیروانی، ایک سا پائجامہ، سر پر ٹوپی اور کالا پمپ والا جوتا۔ بس قائد اعظم پان نہیں کھاتے تھے۔ قائد اعظم جناح پونجا کے بیٹے تھے اور مثنیٰ صاحب محمد حسن کے۔

ایک دن تو لڑکوں نے حد ہی کر دی۔

''سر آپ نے آج تک شادی کیوں نہیں کی؟'' بھلا یہ سوال طالب علموں کا اپنے استاد سے ہونا چاہیے تھا؟

اب طالب علموں کا جواب ایک استاد کیسے دے؟ مگر انھوں نے بڑی ملائمت سے کہا، ''بس وہ راضی ہی نہیں ہوئیں، پھر ہم دونوں ایسے ہی رہ گئے۔''

''سر وہ کون تھیں؟'' یہ سوال آج تک کے سوالوں میں سب سے مشکل سوال تھا اور ہمیں پکا یقین تھا کہ نہ صرف یہ کہ ثنیٰ صاحب جواب نہیں دیں گے، بلکہ ڈانٹیں گے بھی۔

اگر چہ جواب سچا نہیں، مگر بڑا ذو معنی تھا۔ انھوں نے ڈانٹ کر لڑکوں کو چپ نہیں کرایا۔ اور نام بھی بتادیا، مگر یہاں اتنے برس بعد میں یہ جرأت ہرگز نہیں کر پاؤں گی کہ وہ نام کسی کو بتاپاؤں، لیکن جب بھی اُن دنوں کا خیال آتا ہے انتہائی سنجیدہ لمحات میں بھی میرے دل میں ہنسی کے بہت سارے پھول کھل جاتے ہیں۔

درس گاہوں کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے۔ ہنستے کھیلتے بس جلدی سے گزر جاتی ہے اور کام زندگی بھر آتی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے ریل کا سفر ہوتی ہے۔ تمام ساتھی ایک ایک کر کے مختلف اسٹیشن پر اترتے جاتے ہیں اور پھر ماضی کے دھندلکوں میں گم ہوجاتے ہیں۔ بس اپنی یادیں دے جاتے ہیں۔

ایک شہر ایک اسٹیشن پر رہتے ہوئے میں ثنیٰ صاحب سے بعد کی زندگی میں بھی قریب رہی۔ ان سے فیض حاصل کرتی رہی۔ انھیں ان کی بڑائی ان کی عظمت، ان کی شخصیت کو بعد میں سمجھ پائی۔ وہ کس قدر خوب صورت، خوب سیرت انسان تھے۔ ہمیشہ ہر حالت میں خوش رہے۔ دوسروں کو بھی خوشی بانٹتے رہے۔ علم وحکمت کے خزانے لٹاتے رہے۔ اپنی تحریر کے جوہر دکھاتے رہے۔ ایک اچھے استاد، اچھے صحافی اور اچھے دوست کی حیثیت سے زندگی گزاری۔

ان کا وہ سارا ادبی، علمی اور صحافتی سفر اپنی اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور بامعنی بھی ہے۔ اگر انھوں نے بہادر آباد کے اس مکان میں زندگی کے آخری دن گزارتے ہوئے ماضی کو کبھی

کبھی دہرایا ہوگا تو اپنے کیے پر اپنے آپ کو مطمئن پایا ہوگا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی کہ زندگی کی شام میں انسان کے پاس چمکتی دمکتی صبح کا نظارہ موجود ہو، یاس اور حسرت یا کسی بھی قسم کا پچھتاوا نہ ہو۔ وہ ایسے ہی خوش قسمت انسان تھے۔

میری آخری ملاقات ان سے اسی گھر میں ہوئی تھی۔ کہنے لگے، ''گنج تمھیں یاد ہے جب کالج میں اوّل آنے پر تمھیں گولڈ میڈل ملا تھا اور میرے دوست علی اکبر جو تقریب کی صدارت بھی کر رہے تھے، تمھیں میڈل دیتے ہوئے انھوں نے کیا کہا تھا؟''

''جی سر مجھے یاد ہے، انھوں نے کہا تھا، اگر تم سے یہ میڈل گم ہوگیا تب نیا میڈل لینے کے لیے پرنسپل حسن عادل کے پاس اس کی رقم جمع کرانی پڑے گی۔''

''اور پھر تم نے جھٹ سے کیا جواب دیا تھا؟''

''سر مجھے افسوس ہے کہ میں نے اچھا جواب نہیں دیا تھا۔''

''نہیں گنج، وہ تو تمھارے جواب سے بہت خوش ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا لڑکی نے کیا خوب کہا 'جو جیتنا جانتا ہے وہ حفاظت سے رکھنا بھی جانتا ہے۔' جانتی ہو انھوں نے میڈل دیتے ہوئے تمھاری اور اپنی وہ تصویر فریم کرا کے ڈرائنگ روم میں لگائی ہوئی ہے۔''

پھر وہ اداسی سے بولے، ''علی اکبر میرا بڑا عزیز دوست تھا۔ اس نے بہت کم عمر پائی، جس کی جدائی کا غم میں آج بھی لیے جی رہا ہوں۔''

اپنی اس آخری ملاقات میں انھوں نے مجھے دو کتابیں بھی پڑھنے کے لیے دیں اس تاکید کے ساتھ کہ چاہو تو لوٹا دینا ورنہ اسے میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لینا۔ میں ابھی لوٹا بھی نہیں پائی تھی کہ وہ بھی اپنے دوست علی اکبر کے پاس چلے گئے۔ اب وہ کتابیں ان کا تحفہ ہیں جو میرے پاس موجود ہیں۔

اس دن مثنیٰ صاحب نے زیادہ سے زیادہ باتیں کی تھیں۔ کالج کی بہت ساری باتیں پوچھیں۔ پڑھاتی ہو، اچھا لگتا ہے، استاد بننا کیسا لگا؟ پھر خود ہی کہا، مجھے یقین ہے تم اچھی

استاد ثابت ہوگی۔

وہ مجھے گنج کہتے تھے۔ اس دن بھی گنج ہی کہہ کر مخاطب کرتے رہے۔ وہ میرے ابا کو جانتے تھے اور گنج ہائے گراں مایہ میں ابا پر لکھا رشید احمد صدیقی کا خاکہ انھوں نے پڑھ رکھا تھا۔ اسی حوالے سے وہ مجھے گنج کہتے تھے۔

میں کبھی کبھی ان کی دی ہوئی کتاب کو شیلف سے نکال کر پھر پڑھنے لگتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ کتاب اپنے مالک تک دوبارہ نہیں گئی، ہاں اس کا مالک اپنے مالک کے پاس جا پہنچا۔

جب وہ آیا تھا خالی ہاتھ آیا تھا، جب گیا ہے تو اپنے کردار کا، اپنی گزاری ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ کتابِ زندگی میں تحریر کر کے ساتھ لے گیا ہے جہاں اس کی کتاب کی ایک دن رونمائی ہوگی اور مقررین میں انصاف پسند شریک ہوں گے جو دنیاوی مقررین کی طرح تقریب میں جھوٹ نہیں بولیں گے۔ وہاں تو میزان پر کتابیں تولی جاتی ہیں۔ اور صاحبِ کتاب کی نظریں اس جانب لگی ہوتی ہیں کہ کون سا پلڑا جھک رہا ہے، مگر اس وقت دعا اور عمل دونوں کا وقت گزر چکا ہوتا ہے بالکل اس طرح جیسے امتحان ہال میں اپنی جوابی کاپی پکڑا کر ہم باہر آجاتے ہیں۔ وقت تو انمول ہے پھر ہاتھ نہیں آتا۔ یہ بات مُثنیٰ صاحب نے دینیات پڑھاتے ہوئے ہمیں بارہا سمجھائی بھی تھی۔

مُثنیٰ صاحب کی کتابِ زندگی ہم سب نے دنیا ہی میں پڑھ لی تھی اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کون سا پلڑا جھک رہا ہے اور کون سا ہوا میں جھول رہا ہے۔ کہتے ہیں کتاب میں اتنا نہیں لکھا ہوتا جتنا صاحبِ کردار کے چہرے پر تحریر ہوتا ہے۔ مُثنیٰ صاحب کے چہرے پر بھی کتاب سے زیادہ تحریر موجود تھی۔ مخلص، محبت کرنے والے، زندگی گزارنے کے تمام طور طریقوں میں میانہ روی، اللہ سے ڈرنا، ہر روز بار بار سجدہ کرنا۔ اس کی اتاری ہوئی سچی کتاب کی تلاوت کرنا۔ اپنے پر عائد روزے رکھنا، غصہ قابو میں رکھنا، عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا، کسی کا حق غصب نہ کرنا، فقیر کو حقیر نہ جاننا، مانگنے والے ہاتھ کو دینے والے ہاتھ سے اوپر رکھنا۔ ایک بندہ اپنی مختصر سی

زندگی میں اگر پورے طور پر ان اصولوں کو اپنائے رکھتا ہے تب فرشتہ اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے خواہ وہ دائیں شانے پر بیٹھا ہو یا بائیں شانے پر۔ اس کا رجسٹر سنہرے حروف سے بھرا ہوتا ہے۔

مجھے ہی کیا حسن مثنیٰ کے ہر جاننے والے اور ہر طالب علم کا یہی کہنا تھا کہ وہ ایک اچھے انسان اور اللہ کے فرماں بردار بندے تھے۔ انھوں نے اپنی کتابِ ہستی میں ہر اس سوال کا جواب تحریر کردیا تھا جس کا جواب ان کے رب نے ان سے مانگا تھا۔ وہ زندگی بھر مسکراتے رہے اور مسکراتے ہوئے ہی دنیا سے گئے، کیوں کہ اپنے جواب پر پورے نمبر حاصل کرنے کا انھیں کامل یقین تھا۔

○

ہم سب کے دوست... نصیر صاحب

ہم نے کب چاہا تھا کہ نصیر صاحب ہمارے کالج کے پرنسپل بن کر آجائیں۔ یہ پہلے پرنسپل تھے جو باہر سے آئے تھے اور ہم جنھیں جانتے ہی نہیں تھے۔ سرکاری اداروں میں ٹرانسفر اور پوسٹنگ تو معمول کی بات ہوتی ہے، لیکن اب تک ایسا ہوتا آیا تھا کہ یکے بعد دیگرے تمام پرنسپل ہمارے اپنے ہی کالج کے کوئی سینئر استاد مقرر ہوتے تھے۔ ہم ان سے واقف ہوتے، وہ ہمارے ساتھ اسٹاف روم میں بیٹھ چکے ہوتے۔ ان کی عادات و اطوار، صلاحیت و قابلیت سے ہم سب واقف ہوتے۔ وہ بھی تمام اساتذہ کو اچھی طرح جانتے۔ یوں کالج میں ہمیشہ سے ایک اپنائیت کی فضا قائم تھی۔ ہم سب مل جل کر کوئی فیصلہ کرتے۔ کسی کو کسی بات پر اختلاف بھی ہوتا تو آسانی سے مسئلہ حل ہو جاتا۔ ایسی فضا بہت کم کالجوں میں تھی، ہمارے یہاں اساتذہ کئی گروہ میں بٹے ہوئے نہیں تھے۔ چھوٹا سا اسٹاف روم تھا۔ سب کے دل میں بڑی گنجائش تھی۔ اساتذہ میں مرد اور خواتین دونوں تھے۔ یوں گھر کا سا ماحول تھا۔

اب یہ جو اچانک تبدیلی ہوئی، ہم سب کا اس موقعے پر پریشان ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

نصیر صاحب ایک دن آگئے۔ ان کے لہجے میں بھی پریشانی اور بیزاری تھی، ہم نے اطلاع دینے والے نذیر چپراسی سے پوچھا بھی کہ تم کیوں پریشان ہو؟ اس نے فوری جواب

دیا، میڈم کیا آپ لوگ پریشان نہیں ہیں؟

ایک دن ہمیں ایک سایہ سا آفس میں جاتا ہوا نظر آیا۔ وہ آفس میں کیا کرتے رہے ہمیں نہیں معلوم، لیکن اسٹاف روم میں ہم سب افسردہ اور بے چین سے بیٹھے تھے اور یہ پہلا موقع تھا کہ ہم سب خاموش بھی تھے۔

گھنٹے بھر کے اندر ایک نوٹس آیا۔ اسٹاف میٹنگ گیارہ بجے اسٹاف روم میں طلب کی گئی تھی۔

ہم سب اپنی اپنی کرسیوں پر ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ گھڑی نے گیارہ مرتبہ گھنٹا بجا کر اس مقررہ گھڑی سے آگاہ کیا کہ جس لمحے ہمیں ایک اجنبی پرنسپل کو اپنے اسٹاف روم میں خوش آمدید کہنا تھا۔

اس لمحے ہمیں اپنی سرکاری ملازمت بہت بری لگی کہ اب ہمارا پرنسپل خود ہم نہیں سرکار منتخب کیا کرے گی۔

ٹھیک گیارہ بجے ہی ایک صاحب ہاتھ میں رجسٹر اور قلم سنبھالے نذیر کی ہم راہی میں تشریف لے آئے۔ ہم سب نے آداب کے مطابق کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ انھوں نے مسکراہٹ سے ہمارے خیر مقدمی انداز کا شکریہ ادا کیا اور نرمی سے بیٹھ جانے کا کہا۔

تقریباً دو گھنٹے کی میٹنگ کے اختتام پر وہ ہم سب کا دل موہ چکے تھے، اور جب گھڑی نے ایک بجنے کا گھنٹا بجایا تب ہم سب نے ایک ساتھ سوچا، سرکار کا انتخاب برا تو نہیں ہے۔

جب وہ دو گھنٹے کی آخری مسکراہٹ لیے آفس کی طرف روانہ ہوئے تب ہم نے محسوس کیا کہ دراز قد، خوب صورت چہرہ، قدرے گھنگھریالے بال، چمکتی ہوئی آنکھیں، صاف رنگت والے سیّد محمد نصیر کی مسکراہٹ میں حسن، تاب ناکی سچائی، اپنائیت اور ایک کشش موجود ہے۔ ان کی باتوں میں عزم اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ اور ساتھ لے کر چلنے کا وعدہ موجود تھا۔ وہ نظم و ضبط میں سخت اور تعلقات میں نرم گوشہ رکھنے والے انسان محسوس ہوئے۔ نظم و ضبط کی سختی ہم میں سے بیشتر اساتذہ کو یقیناً فکر مند کر گئی تھی۔ ہم اپنے ان ساتھیوں کے نام اچھی طرح جانتے تھے جو وقت پر نہ آنے کو گناہ تصور نہیں کرتے تھے۔ کلاس چھوڑ دینے کو غلطی ماننے پر آمادہ نہیں تھے۔ جلدی کالج سے چلے جانے پر اعتراض کو گردن جھٹک کر جھٹلا

دیتے۔ ہفتے میں ایک دو چھٹیاں کرنا اپنا حق جانتے۔ نصیر صاحب نے اپنی پہلی ہی ملاقات میں ایسی تمام کوتاہیوں کو قابلِ گرفت قرار دے دیا تھا، مگر مجموعی طور پر زیادہ تر اساتذہ خوش تھے۔

نظم و ضبط کی طرف سے لاپروائی برتنے سے کالج مسلسل افراتفری کا شکار ہو رہا تھا، اور ایسے موقعے پر کسی بھی ایسے پرنسپل کا یہاں آنا اب ضروری بھی خیال کیا جا رہا تھا۔

کلاس پابندی سے لینے والے اساتذہ پر اب بھی کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ پرنسپلوں کی نرمی کے باوجود اپنی ذمے داری پوری طرح نبھا رہے تھے۔ وقت پر آنے اور وقت پر جانے والے اساتذہ کو بھی نصیر صاحب کی ہدایت اور گرفت سے کیا تکلیف ہو سکتی تھی، اور وہ اساتذہ جو غیر ضروری چھٹیاں کرنے کے عادی نہیں تھے وہ بھی اس دو گھنٹے کی گفتگو سے مطمئن تھے۔ یوں نصیر صاحب ہمیں قابلِ قبول ٹھہرے۔

چند دنوں ہی کے اندر کالج میں خوش گوار تبدیلی محسوس ہوئی۔ وہ کالج کے ماضی سے پوری طرح آگاہ تھے۔ مختلف اساتذہ کے نام اور کام جانتے تھے وہ سارا ہوم ورک پہلے ہی کر کے آئے تھے۔ جب ہی تو انھوں نے میٹنگ کے دوران مجھے اپنے آپ پہچان لیا۔

''آپ کالج کی ابتدا سے ہی یونین انچارج ہیں۔ میرے دور میں بھی آپ کو اسی عہدے پر برقرار رہنا ہے۔ بالکل اسی طرح کام کریں جیسا اب تک کرتی رہی ہیں۔''

میں نے حیرانی سے ان کی جانب دیکھا بھی کہ انھیں میری کارکردگی کب دیکھنے کو ملی، اور پہچانے بغیر ہی میرا نام کام سب کیسے جانتے ہیں؟ یوں ہی انھوں نے دیگر اساتذہ سے بھی گفتگو کی اور سب کو حیران کرتے رہے، اسی باعث ہم سب زیادہ ہی مستعد ہو گئے۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ چند دنوں میں اب تک کے کالج سے مختلف پہلی بار ایک بے رحم سا نظم و ضبط دیکھنے میں آیا جو کالج کی مجموعی صورتِ حال کے لیے بے حد ضروری بھی تھا۔

میں نے بے رحم نظم و ضبط اس لیے کہا کہ وہ کالج کا راؤنڈ لینے میں بڑے مستعد تھے۔ پیریڈ شروع ہوتے ہی کاریڈور کا چکر لگاتے۔ کان لگا کر لیکچر بھی سننے کی کوشش کرتے۔ کلاس نہ لینے والے یا دیر سے پہنچنے والے اور جلد کلاس چھوڑ دینے والے اساتذہ ان کی گرفت میں آ گئے اور ان کی اصلاح شروع ہو گئی۔ پہلی بار سرکاری ملازمت کے اس آداب سے ہم آگاہ

ہوئے کہ خلاف ورزی پر ''میمو'' نام کی کوئی چیز ملا کرتی ہے جو پرنسپل فائل کو خراب اور خفیہ رپورٹ کو مزید خراب کر دیتی ہے۔ ہم نے ایک استاد کو ملنے والے اس ''میمو'' کی نقاب کشائی کا بھی اہتمام کیا۔ ان استاد نے فراخ دلی اور سچائی سے بتادیا کہ ان کی دو دہائیوں پر مشتمل ملازمت میں پہلی بار انھیں اس ''تحفے'' سے نوازا گیا ہے، جب کہ ان کے اطوار تو آغازِ ملازمت سے ہی ایسے تھے۔

ہمارے ان ہر دل عزیز پروفیسر کے پاس اسکوٹر تھی جو دیگر کسی بھی استاد کے پاس نہیں تھی اور باری باری سب ہی اس سواری سے مستفید ہوتے تھے۔ انھیں اکثر میمو ملتا اور میمو والے دن بھی نصیر صاحب ان کی اسکوٹر استعمال کرتے اور کہتے ملازمت کے آداب اور ہوتے ہیں تعلقات اپنی جگہ پر۔ یوں اسکوٹر سے اترنے کے بعد اور بیٹھنے سے پہلے وہ مکمل طور پر پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوتے اور ان اوقات کے علاوہ وہ گلے میں بانہیں ڈالے مسکرا کر باتیں کرتے اور اپنے بلند و بانگ قہقہوں سے محفل گرماتے اور سب کے دل میں جگہ بنائے رکھتے۔

ایک دن میں کلاس میں تھی، بورڈ پر فیگر بنا کر جب طالبات کی جانب پلٹی تب میری نظر آخری بینچ پر بیٹھے نصیر صاحب پر پڑی، ایک لمحے کو میں حیرت اور سچ پوچھیے تو بے اطمینانی کا شکار ہوگئی، مگر دوسرے ہی لمحے اپنے مضمون کی طرف آ گئی۔ پیریڈ ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے وہ کلاس سے چلے گئے، گویا وہ میری کارکردگی جانچ رہے تھے، جب کہ میں جانتی تھی کارکردگی جانچنے کا یہ انداز ہرگز بہتر اور قابلِ قبول نہیں تھا۔ میں ان دنوں باوجود اپنی نوجوانی کے احتجاج پر آمادہ نہیں ہوئی اس واقعے کو برداشت کر گئی۔ کچھ عرصے بعد جب ٹائم ٹیبل تبدیل ہوا اور ایک سیکشن جسے میں پڑھا رہی تھی مجھ سے لے لیا گیا اور دوسرا سیکشن مجھے دے دیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایسا قصداً کیا گیا تھا یا یہ کوئی انتظامی عام سا معاملہ تھا۔ تب میرے سیکشن کی طالبات احتجاج کر بیٹھیں۔ مطالبہ زور پکڑ گیا کہ ہمیں ہماری ہی لیکچرر چاہیے۔ میں نے ان طالبات کو سمجھایا بھی کہ ایسا کہنا مناسب نہیں کہ ٹیچر تو بدلتے ہی رہتے ہیں، نیز یہ کہ میری دوسری ساتھی لیکچرار کی بھی سبکی ہو رہی ہے جسے میں گوارا نہیں کر سکتی کہ ہمارے درمیان

خوش گوار تعلقات ہیں، مگر طالبات میری کسی دلیل کو ماننے پر تیار نہیں تھیں، ایسے میں نصیر صاحب ان طالبات کے پاس گئے اور ان سے کہا، اگر تم لوگوں کی جگہ میں بھی ہوتا تو ایسا ہی احتجاج کرتا کہ تمھاری میڈم بہت اچھا پڑھاتی ہیں۔ شاید مجھ سے بھی اچھا، لیکن ابھی تم نے دوسری ٹیچر کو آزمایا نہیں ہے۔ شاید وہ بھی تمھاری میڈم جیسا ہی پڑھائیں۔ لہٰذا تم ان سے پہلے پڑھ کر تو دیکھ لو۔ تجربے کے بغیر احتجاج کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان کے سمجھانے کا انداز اتنا مؤثر تھا کہ طالبات نے احتجاج ختم کردیا۔ ساتھی استاد اور میرے درمیان جو پیشہ ورانہ غلط فہمی پیدا ہونے جارہی تھی وہ ٹل گئی، اور میں ان کا شکریہ ادا کرنے آفس گئی۔ تب انھوں نے جو بات کی وہ میرے لیے بہت حوصلہ افزا تھی۔

''ایک موضوع تو میں نے بھی تمھاری کلاس میں بیٹھ کر تم سے پڑھا ہے۔ طالبات جو کہہ رہی ہیں اس میں وزن ہے۔ دیکھو اپنی کارکردگی کم نہ ہونے دینا۔''

ایسے ایسے واقعات دیگر اساتذہ کے ساتھ بھی ہوئے۔ کچھ کے حق میں کچھ کے خلاف، لیکن دونوں نے اسے مثبت انداز میں ہی لیا، یہ یقیناً نصیر صاحب کی کامیابی تھی۔

ہماری ایک ساتھی استاد سے ان کا اختلاف خاصا بڑھا۔ اتنا کہ بول چال تک بند ہوگئی۔ کالج کے خوش گوار ماحول کے لیے یہ بڑا مہلک دور تھا۔ ہم سب پر اس کے اثرات پڑ رہے تھے۔ دونوں طرف اپنی اپنی ضد تھی اور دونوں ہی اپنے آپ کو صحیح سمجھ رہے تھے، لیکن ایک دن ہم نے محسوس کیا کہ کھنچاؤ کم ہے۔ ہم نے اپنی ساتھی استاد سے پوچھا، انھوں نے فراخ دلی سے بتایا کہ نصیر صاحب کا فون آیا تھا۔ کہنے لگے، ''چلو دوستی کرلیتے ہیں، شکر ہے شیشے میں بال آیا ہے ابھی شیشہ ٹوٹا نہیں ہے۔'' یہ ظرف نصیر صاحب کا تھا جو ہم سب کے نزدیک ان کا قد اونچا اور اونچا کرگیا۔

تقاریب کے دنوں میں نصیر صاحب کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ مجھ سے کہتے درس گاہ میں کلاس روم تو اہم ہوتے ہی ہیں، لیکن اسٹیج بھی کم اہم نہیں ہوتا کہ یہی آئندہ زندگی گزارنے کی تربیت فراہم کرتا ہے۔ بحیثیت یونین انچارج مجھے وہ یوں آزادی دیتے تھے جیسا کہ پچھلے تمام پرنسپل صاحبان، میں اپنے مزاج کے تحت کام کرنے میں آزاد ہوتی تھی۔

اس طرح مجھ پر دباؤ نہ ہونے کے سبب کام بہت بہتر ہوتا، لیکن مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ چند ایک معاملات ایسے ہوتے کہ مجھے پرنسپل سے مشورہ کرنا چاہیے تھا اور ان کی رائے پر عمل کرنا بھی ضروری خیال کرتی، لیکن میں ایسا نہیں کرتی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ پرنسپل کا اعتماد مجھ پر حد درجہ ہوتا اور اس اعتماد کے باعث میں کام میں محتاط بھی رہتی تھی کہ ایسا کچھ نہ سرزد ہو جو کالج کے وقار کے خلاف ہو۔

ایک بار کا واقعہ ہے، سالانہ مشاعرہ جو ہمارے کالج کی پہچان بن چکا تھا، میں نے صدارت کے لیے جوش ملیح آبادی کو بلالیا۔ ہوا یوں کہ ان ہی دنوں جوش صاحب اسلام آباد سے کراچی آئے تھے، انھیں کراچی پریس کلب کی تاحیات رکنیت عطا کی گئی تھی۔ ان کے قیام کی جگہ خفیہ تھی کہ ان دنوں کی حکومت میں وہ معتوب تھے اور سرکاری اداروں میں ان کا داخلہ ناپسند کیا جاتا تھا۔ مجھے اس بات کا علم تھا، لیکن میں پھر بھی چاہتی تھی کہ وہ ہمارے کالج آئیں اور مشاعرے کی صدارت کریں۔

عون محمد رضوی ان کے ساتھ اسلام آباد سے آئے تھے اور میں انھیں عرصۂ دراز سے جانتی تھی اور اسی لیے ان کے قیام کی جگہ مجھے بآسانی معلوم ہوگئی اور میں انھیں دعوت دینے ان تک پہنچ گئی۔ ملاقات کا یہ واقعہ بہت دل چسپ ہے، مگر چوں کہ اس واقعے کا تعلق ہے اس لیے میں صرف اسی پہلو پر بات کروں گی، یہاں بس یہ کہنا ہے کہ جوش صاحب نے مجھے سمجھایا کہ اپنے شوق میں اپنی نوکری کے پیچھے نہ پڑو، مگر میں نہیں مانی اور انھوں نے یہ کہہ کر ہامی بھر لی کہ جب تم ہی اپنے نقصان پر آمادہ ہو تو پھر مجھے آنے میں کیا عار ہے۔

مشاعرے والے دن میں حسبِ معمول اسٹیج کی تزئین میں لگی تھی اور تمام دیگر ضروری کام بھی انجام دے رہی تھی، لیکن ایک انجانا سا ڈر بھی ساتھ ساتھ تھا، جب کہ شدید خواہش بھی تھی کہ جوش صاحب وعدے کے مطابق آجائیں۔ جب ان کے آنے کی اطلاع مجھے چپراسی کے ذریعے ملی تب میں انھیں لینے گیٹ پر جانے کے بجائے نصیر صاحب کے آفس پہنچی۔ خوشی اور خوف دونوں کے درمیان میں نے انھیں آگاہ کیا کہ جوش صاحب مشاعرے کی صدارت کررہے ہیں۔

نصیر صاحب نے خفگی سے کہا، تم نے مجھ سے پوچھا؟ انھیں نہیں بلایا جاسکتا۔ پھر وہ خود ہی بولے، مگر وہ کون سا آجائیں گے۔

میں نے گھبرا کر کہا، مگر نصیر صاحب جوش صاحب تو گیٹ پر ہیں۔

نصیر صاحب استقبال کے لیے گیٹ کی طرف بھاگے میں ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ جوش صاحب کو اغل بغل میں چار لوگ پکڑا کر اسٹیج کی طرف لے جارہے تھے۔ اب میں ان سب سے آگے تھی کہ اسٹیج تک پہنچ کر ان کا استقبال کروں۔

مشاعرے میں کیا ہوا، بعد میں کیا ہوا، یہ تفصیل پھر سہی، مگر نصیر صاحب کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے مجھ سے کوئی جواب طلبی نہیں کی، بلکہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے میری گھبراہٹ دور کرنے کی غرض سے کہا، اپنا کام کرو جو ہوگا میں سنبھال لوں گا۔ تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ نصیر صاحب کا قد اس واقعے کے بعد ایسا اونچا ہوا کہ وہ ہم سب کے بے انتہا پسندیدہ ترین پرنسپل بن چکے تھے۔

وہ ہر استاد سے قریب تھے۔ ان کے بچوں تک کی خوشیوں میں شریک ہوتے۔ ان دنوں ہم سب کے بچے چھوٹے تھے، ان کی ہر کامیابی پر تحفہ لے کر وہ سب کے گھر پہنچ جاتے۔ کسی کے ابا کسی کی اماں اور کسی کے عزیز کے انتقال پر ان کا شریک ہونا لازمی ہوتا۔ بچوں کی شادی میں پہنچنے والے وہ پہلے شخص ہوتے۔ میرے تین بچوں کی شادی میں شریک ہوئے۔ میرے بیٹے کی شادی کے موقعے پر وہ بے حد علیل تھے، میں سو فی صد یقین رکھتی تھی کہ وہ نہیں آئیں گے، آنے کے قابل تھے ہی نہیں، مگر وہ اس حالت میں بھی آگئے۔ انھیں دیکھ کر میں نے کہا، ''نصیر صاحب آپ کو کارڈ تو میں نے صرف اطلاع دینے اور دعائیں لینے کے لیے دیا تھا شرکت کے لیے تو نہیں۔''

ہنسے اپنی بے حد خوب صورت ہنسی کے ساتھ۔

''آسکتا تھا، آگیا۔ ہاں اب تمھارے چھوٹے بیٹے کی شادی تک زندہ رہا تو ضرور آؤں گا۔ ورنہ معاف کردینا۔''

چھوٹے بیٹے کی شادی کے موقعے پر میں ان کے آنے کا انتظار کرتی رہ گئی۔ یہ جانتے

ہوئے بھی کہ وہ وہاں جا چکے ہیں جہاں سے کوئی آ ہی نہیں سکتا۔ نصیر صاحب بھی نہیں۔ ان کی کمی میں نے ہی نہیں ہر شریک نے محسوس کی۔

نصیر صاحب میں تعلقات نبھانے کا اس قدر سلیقہ تھا کہ شاید ہی کسی اور میں ہو۔ ہم میں سے کوئی بیمار ہو وہ اسے دیکھنے ضرور پہنچ جاتے۔ مجھے یاد ہے میں سترہ دن اسپتال میں تھی اور وہ ہر روز یا اپنی دعائیں بھیجتے یا خود آ جاتے۔ ان کی بیگم جو ہم سب کی بھابی تھیں وہ بھی تعلقات کے معاملے میں غضب کی تھیں۔ امام ضامن لے کر آ گئیں۔ اور سرھانے بیٹھ کر جانے کتنی ہی دعائیں مانگتی رہیں اور نصیر صاحب میری بیڈ کے ساتھ کھڑے ہو کر کہتے رہے، ''نوشابہ تم لیٹی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔ بھاگتی دوڑتی طالبات کو ڈانٹتی اور زور زور سے لیکچر دیتے اچھی لگتی ہو۔ اٹھ جاؤ شاباش۔''

اور میرے اٹھ جانے پر وہ کس قدر خوش ہوئے تھے جیسے کہ وہ ہمارے ہی گھر کے کوئی بے حد قریبی عزیز ہوں۔

کسی تہوار، عید بقرعید یا جس دن اہم چھٹی ہوتی فون کرنا نہیں بھولتے۔ میرے ان کے درمیان ہمیشہ ایک مقابلہ ہوتا۔ ان کا فون پہلے آ جاتا یا میرا ان کے فون سے پہلے۔ جب بھی وہ پہلے کر لیتے کہتے، دیکھو میں جیت گیا۔ اور میں جب انھیں ہرا دیتی کہتے مجھ سے کوتاہی ہوئی میں ہار گیا۔ اگلی بار تم کو ضرور ہراؤں گا۔ دونوں صورت میں ان کا قہقہہ سننے کو ملتا جو کہیں ان کے دل کو چیرتا ہوا آتا تھا۔ ہار جیت کا یہ کھیل برسوں چلتا رہا اور ایک عید پر میں بار بار فون کے پاس جاتی اور لوٹ آتی، ہار جیت کا یہ کھیل تو ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد کتنی ہی عیدیں آئیں نہ ان کے گھر میرے فون کی پہلی گھنٹی بجی نہ میرے گھر ان کے فون کی، لیکن کیا مجال کہ میں نے انھیں اس دن خصوصیت سے یاد نہ کیا ہو، ان کی مغفرت کی دعا نہ مانگی ہو، ان کی کمی محسوس نہ کی ہو اور میری آنکھوں میں آنسو نہ آئے ہوں۔

ایک بار وہ کسی کورس کے سلسلے میں امریکا گئے۔ وہاں سے تمام اساتذہ کے نام مشترکہ خط لکھتے۔ ہر ایک کے لیے ایک لائن ہوتی بالکل اس کی عادت اطوار یا مزاج کی مناسبت سے جسے ہم سب بہت انجوائے کرتے۔

ہر سرکاری ملازم کی طرح وہ بھی ریٹائر ہو گئے۔ میں نے اس آخری دن اسٹاف روم میں ایک تقریب رکھی جس میں ایک کیک بھی تھا۔ یہ الوداعی تقریب نہیں تھی، اس کا اہتمام ہم نے بعد میں کیا جو ایک ہوٹل میں منعقد ہوئی تھی۔ ہم انھیں آفس سے اسٹاف روم میں لائے کیک پر جلتی موم بتیاں دیکھ کر فوری بولے، یہ سب نوشابہ کی حرکت ہوگی، اس نے آج میری سال گرہ کا اہتمام کیا ہوگا۔ بس یہ کام صرف وہی کر سکتی ہے۔ آگے بڑھ کر انھوں نے شفقت سے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ ان کا خاص انداز تھا۔ ان کا یہ مان مجھے ہمیشہ ان کی یاد کے ساتھ سرشار کر دیتا ہے۔

لاہور کے اسٹاف کالج میں ٹریننگ کے دوران وہاں کے پرنسپل سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ سب تو ٹریننگ کے بعد لوٹ آئے، لیکن وہ بطورِ خاص ان سے ملنے کے لیے ان کے آفس گئے۔

کالج کے پرنسپل طارق صدیقی نے ان سے ان کے کالج کا نام پوچھا، نصیر صاحب نے بتا دیا۔ تب انھوں نے کہا، وہاں میری بہن بھی پڑھاتی ہے، نصیر صاحب نے انھیں نام بتانے سے منع کر دیا۔

''آپ نام نہ بتائیں میں خود بتاؤں گا کہ آپ کی بہن کون ہو سکتی ہیں۔'' اتفاق سے ہمارے کالج میں صدیقی نام کی کئی اساتذہ تھیں، مگر نصیر صاحب نے میرا نام لیا۔ یہ بات جب کالج آ کر انھوں نے مجھے بتائی تب مجھے کتنا اچھا لگا ہوگا، کوئی بھی اس کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

نصیر صاحب صرف ہم لوگوں ہی میں مقبول نہیں تھے اپنی بیوی، بچوں اور بچوں کے بچوں میں بھی وہ حد درجے چاہے جاتے۔ اتنا مکمل اور خوب صورت ان کا گھرانا تھا کہ رشک آتا۔ ان کے بچوں کی شادیوں میں ہمیں اس طرح بلاتے جیسے ہم ان کے قریبی عزیز ہوں۔ میرے ہاتھوں میں تو جیسے سارا انتظام ہی آ جاتا۔ اسٹیج کی ذمے داری مجھے سونپ کر مطمئن ہو جاتے۔ اکثر کہتے ''ہماری نوشابہ اسٹیج کی ماہر ہے۔'' اور پھر دیر تک وہ اس کی تمام باریکیوں پر گفتگو کرتے۔ میرے شوہر کو بے حد سراہتے اور اکثر کہتے، جو شوہر بیوی کے کاموں میں دل چسپی رکھتا ہے اور مددگار بنا رہتا ہے، مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ یہی کچھ ان کی بیگم بھی کہا کرتیں۔

ظاہر ہے، وہ بھی اپنی بیگم کے کس قدر مددگار رہے ہوں گے اور تھے بھی، ہم تو اس کے گواہ بھی ہیں۔

ایک بار وہ بہت بیمار تھے اتنے کہ اٹھ کر چلنا پھرنا بھی دشوار تھا۔ ان کی نواسی نے او لیول انگریزی کے مضمون میں دنیا بھر میں پوزیشن لی تھی۔ بہت خوش تھے۔ وہ بچی جدہ سے کراچی آئی تب اسے لے کر میرے گھر ملانے لائے۔ میں نے کہا بھی آپ نے کہہ دیا ہوتا میں آپ کے گھر آجاتی اور مل لیتی۔ آپ نے اتنی تکلیف کیوں اٹھائی؟

کہنے لگے، بچی نے تو مجھ میں اتنی طاقت پیدا کردی ہے کہ میں چلنے پھرنے لگا ہوں۔ مجھے معلوم تھا تم سب سے زیادہ خوش ہوگی اس لیے لے آیا ہوں۔

واقعی کامیابی تھی بھی بڑی، مگر ان کا میرے بارے میں اتنا خوش خیال ہونا اور بھی بڑی بات تھی۔

وہ چاہتے تھے کہ اس کے اعزاز میں ایک تقریب ہو، انھوں نے تقریب بھی منعقد کرنے کے سارے انتظامات کر لیے، جگہ اور شرکا سب کو اطلاع کردی گئی، مگر ان کی طبیعت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ حتیٰ کے تقریب والے دن وہ نڈھال ہو چکے تھے اور چلنے پھرنے سے قاصر۔ سب نے کہا ملتوی کردیں، مگر وہ نہیں مانے۔ کہا بھی گیا کہ وہ کیسے شریک ہوں گے۔ کہنے لگے، کسی طرح لے چلو میں کہیں نہ کہیں لیٹ جاؤں گا۔ مجھے امید ہے نوشابہ مہمانوں کو بھی سنبھال لے گی جو کچھ بولنا ہے وہ بھی بول لے گی۔ بھئی وہ تو اسٹیج ماسٹر ہے۔

یوں اپنے گھر کی تقریب بھی انھوں نے میرے حوالے کردی تھی۔ ان کا یہ اعتماد مجھ پر ہمیشہ رہا۔

کالج کے نظم و ضبط سے میں نے اپنی تحریر کا آغاز کیا تھا اور اس کے بعد جتنے بھی موقعے آئے، جتنی بھی تقاریب ہوئیں۔ کالج میں جتنے بھی کام ہوئے نظم و ضبط کا سارا کمال ان کی ہی ذات کے باعث تھا۔

طالب علموں کی تنظیموں نے ملک کی ہر درس گاہ کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ ہمارا کالج بھی اس کی لپیٹ میں تھا۔ نصیر صاحب نے ان تنظیموں کے نام نہاد رہنماؤں سے ہمیشہ بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ کبھی غصے سے کبھی پیار سے کبھی سختی سے سمجھاتے رہے، مگر وہ نہ رہنما

تھے نہ طالب علم، بس اپنے دشمن آپ تھے۔ وہ نصیر صاحب جیسے خوب صورت اور محبت کرنے والے استاد سے کوئی ایک سبق بھی نہیں لے سکے، الٹا انھوں نے انھیں گولی کا نشانہ بھی بنایا۔ وہ تو اپنی فتح مندی کا جشن منانے کالج سے نکل گئے، لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ نصیر صاحب زندہ رہے۔ ان کے حق میں پورے سندھ کے تعلیمی ادارے سترہ دنوں تک بند رہے، مگر گناہ گار چند دنوں جیل کاٹ کر پھر سے تعلیمی دنیا سیاہ کرنے باہر آگئے۔ نصیر صاحب کو کالج کے نظم و ضبط اور ترقی دینے کی سزا ملی جسے وہ بقیہ ساری زندگی بھول نہ پائے، اور جس دن وہ دنیا سے رخصت ہوئے اس کے تیسرے دن کالج کی عمارت سیل کردی گئی۔ اس مقام پر نہ وہ کالج رہا نہ اساتذہ، نہ وہ تنظیم نہ مارنے والے وہ ''رہنما'' جو نہ جانے کس مقصد کے حصول کے لیے گولیاں چلاتے تھے۔ علم اور تعلیم کو قتل کرتے تھے۔

نصیر صاحب نے البتہ اس کالج کے بہترین استاد اور بہترین پرنسپل کا خطاب اپنے نام کرلیا۔

آغا خان اسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں چپ چاپ لیٹے نصیر صاحب پہلی بار مجھے بہت برے لگے۔ میں ان کے سرہانے کھڑی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھے۔ جانے سو رہے تھے یا ہوش ہی میں نہیں تھے۔

میں نے ان کے ہی الفاظ انھیں لوٹائے، ''نصیر صاحب آپ یوں لیٹے ہوئے ہمیں ہرگز اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔ آپ کی باتیں، آپ کی مسکراہٹیں، آپ کی محبت، شفقت، داد و تحسین، شکایتیں، ڈانٹ ڈپٹ اور آپ کے بلند و بانگ قہقہے ہم سب سے محروم ہیں۔ اٹھیں اور ہمارے ساتھ گھر چلیں۔''

ان کا جواب یقیناً یہ ہوتا، ''نہیں دوست آج کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ سب کو ہی دوست کہہ کر مخاطب کیا کرتے، مگر میری خاموش آواز میں خود بھی کچھ اثر نہیں تھا۔ وہ کیا اثر لیتے، وہ کیا جواب دیتے؟ ان کی بیماری سے ہم ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ ہمارے حوصلے بھی دم توڑ چکے تھے۔ پھر انھوں نے بھی سوچ لیا کہ ان کا کم زور جسم اپنے پاؤں زمین پر جمانے کے قابل نہیں رہ پائے گا اور اب اسّی سال کی عمر میں وہ کلاس روم میں کڑک دار لیکچر بھی نہیں دے پائیں گے۔ کیوں نہ دنیا سے رخصت لے لی جائے۔ اللہ نے ان کی نہ ختم

ہونے والی رخصت کی درخواست پر دستخط کردیے اور ہم نے انھیں ان کے دوگز کے مکان میں پہنچادیا، اور اپنے دل میں ان کی الفت، بسالی، اپنے ذہن میں ان کی یاد کے دیے جلالیے۔ یہ وہی نصیر صاحب تھے جن کی آمد پر ہم کالج میں پریشان تھے اور یہ وہی نصیر صاحب تھے جن کی رخصت پر ہم بے حد دکھی ہیں۔ ان کے زوردار قہقہے آج بھی ہمارے کانوں میں گونجتے ہیں اور آنکھوں سے نہ رکنے والے آنسوؤں کی برسات شروع ہوجاتی ہے۔

جو تھے مگر نہیں رہے... انجم اعظمی

اس دن انجم صاحب اداس سے تھے، ان کے چہرے سے الجھن اور پریشانی نمایاں تھی۔ جو لوگ انھیں جانتے ہیں وہ یہی کہیں گے کہ ان کی مسکراہٹ میں بھی سنجیدگی نمایاں ہوتی تھی۔ ان کی نظریں ہمیشہ گہری ہوتیں۔ وہ ہمیشہ کسی گہری سوچ میں ہوتے۔ وہ سرسری طور پر کسی شخص کو یا کسی منظر کو نہیں دیکھتے۔ پورے طور پر سمجھنا چاہتے تھے۔ پوری اور بھرپور نظر رکھتے۔ وہ استاد تھے، الفاظ کا چناؤ ان پر ختم تھا۔ موضوع سے انصاف کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ بات یوں کرتے جیسے کوئی اور کر ہی نہیں سکتا ہو۔ اعتماد، بھروسا، علمیت اور آگاہی ان میں سب کچھ تو تھا۔

میرے وہ استاد تھے، بس صرف ایک سال کے لیے وہ یونی ورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے آئے تھے۔ اسی سال میں نے آنرز معاشیات میں داخلہ لیا تھا۔ اردو اختیاری مضمون تھا جس کے نمبر بھی ڈویژن میں شمار نہیں کیے جاتے۔ طالب علم صرف پاس ہونے تک اس مضمون میں دل چسپی لیتے۔ ان دنوں شعبۂ اردو جامعہ کراچی قابل اساتذہ سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر شاہ علی، جمیل اختر صاحب اور ابوالخیر کشفی بھی ہماری کلاس لیا کرتے، لیکن ایک کلاس کے لیے جانے کیوں گورنمنٹ کامرس کالج سے انجم صاحب بھی بلالیے گئے تھے۔ شاید اس لیے کہ مجھے یہ

سعادت حاصل ہوجائے کہ میں یہ کہہ سکوں کہ وہ میرے استاد تھے۔ انجم صاحب نے ہمیں صرف ایک سال پڑھایا اور دنیا سے جاتے جاتے ہماری زندگی میں ایک انتہائی اہم معتبر ہستی کے طور پر داخل رہے۔ ان سے رشتہ استاد اور شاگرد کا تھا، مگر سال گزرنے کے بعد آنے والے تمام برسوں کے لیے وہ ہمارے دوست بن گئے۔ ایسے دوست جو نہ ہم عمر تھے اور نہ علم میں برابر، ان کا رتبہ بڑا، ان کی حیثیت بڑی، مگر ہم دونوں جب مل کر بیٹھتے تب دیکھنے والا تیسرا فرد علم اور عمر کے فرق کو جان نہیں پاتا۔

ایک دن کہنے لگے، ''تمھیں معلوم ہے میں تمھیں کس قدر اور کیوں چاہتا ہوں؟'' وہ میری طرف بہ غور دیکھ رہے تھے۔

میں نے بھی پلکیں جھکائے بغیر ان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، ''کچھ کچھ جانتی ہوں، کچھ کچھ نہیں بھی۔''

''میں نہیں پوچھوں گا کہ کیا جانتی ہو کیا نہیں، مگر میں خود بتانا چاہتا ہوں۔''

''بتا دیجیے۔'' ایک شاگرد کی حیثیت سے مجھے یہ گفتگو اچھی لگ رہی تھی۔

''تم بہت باادب لڑکی ہو، میرا بہت لحاظ کرتی ہو۔ بہت سال گزر گئے، اب خود بھی استاد بن گئی ہو، مگر اب بھی میرے سامنے شاگرد بنی رہتی ہو۔ استاد مان کر تعظیم کرتی ہو۔ یہ بات مجھے اچھی لگتی ہے، ہر کسی کو اچھی لگ سکتی ہے اور یہی وجہ تمھیں پسند کرنے کی ہے، مگر صرف ایک ہی وجہ نہیں، اور بھی ہے۔'' پھر وہ رکے اور اپنی ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ بولے، ''تمھارے والد رشید احمد صدیقی کے چہیتے طالبِ علم تھے۔ میں بھی ان کا ایک چہیتا طالبِ علم ہوں۔ یوں تمھارے ابا اور میں دونوں ایک ہی شخص کے لاڈلے تھے اور ہم دونوں ایک ہی شخص کی پرستش کرتے تھے۔ میں اسی رشتے سے تمھیں اہمیت دیتا ہوں اور چاہتا بھی ہوں۔''

مجھے ان کی یہ گفتگو اچھی لگ رہی تھی کہ اس گفتگو میں میرے ابا شریک تھے جنھیں میں نے دیکھا ہی نہیں تھا، لیکن وہ ہمیشہ سے میری آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔

''اگر ایسا نہ ہوتا تب میں تمھارے خوب کان کھینچتا۔'' اب کے انھوں نے شرارت سے کہا۔

میں جانتی تھی کیوں؟ کلاس میں، میں نے انھیں بہت ستایا تھا۔ سوال پہ سوال اور ہر جواب پر تکرار، مگر ایک اچھے استاد کی طرح انجم صاحب میرے سوالوں سے نہ گھبراتے تھے نہ الجھتے تھے۔ برابر جواب دیتے اور مطمئن کرنے کی کوشش کرتے۔

ان دنوں شاعروں میں علامہ اقبال میری کم زوری تھے۔ وہ لیکچر یوں شروع کرتے، ''اقبال بڑے شاعر ہیں، مگر بہت بڑے نہیں۔'' اس ''مگر بہت بڑے نہیں'' پر میں خفا ہو جاتی۔ بحث کرنے لگتی۔ جس قدر زور سے میں بولتی، اتنی ہی آہستگی سے وہ جواب دیتے رہتے۔ میں سوال کرتے کرتے تھک جاتی وہ جواب دیتے نہ تھکتے۔ دوسرے طالب علم مزے لیتے۔ یوں پیریڈ ختم ہو جاتا۔ اگلے دن پھر اسی ''مگر'' سے بات شروع ہوتی۔

ایک دن، دو دن، تین دن میں کلاس میں خلافِ معمول خاموش رہی۔ بس چپ چاپ لیکچر سنتی رہی۔ بات بات میں ''مگر'' کا لفظ آتا اور میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتی، تب وہ گھبرا گئے اور ایک دن پوچھ ہی بیٹھے، ''کیا بات ہے چپ کیوں رہتی ہو؟ بحث کرو، مجھے پڑھانے میں مزہ نہیں آرہا ہے۔'' انھوں نے بھری کلاس میں اعتراف کیا۔

''مگر اب مجھے خاموش رہنے میں مزہ آرہا ہے۔ میں آپ کو سن رہی ہوں۔ ایک ایک لفظ پر غور کر رہی ہوں۔ اندھی عقیدت اور بے وجہ پسند معنی نہیں رکھتی۔ 'مگر' کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔'' میرا یہ جواب تھا اور جانے کیسے میں نے یہ جواب باآوازِ بلند دے بھی دیا تھا۔ یعنی یہ میری پسپائی تھی اور اعترافِ پسپائی بھی۔

دوسرے دن کلاس کے باہر انھوں نے ایک کتاب ''لہو کے چراغ'' مجھے تحفے میں دی، یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ تھا۔

''سر! یہ میرے لیے ہے۔ یقین نہیں آرہا ہے۔'' میں اپنے آپ کو یقین دلا رہی تھی کہ ایک استاد ایک شاگرد کو اپنی کتاب کیوں کر دے سکتا ہے، مگر یہ یقین پھر میری باقی ساری زندگی کے لیے یقین اور اعتماد بن کر رہا۔

یونی ورسٹی کے دن گزر گئے۔ انجم صاحب ہمارے گھر آنے لگے۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے۔ میں نے ان دنوں ان سے اتنا کچھ سیکھا جتنا میں سو کتابیں پڑھ کر بھی نہیں سیکھ پاتی

اور جب ہی میں نے جانا کہ کتابوں سے زیادہ صحبت سکھاتی ہے، اچھی صحبت اچھا صلہ دیتی ہے۔

انجم صاحب علم کا خزانہ تھے جسے وہ چھپا کر نہیں رکھتے تھے۔ چند منٹ کی بھی ملاقات میں وہ دوسروں کو کچھ نہ کچھ تھما دیتے تھے۔ ان کے پاس خیالات تھے، تجربہ تھا، گہری سوچ تھی، فکر تھی۔ بہت سارا علم تھا جسے انھوں نے کتابوں سے، دنیا سے، استادوں سے، درس گاہوں سے کشید کیا تھا۔ خیالات کو الفاظ کا جامہ وہ یوں پہناتے جیسے ایک لباس تراشنے والا ماہر درزی ہو جو معمولی درجے کے کپڑوں کو اپنی ماہرانہ تراش خراش اور سلائی سے جسم پر یوں آراستہ کرتا ہے کہ مہنگے ترین کپڑے کی غلط سلائی جسم کو بے ہنگم بنا دیتی ہے۔ جی چاہتا انجم صاحب بولتے جائیں ہم سنتے جائیں، کوئی اور بیچ میں نہ بولے، نہ ٹوکے، گھنٹا نہ بجے، وقت نہ ختم ہو، وہ روسٹرم نہ چھوڑیں۔

جس تقریب میں وہ شریک ہوتے میں حتی الامکان وہاں ضرور جاتی، سنتی اور بہت سے الفاظ، بہت سے جملے، بہت سارے خیالات اپنے ذہن میں سجا کر بسا کر ساتھ لاتی۔

ایک دن کہنے لگے، ''یہ تم ایم اے پر ایم اے کب تک کرتی رہوگی، بس کرو، ختم کرو۔ تین عدد ایم اے کرنا قابلیت تھوڑی ہے، اپنے پر سے اعتماد کھونے کا نام ہے۔''

''کیوں؟'' میں سوال جواب پانے کے لیے نہیں کرتی، ان کے خوب صورت جملے سننے کے لیے کرتی۔

''ایک مضمون پڑھو، خوب پڑھو، ایسا کرو کسی ایک مضمون میں پی ایچ ڈی کرلو۔''

''آپ نے کیوں نہیں کیا؟'' پھر سے میرا ایک سوال۔

''جواب دوں؟'' انھوں نے پوچھا۔

''دیں نا۔'' میں نے کہا۔

''ایک بار ابواللیث صدیقی کے کمرے میں بیٹھا تھا، وہ کہنے لگے، انجم! تم اتنے قابل استاد ہو، اپنے مضمون پر گرفت رکھتے ہو، دس کو پی ایچ ڈی کرا سکتے ہو، خود کیوں نہیں کر لیتے؟''

''دیکھا۔ انھوں نے بھی تو یہی کہا تھا۔'' میں نے چہک کر کہا۔

''ہاں، مگر میرا جواب بھی تو سنو نا۔''

''کہیے، بتائیے۔''

''میں نے انھیں جواب دیا۔ لیث صاحب! آپ ماہرِلسانیات ہیں، ناقد ہیں، نثر نگار ہیں، کتابوں کے مصنف ہیں، آپ کی علمیت، قابلیت سب پر عیاں ہے۔ آپ کی کتابیں، آپ کے شاگرد، آپ کے لیکچر بولتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ میں پی ایچ ڈی کرلوں کہ میرے پاس ساری معلومات ہیں۔ جمع کرنے کی محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ صرف مقالہ لکھنے کے لیے وقت ہی تو چاہیے۔ بس لیث صاحب! آپ کا یہ یقین ہی میری پی ایچ ڈی ہے۔ پھر وہ خاموش ہو گئے۔''

''اب میں تو آپ کو وہ جواب نہیں دے سکتی جو آپ نے لیث صاحب کو دیا تھا۔ پھر میرا جواب کیا ہونا چاہیے؟'' الٹا میں نے ان سے سوال کر دیا؟

''کوئی جواب کی ضرورت نہیں۔ میں روز تمھارے گھر آیا کروں گا۔ تم کالج سے آنے کے بعد بیٹھ جانا۔ میں تمھیں لکھواتا رہوں گا، تم لکھتی رہنا، تھوڑا سا کام اور تمھیں خود کرنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے تم کرلوگی۔ بس معاوضے میں مجھے اچھی سی چائے پلا دینا۔''

''موضوع کیا ہوگا؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''ظاہر ہے رشید صاحب سے ہی متعلق کوئی موضوع منتخب کرلیں گے۔''

یوں میرے پی ایچ ڈی کرنے کا پلان بن گیا جو سارے کا سارا انجم صاحب کے لکھنے اور بولنے پر منحصر تھا۔

بھلا پی ایچ ڈی ایسے ہوتی ہے، جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑتی ہے، کتنے سفر کرنے پڑتے ہیں۔ میں نے کہا، ''سر! میری ساری ڈگریاں اصلی ہیں، آخری ڈگری جعلی کیوں بنوا رہے ہیں؟''

پھر ہم دونوں ہنسے۔ خوب ہنسے۔ دیر تک ہنستے رہے۔

میں نے کہا، ''سر! آپ جانتے ہیں لیث صاحب اور میرے ابا دونوں کلاس فیلو تھے، دوست تھے اور پڑوسی بھی تھے۔ آپ تو علی گڑھ میں تھے۔ لیث صاحب نمبر ایک ماریسن روڈ میں اور ہم لوگ دو نمبر ماریسن روڈ کے گھر میں رہتے تھے۔''

میری عمر اس وقت بس دو برس ہی رہی ہوگی، لیث صاحب کی گود میں چڑھی رہتی تھی۔ میرے ابا کہتے۔ لیث! تم نے تو میری بیٹی لے ہی لی ہے۔

لیث صاحب کہتے، حسن! تم میری بیٹی لے لو ہم بیٹی بدل دوست بن جائیں گے۔

لیث صاحب کی تین بیٹیاں تھیں۔ ابا کہتے، تم نے تو آسمان کے تارے اپنے گھر میں سجا رکھے ہیں۔ ان کے نام نسرین، پروین اور ثریا تھے۔

''تمھیں پتا ہے رشید صاحب نے لیث صاحب کے نام ایک خط لکھا تھا اور میری تقرری کی سفارش کی تھی۔'' انجم صاحب نے انکشاف کیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''اب آگے کی بات میں تمھیں نہیں بتاؤں گا۔''

سفارش کا وہ خط بہت بعد میں میری نظر سے گزرا بھی۔ یہ انجم صاحب کی شرافت تھی کہ انھوں نے اپنے منہ سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

ایسے ہی ہماری شاگردی ان کی استادی اور دوستی کی زندگی سالوں چلتی رہی۔ ان کی محبت میں کمی نہیں آئی۔ میرے ادب میں بے ادبی نے کبھی جگہ نہیں بنائی، لیکن وہ ایک دن، بہت برا دن تھا۔ وہ خلافِ معمول جلدی کالج چھوڑ کر آ گئے۔ میرا کالج دیر سے شروع ہوتا تھا اور میں جانے کی تیاری میں لگی تھی۔

اب کیا ہوا؟ ان کے آنے سے میں پریشان ہوگئی، دروازہ کھولا، ڈرائنگ روم کی طرف کا نہیں، بلکہ دوسری جانب سے اندر آجانے کا، جہاں سب سے پہلے دائیں جانب کھانے کی میز اور ساتھ ہی کچن ہے۔ بائیں جانب بیٹھنے کا ایک گوشہ، یہ لاؤنج ہے۔ میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا، مگر وہ میز کی طرف بڑھ گئے، ''کچھ کھلاؤ۔''

میں جلدی سے کچن میں گئی، مائیکروویو میں سالن گرم کیا۔ بقیہ چیزیں میز پر سجا دیں۔ سامنے بیٹھ گئی۔ چاہتی تھی وہ جلدی سے کھانا کھالیں تا کہ میں وقت پر کالج جا سکوں۔

انھوں نے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، سگریٹ سلگا لیا۔ میں تیار ہونے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی دیکھا، کھانے کی پلیٹ میں سگریٹ کی راکھ اور کئی ادھ جلے سگریٹ کے

ٹکڑے پڑے تھے۔

''آپ نے کچھ کھایا نہیں؟'' یہ سوال میں نے بآوازِ بلند کیا اور اپنے آپ سوچا، جانے بات کیا ہے؟ مگر سوال کا جواب نہ پاکر بھی زور نہیں دیا کہ میں جلد از جلد کالج کے لیے نکلنا چاہتی تھی۔

''آپ کھانا کھالیتے تو اچھا تھا، مجھے کالج جانا ہے۔'' مجھے یہ جملہ ادا کرنا پڑا۔

انھوں نے نظریں ملائیں، ''آج میں بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' ان کی آنکھیں سرخ اور چہرے پر اور دنوں سے زیادہ سنجیدگی تھی، ''مگر خیر تمھیں شاید ضرور جانا ہے، تم کالج جاؤ۔''

آج سوچتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ آج نہ جاؤ۔ وہ باتیں سنو جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ ہاں، سو فی صد ایسا ہی تھا۔ میں ہر بار سوچ کر یہی نتیجہ اخذ کرتی ہوں۔

اس وقت میں نے کہا، ''مگر سر! مجھے ضروری جانا ہے آج ورنہ رک جاتی۔ سر! مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے یہ کہنا۔'' واقعی اس دن اسٹاف میٹنگ تھی۔ غیر حاضر ہونا ممکن نہیں تھا۔ میں نے وجہ بھی انھیں نہیں بتائی۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے، کچھ نہیں بولے۔ مجھے جاتے ہوئے تھکے تھکے سے لگے۔ ''سر! آپ کس دن آئیں گے، میں کالج نہیں جاؤں گی اس دن۔'' مگر انھوں نے کسی اور دن آنے کا وعدہ نہیں کیا۔ بس خدا حافظ کہا۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں بھی کالج چلی گئی۔ وہ آگے آگے تھے، میں پیچھے پیچھے۔ پھر ہم کبھی نہیں ملے۔

کئی دنوں بعد اطلاع ملی وہ اسپتال میں ہیں۔

سر سے پیر تک میں دکھ میں نہا گئی۔ وہ بیمار کیسے ہوگئے اور اتنے شدید کہ اسپتال جانا پڑا۔ فوراً اسپتال پہنچی۔ وہاں بھابی سے ملاقات ہوئی، لپٹ گئیں، ''تمھارے سر بہت بیمار ہیں، آنکھیں نہیں کھول رہے ہیں، کچھ بات بھی نہیں کرتے، تم دعا کرو۔''

فرمان صاحب ایک طرف اداس کھڑے تھے، میں ان کے پاس چلی گئی۔ وہ بھی کچھ

نہیں بولے۔ بس ہمیشہ کی طرح سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

میری آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہورہی تھیں، ضبط جواب دے رہا تھا۔ میں چپکے چپکے نہیں چیخ کر رونا چاہتی تھی، مگر یہ جگہ چیخنے کی نہیں تھی۔ کرسی پر بیٹھ گئی، ایک پرچے پر لکھا:

سر! آپ کو ایک دن مجھ سے بہت ساری باتیں کرنی تھیں، مگر مجھے وقت پر کالج پہنچنا تھا، بات نہیں ہوسکی۔ آج میں آپ سے وہ بہت ساری باتیں پوچھنا چاہتی ہوں، آپ کے پاس وقت نہیں ہے۔ یوں بدلہ تو نہ لیں۔

جب بھی آپ آنکھیں کھولیں، میری یہ تحریر ضرور پڑھ لیجیے گا، ہوسکے تو وہ بات بھابی کے ذریعے مجھ تک پہنچادیں۔

مگر جو بات میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں اس کا جواب مجھے کیسے ملے گا؟ آپ اتنی جلدی بیماری کی اس آخری حد تک کیوں پہنچ گئے؟ آپ کی شفقت، محبت، آپ کے سبق، آپ کے خیالات، آپ کے الفاظ، آپ کی کتابیں، آپ کے شاگردوں کو ابھی آپ کی ضرورت ہے۔

ہمیں بھی تو اپنا اچھا، پیارا استاد چاہیے کہ ہم اس سے بہت ساری باتیں پوچھ پوچھ کر اپنا قد بڑا کرتے ہیں۔ اب تو ہم چھوٹے رہ جائیں گے۔

میں نے وہ پرچہ بھابی کے ہاتھ میں تھمادیا۔

سر جب بھی آنکھیں کھولیں اگر وہ خود نہ پڑھ سکیں آپ انھیں سنا دیجیے گا۔

ہاں مجھے بعد میں پتا چلا کہ انھوں نے ایک وقت آنکھیں کھولی تھیں، چند گھونٹ پانی کے بھی پیے تھے اور میری تحریر بھی سنی تھی۔ مسکراتے ہوئے کہا تھا، ''مرنا کون چاہتا ہے، مگر مرنا پڑتا ہے۔''

''مگر'' پر اس وقت بھی انھوں نے زور دیا تھا، میں نے جان لیا واقعی زندگی میں ''مگر'' کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔

مگر پھر بھی ہم زندگی میں ان تمام باتوں کو اہمیت نہیں دیتے جو اہم ہوتی ہیں۔ ان

تمام رشتوں کو صحیح طور پر نہیں نبھاتے جنھیں نبھانا چاہیے ہوتا ہے۔ وہ تمام کام نہیں کرتے جو کرنا ہم پر فرض ہوتا ہے اور جسے ہم فرض نہیں مانتے۔ ہمیں تو زندگی کے ہر ایک لمحے کو بامعنی بنانا چاہیے جسے ہم لمحہ لمحہ کھو دیتے ہیں اور پھر وہ لمحہ آ جاتا ہے جب زندگی میں ایک لمحہ بھی باقی نہیں بچتا۔ یہ پچھتاوا میری زندگی میں ہمیشہ رہے گا۔ کاش اس دن میں نے ان کی بات سن لی ہوتی۔ انھوں نے مجھے زبردستی کالج جانے سے روک دیا ہوتا۔ جلدی جلدی انھوں نے وہ سب کہہ دیا ہوتا جسے وہ دل میں چھپا کر لائے تھے، وہ ایسی کون سی بات تھی جو وہ صرف مجھ سے کہنا چاہتے تھے، مگر نہ کہہ سکے۔ وہ لمحہ جو ہمیں ملا تھا، مگر جسے ہم نے ضائع کر دیا۔

ابوالخیر کشفی صاحب کی بیگم اور ان کے دو بچوں کا یونی ورسٹی روڈ پر حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ دن یونی ورسٹی کی تاریخ میں بڑا اداس دن تھا، ہم سب کلاس چھوڑ کر باہر نکل آئے تھے۔ ہم سب کی آنکھیں اشک بار تھیں، سہمے ہوئے تھے۔

چند دن بعد انجم صاحب نے میرے ہاتھ میں ایک کاغذ تھما دیا۔

میں نے کھول کر تحریر پڑھی، ''بیگم طاہرہ کشفی اور دو معصوم بچوں کی دردناک موت کا ایک تأثر''۔ وہ کاغذ آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ زمانے نے اسے خستہ کر دیا ہے، صفحے کی تہ نے کچھ حروف کاٹ دیے ہیں، روشنائی پھیکی پڑ گئی ہے، مگر انجم صاحب کی موت پر اسے نکال کر میں نے پھر سے پڑھا۔ مٹے ہوئے حروف بھی سمجھ میں آ رہے تھے۔ دردناک موت کا تأثر تو موجود ہی تھا۔ طاہرہ کشفی اور دو بچوں کی موت پر تو صبر آ چکا تھا، مگر یہ نوحہ اب مجھے انجم صاحب کی موت کا نوحہ لگ رہا تھا۔

میرے پاس ان کے ہاتھ کی یہ تحریر اس لیے بھی اہم ہے کہ نظم کسی اور کے پاس نہیں، ان کے کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں۔ میں اسے ان کا ہی ذکر کرتے ہوئے تاریخ کے حوالے کر رہی ہوں۔

مٹے ہوئے لفظ مٹے ہی رہیں گے کہ لکھنے والا اپنا قلم دنیا میں چھوڑ گیا ہے اور اپنی انگلیاں ساتھ لے گیا ہے۔

موت

(بیگم طاہرہ کشفی اور ان کے دو معصوم بچوں کی دردناک موت کا ایک تأثر)

اے خدا
آج مرے دل میں ذرا
جھانک کر دیکھ کہ تاریک ہے دنیا کتنی
تو ہے نقاشِ ازل اور حیاتِ ابدی کا خالق
مجھ کو آفاق کی تسخیر کا سودا ہی سہی
موت کی آگ نے چہروں کو جلایا یکسر
خوش ہوئی خانۂ آباد کو ویراں کر کے
دل کی دھڑکن سے بھی تاریک تھے جو رشتے ان کو
آنسوؤں کی بھی شہادت نہ ملی
اے خدا
آج مرے پاس تو آ
گھر کی چوکھٹ پہ مری روح کی فریاد تو سن
مرے غم خوار تھے، دل دار تھے، پھر آج کہاں ہیں وہ لوگ
.....☆۱اک آسیب ہے تنہائی کا
.....☆۲اور سو گئے آغوشِ لحد میں سورج
اک اندھیرا ہے کہ ہر شے کو نگل جائے گا

(انجم اعظمی)

○

☆۱،۲۔ حروف کاغذ سے الگ ہو گئے ہیں۔

سب کے جلیس... ابراہیم جلیس

میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن پھر آہستگی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ مجھے گئے دنوں کا وہ واقعہ یاد آیا جو میری طالب علمی کے زمانے کا تھا اور میں نے جوش اور جذبے سے مغلوب ہو کر اونچی آواز میں جو گفتگو کی تھی وہ یقیناً تہذیب کے دائرے میں نہیں آتی تھی، لیکن اپنے ساتھی طالبِ علم کی حمایت میں اس کے والد سے جو لہجہ اختیار کیا تھا، پتا نہیں اس وقت کے لحاظ سے ٹھیک تھا، نہیں لیکن آج اس لہجے کی دھمک اور چمک مجھے شرمندہ کر رہی تھی۔

میں فون کرنا چاہ رہی تھی ابراہیم جلیس صاحب کو جن سے میرا مکالمہ اس وقت ہوا جب میں شعبۂ صحافت میں دوسرا ایم اے کر رہی تھی اور شہریار جلیس میرا کلاس فیلو تھا۔

واقعہ کچھ یوں تھا کہ ہم نے جب شعبے میں داخلہ لیا تب شعبۂ صحافت مجھے شعبۂ معاشیات سے بہت مختلف محسوس ہوا۔ معاشیات کے شعبے میں آنرز اور ایم اے کرنے میں جو چار سال وہاں گزرے وہ سخت محنت کے دن تھے۔ ایک تو مضمون مشکل دوسرے یہ کہ پہلا ایم اے تھا جو زندگی اور موت کا معرکہ ہوتا ہے۔ ہم نصابی سرگرمیاں یقیناً ساتھ ساتھ تھیں پھر بھی پڑھائی میں زیادہ وقت دینا ہوتا تھا۔ یہ شعبہ یونی ورسٹی کا سب سے بڑا شعبہ تھا۔ طالب علموں کی تعداد کے لحاظ سے۔ صدرِ شعبہ اور اساتذہ سنجیدہ ہر وقت ٹیسٹ ٹیوٹوریل کا خوف مسلط رہتا۔

شعبۂ صحافت کا ماحول دوستانہ تھا۔ طالب علموں کی تعداد کم تھی۔ اساتذہ کا ہم سے

قریبی رابطہ رہتا تھا۔ ہمارا تیسرا بیچ تھا ڈگری کے لحاظ سے۔ اس سے قبل ڈپلوما لینے طالب علم آتے تھے۔ ہمارے ساتھ دس طالبات اور نو طالب علم تھے یوں انیس لوگوں نے ایک ساتھ داخلہ لیا تو اساتذہ کو لگا جیسے ہجوم لگ گیا ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں ظہور بھوپالی، شہریار، سلیم مراد، نصیر ترابی، رشید بٹ، نجم الحسن اور کئی بنگالی لڑکے بھی تھے جن میں سے ایک ریڈیو پر بنگالی خبریں بھی پڑھتا تھا۔ طالبات میں طاہرہ جلیل کی شہرت تھی۔ دیگر طالبات کے علاوہ رضیہ بوندرے انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد یہاں آئی تھیں جو بعد میں رضیہ بھٹی ہوئیں۔ نیوز لائن کی ایڈیٹر بنیں اور اپنی بے باک صحافت کے باعث شہادت کے درجے پر فائز ہوئیں۔

ہم سب بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ صدرِ شعبہ شریف المجاہد اور دیگر اساتذہ بھی ہم سے قریب تھے۔ یہاں آکر تفریح زیادہ اور پڑھائی کم کرنی پڑی۔ ہمارے دونوں سال یادگار تھے۔ دوسال پل بھر میں گزر گئے۔ فائنل امتحان آگئے خوشی بھی کہ ہم کامیابی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے والے تھے اور دکھ بھی کہ ہمارا حسین ساتھ چھوٹ جائے گا۔ شاید اوروں کو یہ احساس شدید نہیں تھا، لیکن میں یہ دُکھ اپنے پہلے ایم اے کے بعد اٹھا چکی تھی اور وہ ساتھی جو چار سال روز ہم سے ملتے تھے، بکھر گئے تھے۔ بس اپنی یادیں چھوڑ گئے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ یہ المیہ ہوتا ہی ہے، لیکن اس وقت احساس ہوتا ہے کہ جب ہم اپنی اپنی سند سنبھال کر دنیا کے کونے کونے میں پھیل جاتے ہیں۔ عملی زندگی کی مصروفیات ہماری طالب علمی کی زندگی کو کسی قدر بھلا دیتی ہیں۔

آخری روز وائیوا تھا۔ تمام طالب علم شعبے کے باہر کاریڈور میں جمع تھے۔ یہ ہمارے امتحان کا بھی آخری دن تھا اور جامعہ کراچی میں ساتھ رہنے کا بھی آخری دن۔ ہم ممکنہ سوال کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک خیال آیا شہریار موجود نہیں ہے۔ ہمیں فکر ہوئی وہ کیوں نہیں آیا؟ یہ سوال ہم کس سے کرتے، جواب کسے معلوم تھا۔ ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ تھا فون کا۔ یونی ورسٹی میں ایک ہی ٹیلی فون بوتھ تھا جو ہماری گفتگو منزلِ مقصود تک پہنچانے پر تو مامور تھا، لیکن ہوتا یوں تھا کہ ہماری قیمتی کنگورے دار اکنّی وہ اکثر ہضم کر جاتا اور ہماری آواز منزلِ مقصود تک پہنچنے سے محروم رہ جاتی۔ پھر اگر ہم اس نقصان پر آمادہ بھی ہو جاتے تب ہمیں شہریار کے

گھر کا نمبر کب یاد تھا۔ ان دنوں فون کرنا اتنا عام نہیں تھا۔

وقت گزرتا جارہا تھا اور شہریار کے آنے کی امید کم ہوتی جارہی تھی، کیا کریں؟ طاہرہ اور میں نے سر جوڑ لیا۔

اگر وہ وائیوا دینے نہیں آیا تو فیل ہوجائے گا، یہ خیال بھی بھیانک تھا۔ طے پایا کہ اس کے گھر چلتے ہیں۔ کہاں کراچی یونی ورسٹی، شہر سے بارہ میل پرے اور کہاں پی آئی بی کالونی، یونی ورسٹی بس کے اپنے مقررہ اوقات تھے۔ رکشا ٹیکسی آج کی سواری ہے، ہمیں تو صرف پوائنٹ ہی میسر تھی۔

دونوں نے اپنے اپنے بٹوے کھنگالے، اتنے پیسے پاس نہیں تھے کہ رکشا ٹیکسی کی عیاشی پر آمادہ ہوتے۔ اِدھر اُدھر سے جمع کیے، اس اِدھر اُدھر میں شعبے کا چپراسی گل شیر بھی شامل تھا جس کی جیب میں پیسے ہوتے تھے اور ہم اسے رشک سے دیکھا کرتے۔

اتفاق سے پوسٹ آفس کے پاس ایک رکشا نظر آگیا۔ اُچک کر بیٹھ گئے وہ نہ نہ کرتا گیا، مگر ان دنوں طالب علموں کا سکہ چلتا تھا۔ اس نے رکشا اسٹارٹ کردیا اور ہمیں خیال آیا کہ ابھی تو ہم نے بھی وائیوا نہیں دیا ہے۔ راستے بھر ایک دوسرے سے سوال و جواب کرتے رہے اور شہریار کے لیے دعا بھی مانگتے رہے۔

رکشے والے کو ڈانٹتے بھی رہے کہ تیز چلاؤ۔

شہریار کے گھر پہنچ گئے۔ پچھلا دروازہ کھلا تھا۔ سامنے جلیس صاحب کرسی پر آدھے لیٹے اخبار کا مطالعہ کررہے تھے اور کمرے میں شہریار بے حس وحرکت پڑا تھا۔ چارپائی کے ساتھ ہی ایک اُگال دان تھا جس میں تین چار بار الٹیاں پتا دے رہی تھیں کہ وہ بیمار ہے۔ ہم نے اپنے آنے کی اطلاع زور زور سے چیخ کردی۔ پرانے زمانے کی کہاوت ہے ساس ڈانٹتی بیٹی کو ہے، مگر سناتی بہو کو ہے۔ ہم مخاطب شہریار سے تھے اور سنا جلیس صاحب کو رہے تھے۔

یہاں مزے سے لیٹے ہو کچھ ہوش ہے آج وائیوا ہے۔ معلوم ہے فیل ہوجاؤ گے۔ سال بھر کی محنت بے کار جائے گی۔ شہریار کم زوری آنکھیں پھاڑے بس ہمیں تک رہا تھا۔ اس میں تو بولنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ طاہرہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور جھٹ ہٹا لیا۔

''اُفوہ! کتنا تیز بخار ہے۔'' وہ مامتا سے چُور ہو کر بولی، اور پھر تو اس نے جلیس صاحب پر براہِ راست حملہ کر دیا۔

''اچھے باپ ہیں۔ آرام سے لیٹے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ معلوم ہے آپ بہت بڑے صحافی ہیں، مگر آج اگر آپ اخبار نہیں پڑھیں گے تو صحافت کی دنیا میں کوئی آفت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ آپ کو تو شہریار کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ آپ کیسے باپ ہیں، آپ کو بیٹے کی فکر ہی نہیں ہے۔ اس کا کیریئر داؤ پر لگا ہوا ہے۔ آج اس کا امتحان ہے۔ آپ کو کچھ اس کا خیال بھی ہے؟'' طاہرہ سانس لیے بغیر بولے چلی جا رہی تھی۔

جلیس صاحب نے کچھ کہنے کے لیے تھوڑا سا اٹھنا بھی چاہا کہ میں نے طاہرہ کی بات آگے بڑھا دی۔

''آپ شہریار کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہوتے کچھ تو طبیعت بہتر ہو ہی جاتی، پھر اسے لے کر یونی ورسٹی آنا چاہیے تھا۔''

میرا جواب بھی انھوں نے دینا چاہا کہ طاہرہ چیخ پڑی۔

''آپ تو چاہتے ہی نہیں کہ وہ صحافی بنے۔ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ پر بازی لے جائے گا، ایسا ہی ہے نا؟''

''ہاں ہاں بالکل۔'' بجائے اس کے کہ جلیس صاحب جواب دیتے میں بول پڑی، جیسے مجھے بالکل یقین تھا کہ وہ شہریار کو امتحان میں فیل کرانا چاہتے ہیں۔

''اگر آپ چاہتے تو اسے لے کر یونی ورسٹی ضرور آتے۔ کیا آپ کو اس کے امتحان کی اہمیت کا اندازہ نہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

طاہرہ نے پھر چیخ ماری، ''جانے کیسے باپ ہیں آپ۔ ذرا بھی ذمے داری نہیں ہے آپ میں۔ میں نے تو ایسے باپ اپنی زندگی میں نہیں دیکھے۔'' طاہرہ ایسے کہہ رہی تھی کہ جیسے اس نے زندگی کے ساٹھ ستر سال گزار لیے ہیں اور یہ اس کی زندگی کے تجربے کا نچوڑ ہے۔

''بالکل صحیح کہہ رہی ہو طاہرہ۔ میں نہیں سمجھتی تھی جلیس صاحب کہ آپ ایسے باپ ہوں گے۔ مجھے تو سخت حیرت ہو رہی ہے آپ پر۔'' میں نے طاہرہ کی بات آگے بڑھانی ضروری سمجھی۔

اس عرصے میں جلیس صاحب کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ چکے تھے، اور اخبار توڑ موڑ کر گود میں آگرا تھا۔

وہ جب بھی کچھ کہنا چاہتے ہم دونوں میں سے کوئی بولنا شروع کر دیتا۔ طاہرہ جب جی بھر کے بھڑاس نکال چکی تب تک میرے بھی شکوے اور لعن طعن کے تمام جملے ختم ہو چکے تھے۔ ہم دونوں تیزی سے شہر یار کی طرف بڑھے۔

''اٹھو، حوصلہ کرو، ہمت کرو، کپڑے بدلو۔'' طاہرہ نے شہر یار کو امتحان یاد دلایا۔

وہ کتنے دنوں سے بیمار تھا یہ سب تو ہم نے پوچھا ہی نہیں۔ وہ بے حد کم زور ہو رہا تھا، اور واقعی اس میں اٹھنے کی سکت نہیں تھی، لیکن امتحان کا واسطہ دے کر ہم نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

جانے اس نے منہ ہاتھ بھی دھویا یا نہیں، مگر ہاں قمیص پینٹ پہن کر وہ لڑکھڑاتا آ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں اسے سہارا دے کر دروازے کی طرف بڑھے۔ جلیس صاحب سے اب رہا نہیں گیا، دوڑ کر آگے آ گئے، ''آپ دونوں رکیں میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔''

طاہرہ چیخی، ''جی نہیں آپ بیٹھ کر آرام سے اخبار کا مطالعہ کریں۔ کہیں کوئی خبر پڑھنے سے رہ نہ جائے۔'' میں نے بھی طاہرہ کا ساتھ دیا، لیکن دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی کہ ہم دونوں لمبے تڑنگے بیمار کم زور شہر یار کو کیسے سنبھال پائیں گے۔ اگر اس نے راستے میں الٹی کر دی یا بخار کی شدت بڑھا لی تو، مگر اب ہم اپنے غصے میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ طاہرہ نے شہر یار کو دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا رہنے کی ہدایت کی اور باہر گلی سے ٹیکسی ڈھونڈنے نکل پڑی۔

جلیس صاحب نے مجھے اکیلا پا کر رام کرنے کی کوشش کی۔

''میں بھی چلتا ہوں۔'' خوف زدہ جلیس صاحب کا لہجہ خوشامدانہ تھا۔

''نہیں۔'' میں نے اپنا قطعی فیصلہ سنا دیا، ''ہم خود لے جائیں گے شہر یار کو اور واپس بھی پہنچا دیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔''

انھوں نے قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا،

''اچھا کچھ پیسے رکھ لیں۔'' جلیس صاحب اب بھی ہم سے ڈرے ہوئے تھے۔ آواز بہت دھیمی تھی۔

ہماری خودی جاگ اٹھی، ''جی نہیں، ہمارے پاس ہیں۔'' ہم نے تیز آواز میں جھوٹ بولا اور شکر ادا کیا کہ ان کی پیش کش کے موقعے پر طاہرہ موجود نہیں تھی ورنہ اس کا جواب یقیناً ناقابلِ برداشت ہوتا۔

ٹیکسی آچکی تھی ہم تینوں اس میں جھٹ سے سوار ہوگئے۔ ہماری کلائی پر گھڑی تھی۔ طاہرہ گھڑی سے بے نیاز تھی۔ وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہم نے ڈرائیور کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، ''بھائی جلدی سے پہنچادو ورنہ ہم تینوں فیل ہوجائیں گے۔''

دورانِ سفر ہم نے شہریار کو وائیوا کی تیاری کرانی شروع کردی۔

پتا نہیں وہ ہماری سن بھی رہا تھا یا نہیں، مگر وہ آدھی کھلی آنکھوں سے ہمیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بچہ بے چارگی سے اپنی ماں کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ممنونیت بھی تھی۔ آج تک ہم اس کی وہ آنکھیں نہیں بھول پائے۔

لڑکے لڑکیاں ہماری اچانک گم شدگی سے پریشان آرٹس فیکلٹی کی سیڑھیوں تک آگئے تھے۔ ہماری ٹیکسی رکی تو شہریار کو لڑکوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہم بغیر کرایہ ادا کیے راہ داری طے کرتے ہوئے مجاہد صاحب کے آفس تک پہنچ گئے۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے لڑکوں کو گھیر لیا، اور انھیں اپنی اپنی جیب سے ملا جلا کر کرائے کی رقم ادا کرنی پڑی۔

ہم نے شہریار کو امتحانی کمرے میں دھکیلا اور مجاہد صاحب سے اونچی آواز میں بولے، ''شہریار بیمار ہے آرام سے سوال کیجیے گا، اور صرف وہی کچھ اس سے پوچھیے گا جس کا جواب اسے آتا ہو ورنہ وہ خوف سے الٹی کردے گا۔'' آخری جملہ محض دھمکی کے انداز میں ادا ہوا۔

شہریار سے کیا سوال ہوا اس نے کیا جواب دیا ہمیں تو نہیں معلوم۔ ہاں ہمارا وائیوا یوں آسان ہوگیا کہ مجاہد صاحب کے ساتھ ساتھ ایکسٹرنل ایگزامنر جناب مختار زمن نے ہماری بہادری پر جو تعریفی کلمات ادا کیے وہ ہمیں اپنے آپ پر فخر کرنے کے لیے کافی تھے۔ ہم سب مع شہریار پاس ہوگئے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ واقعہ کل کی طرح آج بھی تازہ ہے۔

اب میں ایک کالج میں معاشیات کی پروفیسر ہوچکی تھی، اور انجمن طالبات کی نگراں ہونے کے سبب ایک تقریب میں ابراہیم جلیس صاحب کو مجھے مدعو کرنا تھا۔

ہمت کر کے میں آج کی دنیا میں پلٹ آئی اور ریسیور اٹھالیا۔

میں ابراہیم جلیس صاحب سے کیسے مخاطب ہوں گی۔ ان کا جواب کیا ہوگا؟ یہ کش مکش تو تھی ہی۔

''آپ جلیس صاحب بول رہے ہیں؟'' میں نے آواز پہچان کر بھی پوچھنا ضروری سمجھا۔

''جی بول رہا ہوں۔'' جواب آیا۔

میں نے اپنا نام بتایا، کام بتایا، مگر رک رک کر ڈر ڈر کر۔ ''شاید آپ مجھے جانتے ہوں، نہ جانتے ہوں۔''

''جی خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ اور آپ کی سہیلی نے مجھے ایک اچھا باپ بننے کے جتنے بھی درس دیے تھے اور برا باپ ثابت کرنے پر جتنا زور دیا تھا میرا حافظہ اتنا کم زور نہیں کہ بھول پاؤں۔'' ان کے لہجے میں شکایت یا غصہ بالکل بھی نہیں تھا، بلکہ ان کی گفتگو ان کی تحریر کی طرح شگفتہ بھی تھی اور بامعنی بھی۔ مجھے تھوڑی ہمت ہوئی۔

''جلیس صاحب اُس دن کی تلخ کلامی کی معافی چاہتی ہوں، مگر وہ موقع تھا ہی کچھ ایسا۔''

''جی بالکل بڑا سنگین موقع تھا، اور آپ دونوں کے درس نے ایک اچھا باپ بننے میں میری بڑی مدد کی ہے۔ اگر چہ دیر میں ہوش آیا۔ آٹھ عدد بچوں کا باپ بننے کے بعد، مگر آپ لوگوں کو بھی تو چاہیے تھا پہلے ہی بچے کے پیدا ہونے پر مجھے نصیحت کردی ہوتی۔''

وہ اب اپنے انداز میں بول رہے تھے، مگر مجھے تو اس بات کی فکر تھی کہ وہ کالج آئیں گے یا نہیں؟

''تو کیا میں امید کروں کہ آپ مجھے معاف کردیں گے اور میری دعوت قبول کرلیں گے؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے براہِ راست پوچھ لینا ضروری سمجھا۔

''میں آؤں گا، بالکل آؤں گا، آکر بتاؤں گا معاف کیا یا نہیں۔''

فون بند کرنے کے بعد بھی میرے ذہن میں وہ یاد پھر سے تازہ ہوگئی۔ اتنے بڑے ادیب، صحافی، کالم نگار، جسے اردو ادب نے اپنے قلب میں جگہ دی ہوئی ہے۔ جس نے پچیس برس کی عمر میں اپنے شہر، اپنے ملک اور اردو ادب میں وہ شہرت حاصل کرلی تھی جو عمر

گزار کر بھی بعض قلم کار جگہ نہیں بنا پاتے۔

جلیس صاحب زندہ دل انسان ہیں۔ ہر محفل میں سج جاتے ہیں۔ ہر حلقے میں مقبول ہیں۔ چھوٹوں میں چھوٹے، بڑوں میں بڑے۔ نہایت مہذب اور شائستہ، شریف النفس اور وضع دار۔ دوسروں کے کام آنے والے، دکھ درد میں شریک ہوکر دوسروں کا غم بٹانے والے۔ ان کے قلم میں جادو ہے جو کچھ لکھتے وہ تحریر بولنے لگتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلم کو ایسا جان دار اور پُر اثر بنایا تھا کہ ہر کسی کو وہ ایسی صلاحیت اور قوت تو نہیں دیتا۔

میں نے ان کی تمام تحریریں پڑھ رکھی تھیں۔ یونی ورسٹی کے واقعے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ ان کی ساری کتابیں، ان کے خوب صورت زندگی سے بھرپور کالم سب میرے ذہن میں تازہ تھے، مگر وہ سب جو ہم ان کے اپنے گھر میں ان کے اپنے صحن میں کھڑے کھڑے سنا آئے تھے، اس کا ایک ایک حرف غلط تھا۔ وہ ہم سے بڑے تھے۔ بے شک وہ شہریار کے ابا تھے، مگر ہمارے بھی ابا ہی جیسے تھے۔ ہمیں انھیں وہ سب کچھ کہنے کا حق نہیں تھا۔ ہمارا قد اور ہماری عمر ہمیں اسے بھی تو یاد رکھنا چاہیے تھا، مگر نوجوانی کا زمانہ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ تیرنا نہ آتے ہوئے بھی سمندر میں چھلانگ لگا دینے والی عمر ہوتی ہے۔

وہ دن بھی آ گیا جس دن جلیس صاحب کو کالج آنا تھا۔ اپنی زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ سنانے، جس کا اثر بقیہ زندگی بھر رہا ہو۔ یہ پروگرام ہمارے کالج کا ایک مستقل پروگرام تھا۔ جہاں ایک ساتھ مختلف شعبۂ زندگی سے کئی شخصیات آتیں اور طالبات کو ایسے واقعات سناتیں جس نے ان کی زندگی کو بدل ڈالا ہو۔ اثر ڈالا ہو۔ ناقابلِ فراموش بنا دیا ہو۔

جب جلیس صاحب کی باری آئی تب انھوں نے وہی واقعہ سنایا جو ہم سے متعلق تھا۔ اس واقعے میں انھوں نے ہمیں بجائے مجرم ثابت کرنے کے ہماری تعریف کی۔ انھوں نے کہا، ''اس دن میرے دل کو اطمینان اور ذہن کو ٹھنڈک ملی کہ میرے بیٹے کو سچے دوست مل گئے ہیں جو اس سے محبت کرتے ہیں۔ جو سال میں نہ بچا پایا تھا، اُس کے دوستوں نے بچا لیا اور وہ امتحان میں کامیاب ہوگیا۔''

اور جب تقریب ختم ہونے کے بعد وہ واپس جا رہے تھے، میرے پاس آئے، ''تم

نے اُس دن مجھے کچھ بولنے کا موقع نہیں دیا، مگر آج چار پانچ سال بعد خود ہی موقع فراہم کردیا۔ مجھے تم لوگ بہت عزیز ہو۔ وہ جو تمھاری دوست تھی وہ بھی اور شہر یار بھی۔ اللہ کرے تم لوگوں کی دوستی ہمیشہ قائم رہے۔ میں نے ہجرت کے بعد بہت مشکل دن دیکھے ہیں اوروں کی طرح میں بھی بے یارومددگار تھا۔ زندگی میں اچھے دوست مل گئے تھے۔ فاقوں اور بے سروسامانی کے تمام دن بغیر آنسو بہائے گزر گئے کہ ہم سب ایک دوسرے پر مہربان تھے۔ یاد رکھو دوستی سے بڑا کوئی رشتہ انسان اپنے آپ نہیں بنا سکتا۔‘‘

اس دن انھوں نے مجھے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ نصیحت بھی سنائی جو انھوں نے اپنے بیٹے سے کی تھی۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا، ’’دنیا میں ایمان کے بعد اگر دوسری کوئی چیز تمھیں تلاش کرنی ہو تو اچھے دوست ڈھونڈنا کہ اچھے دوست درخت کی مانند ہوتے ہیں جو سایہ بھی دیتا ہے اور پھول بھی فراہم کرتا ہے۔‘‘

مجھے آج بھی ان کی باتیں یاد ہیں۔ اور اس دن میں بہت روئی تھی جب روزنامہ ’’مساوات‘‘ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے وہ مارشل لا دور کے ایک سرپھرے افسر سے ملے تھے اپنے ساتھی ملازمین کی بے روزگاری کے سلسلے میں اور جواب میں اس نے اُن سے کہا تھا ’’مساوات، کی ہجے بھی بھول جاؤ اور جاؤ پھر کبھی ہمارے پاس اس کی اشاعت کے سلسلے میں نہ آنا۔‘‘

وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئے تب دماغ کی شریانیں بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ وہ جناح کے ملک کے جناح اسپتال سے ملکِ عدم کی طرف روانہ ہوگئے۔ ایسے ہی جیسے خالی ہاتھ ہجرت کرکے وہ اپنے ملک میں عزم حوصلہ لے کر آئے تھے۔

قلم نے انھیں اردو ادب کا بادشاہ تو بنادیا، مگر اس ملک میں وہ مساوات ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔ کبھی وہ مارشل لا کی لاٹھی کی زد میں رہی کبھی جمہوریت کے مصنوعی چہرے کے پیچھے چھپی رہی۔ انھوں نے اس کی چاہ میں ’’جیل کے دن جیل کی راتیں‘‘ کاٹیں۔ زرد چہرے لیے زندہ انسان روبوٹ کی طرح جیتے دیکھے، یہ غم ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ رہا۔ وہ خواب جو انھوں نے اور اُن جیسوں نے ہجرت کے وقت دیکھا تھا ان کی زندگی میں تو شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

وہ سرپھرا افسر تخت سے اترتے ہی تاریخ کے جبر سے دوچار ہوگیا۔ لوگ اس کا نام بھی

بھول گئے ہیے تو بعد کی بات ہے، مگر ابراہیم جلیس زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

جلیس صاحب سے میری بہت ساری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔شہر کی تقاریب میں آرٹس کونسل، پریس کلب میں۔وہ خوش دلی سے آگے بڑھتے مسکراتے ہوئے وہ بہت اچھے لگتے تھے۔لوگ کہتے ہیں وہ چھ فٹ کے تھے مجھے تو وہ دس فٹ کے لگتے۔انھیں دیکھنے کے لیے مجھے پیچھے کی طرف جھک کر ان کا چہرہ دیکھنے کو ملتا۔

میں اکثر کہتی بھی، جلیس صاحب کھڑے ہو کر آپ سے باتیں کرنا مشکل ہے، آیئے بیٹھ کر کرتے ہیں۔

مجھے ان کے بہت سے قصے یاد تھے جو وہ دوستوں کی محفل میں گھڑ گھڑ کر سنایا کرتے۔ محفلیں ان کے بغیر بے رونق رہتیں۔

عجب اتفاق تھا میرا پہلا بیٹا جس اسپتال میں پیدا ہوا وہاں شہریار کا بیٹا بھی ایک دن پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ دونوں کا کمرہ ساتھ ساتھ تھا۔شہریار کو کمرے کی جانب جاتے دیکھا تب میں نے یہ جانا۔ اس کے بچے کو دیکھنے گئی جہاں خرم دس پونڈ کا پلا پلایا بچہ مہ جبیں کے پہلو میں ہمک رہا تھا۔ میں نے کہا بھی، مہ جبیں یہ تو دو دن میں بڑا ہو گیا، تمھیں پالنے کی ذرا بھی زحمت اٹھانی نہیں پڑے گی۔ میرا اشعر صرف ساڑھے سات پونڈ کا ہے، میری دشواریوں کا سوچو۔

مہ جبیں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، شکر ہے دو دن میں قد چھ فٹ کا نہیں کر لیا ورنہ میری مشکلات کا اندازہ لگاؤ۔

شہریار اور جلیس صاحب دونوں قد میں برابر ہیں۔جلیس صاحب اسپتال میں موجود تھے۔ان کا تبصرہ تھا، یہ بچہ سیزر سے پیدا ہوا ہے اور جلیس فیملی کا فرد ہے۔اس کا نام جولیس سیزر ہونا چاہیے۔کمرہ تمام لوگوں کے قہقہے سے گونج اٹھا۔

مگر مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ دیں کہ اب مجھے اچھا دادا بننے کا سبق نہ پڑھانے بیٹھ جانا، مگر وہ تو اس بات پر خوش تھے کہ ہماری اور شہریار کی دوستی کتنی دور تک آ گئی ہے، پختہ سے پختہ تر ہو رہی ہے۔

ایسی بہت سی ملاقاتیں اور بھی ہوئیں، مگر پریس کلب کے الیکشن میں وہ لان سے

گزرتے ہوئے بیرونی گیٹ کی جانب جارہے تھے، راستے میں ایک پتلی سی راہ داری ہے جو کلب کی بلڈنگ کے سامنے سے گزرتی ہے جس کے دونوں طرف جھاڑیاں ہیں، بیچ کا راستہ کچھ یوں ہے کہ اگر ایک ساتھ لوگ آتے جاتے ہیں تو ایک کو رک کر دوسرے کو جگہ دینی پڑتی ہے۔ ہم بھی مخالف سمت سے آرہے تھے۔ جلیس صاحب جارہے تھے۔ ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ کچھ باتیں کیں، مگر اس دن جلیس صاحب جلدی میں تھے۔ کہنے لگے، ''پھر ملیں گے۔''

مگر وہ ہماری آخری ملاقات تھی، ہم پھر نہیں ملے۔ اور ملے بھی کب جب وہ سفید لباس پہنے چپ چاپ لیٹے ہوئے تھے اور عہد کر چکے تھے کہ اب وہ ہمیشہ چپ رہیں گے۔

دس فٹ کے جلیس صاب کو آج دیکھنا بہت آسان تھا کہ مجھے گردن پیچھے کی طرف گھمانے کی ضرورت نہیں پڑی، بلکہ میری گردن جھکی ہوئی تھی۔ ان کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ بولتا چہرہ سناٹے کی زد میں آچکا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں میں نہیں چاہتا تھا کہ شہریار اخبار میں نوکری کرے۔ اب اگر وہ یہی کچھ اپنا چکا ہے تو میری آخری نصیحت اور وصیت بھی سن لو۔ اخبار کے خلاف کسی محاذ میں شامل مت ہونا۔ اس سے دماغ کی شریانیں پھٹ جاتی ہیں، دل ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ سانسیں بند ہوجاتی ہیں۔ موت کا تین حرفی لفظ چھ فٹ کے انسان کو پچھاڑ دیتا ہے۔ وہ بے سلے سفید کپڑے پہن کر یوں لیٹ جاتا ہے جیسے کہ میں آج لیٹا ہوا ہوں۔ میرے ہاتھ میں زندگی کی لکیر دیکھ لو ابھی لائن کٹنے والی نہیں تھی۔ بس مساوات کے خلاف اس محاذ کی کمان سنبھال لی تھی جہاں سر پھرے افسروں سے مزدوروں کے روزگار کی بھیک مانگنی پڑی تھی۔ بھیک میں سر پھرے افسر موت دیتے ہیں، رزق یا روزگار نہیں۔ یہ وہ موت نہیں جس کا بلاوا خالقِ حقیقی کی طرف سے آتا ہے، جہاں بندہ سر جھکا کر فرماں برداری کے ساتھ اس کی بنائی ہوئی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے کہ جو انسان دنیا میں آیا ہے اسے بلاوے پر جانا ہی ہے، مگر یہ موت جو بندے دیتے ہیں، اسے قبول کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اب میں تمھیں اپنی مشکل کیوں کر بتاؤں کہ دنیاوی زبان کی تمام ہجے بھول چکا ہوں۔

میری آنکھوں سے ایک بوند آنسو بھی نہیں ٹپکا کہ وہ تو اندر ہی اندر میرے خون ہوتے ہوئے دل کو دھونے کے کام آرہا تھا۔

○

ہمارے بھائی جان... شفیع عقیل

کراچی سے ''امروز'' اخبار بند ہوا تو ہم چند بچوں نے روزنامہ ''جنگ'' کی نونہال لیگ کو اپنے لکھنے کے لیے چنا۔ یوں تو ان دنوں روزنامہ ''انجام''، ''حریت'' اور ''مشرق'' بھی نکلتے تھے۔ ہم ان صفحات میں بھی لکھا کرتے تھے، لیکن روزنامہ ''جنگ'' کی نونہال لیگ کا مقابلہ کسی سے بھی ممکن نہیں تھا۔ ہم نے مستقلاً وہیں لکھنا شروع کردیا اور صفحے کے انچارج شفیع عقیل جو سب بچوں کے بھائی جان تھے، ہمارے بھی بھائی جان بن گئے اور پھر ان کے ساتھ ایسا رشتہ استوار ہوا کہ ان کی زندگی کی آخری سانسوں تک رہا۔ جب وہ اپنی زندگی کی جنگ لڑ رہے تھے ہم آغا خان اسپتال میں ان کے سرھانے کھڑے اپنے اللہ سے دعا مانگ رہے تھے کہ وہ ہمارے بھائی جان کو کچھ اور زندگی سے نواز دے۔ واپسی پر ہماری آنکھیں برس رہی تھیں اور اپنے بچپن سے لے کر اپنے بچوں کے بچپن تک کے تمام دن ذہن میں گردش کررہے تھے۔

روزنامہ ''جنگ'' کی برنس روڈ والی پرانی بلڈنگ سے لے کر نئی بلڈنگ تک کے اس کمرے سے میری بہت ساری یادیں جڑی تھیں۔ جہاں ہمارے بھائی جان ہمارے وقت بے وقت چلے آنے پر خوش دلی سے خوش آمدید کہتے۔ ہمارے ہاتھ میں مضمون ہوتا ہم ان کی میز پر رکھ دیتے وہ بس ایک سرسری نظر ڈالتے اور زور دے کر کہتے ''یار تو 'ز' اور '؛' کی بہت

غلطیاں کرتی ہے۔''

گھنٹی بجاتے کاتب کے ہاتھ میں فوری ہمارا مضمون پکڑا دیتے۔ یوں ہمیں خوشی ہوتی کہ ہمارا کوئی مضمون نا قابلِ اشاعت نہیں ٹھہرتا۔

ایک بار میر خلیل الرحمٰن صاحب کو ایک خط موصول ہوا جس میں میری تحریر کی شکایت تھی۔ بھائی جان نے وہ خط میرے سامنے رکھ دیا۔

نوشابہ کے مضامین میں ہمارے گھر کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ انھیں کس نے حق دیا ہے کہ گھر کی باتیں کہانی بنا کر اخبار میں چھپوائیں۔ ان کے مضامین شائع نہ کیا کریں۔ جن صاحب نے یہ خط لکھا تھا میں ان سے واقف ہی نہیں تھی۔ مضامین شاید ان کے گھر کے حالات سے ملتے جلتے ہوں گے۔ اس دن میں اور بھائی جان مل کر خوب ہنسے۔ خط ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور میرے مضامین چھپتے رہے۔ بعد میں افسوس بھی ہوا کہ مجھے وہ خط لے لینا چاہیے تھا اور ان صاحب سے باز پرس کرنی چاہیے تھی، مگر عمر بھی کیا تھی۔ یہ باتیں تو بڑے ہو کر سمجھ میں آئیں۔

میر صاحب البتہ جب بھی دفتر میں ملتے شفیع عقیل سے پوچھتے، یہ وہی لڑکی ہے نا جو دوسروں کے گھروں میں جھانکتی پھرتی ہے۔

بھائی جان کی سجائی نونہال لیگ میں آج کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر اپنے بچپن کے دنوں میں لکھا کرتے تھے۔ اور ان ہی دنوں وہ ہمارے دوست بن چکے تھے۔ آج بھی ہم سب ملتے ہیں اور بھائی جان کو دل سے یاد کرتے ہیں۔

بھائی جان کا گھر، میرے گھر سے پیدل کے راستے میں تھا۔ جب میں اردو میں ایم اے کرنے لگی تب انھوں نے اپنی بہن سے ملا دیا۔ باجی نے بھائی جان کی تمام کتابوں سے استفادے کا حق مجھے سونپ دیا، جب کہ بھائی جان اپنی کتابوں کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتے تھے۔

باجی سے میری دوستی ہوگئی۔ بھائی جان مجھے گھر میں کبھی نہیں ملے۔ وہ جانے کب دفتر جاتے اور رات کے کس پہر لوٹتے۔ ان کی ساری زندگی باہر کی دنیا پر ہی قائم تھی۔ بہن اور بہن کے بچوں کی پرورش ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

ہم بہت سے بچے اکثر مل کر اُن کے دفتر جاتے اور ان سے طرح طرح کے سوال کرتے:
''بھائی جان آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''
''تجھ سے مطلب۔'' وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے۔
ایک دن کہنے لگے، ''لڑکی تو مجھے میٹرک کرادے۔''
''اچھا میں بورڈ سے فارم لادوں گی آپ پُر کردیجیے گا۔''
''مگر دیکھ میں انگریزی اور حساب نہیں پڑھوں گا۔''
''بھائی جان یہ دونوں مضامین تو لازمی ہیں۔ اس کے بغیر کیسے ممکن ہے۔''
''اچھا تو پھر رہنے دے، میں ادیب، فاضل، منشی فاضل ہی کافی ہوں۔''
پھر وہ سنجیدگی سے اپنے بچپن کے واقعات سناتے۔ اپنے نہ پڑھنے کا سبب بتاتے:

آسمان پر تنہا سورج
اپنی آگ میں جلتا
میں بھی ہوں دھرتی پر تنہا
دوسروں کے دکھ سہتا

ان کی گفتگو میں ایک خاص کشش ہوتی۔ چپ چاپ سنا کرتے۔ محظوظ بھی ہوتے اور اپنا قد بڑا محسوس کرتے۔

ہم نے اکثر بہت سارے قسم قسم کے لوگ بھی ان کے پاس آتے دیکھے۔
ہمارے گھر پر کرائے داروں نے قبضہ کر رکھا ہے، چھڑادیں۔
کوئی اچھا سا کرائے دار بتادیں۔
کہیں نوکری لگوادیں۔
مالک مکان جھگڑا کرتا ہے۔ ہمارے گھر کوئی بڑا نہیں ہے، ہم کیا کریں؟
ہمیں فلاں کتاب چاہیے مل نہیں رہی، آپ دے سکتے ہیں؟

گھر سے متعلق جھگڑے ہم نے وہاں بیٹھے بیٹھے بہت دیکھے۔ وہ ہر ایک کی بات سنتے۔ کسی کا نام بتاتے۔ چٹ پر فون نمبر لکھ کر دیتے۔ اس سے مل کر معاملہ طے کرلو۔ لوگ

خوش خوش چلے جاتے۔ کئی لوگ شکریہ ادا کرنے آجاتے۔

''آپ نے کام کرادیا، بہت بہت شکریہ۔''

وہ لاتعلقی سے کہتے، ''اچھا بھئی جا خوش رہ۔ یہاں کیا لینے آیا ہے اب۔'' وہ احسان کر کے بھول جانے والوں میں سے تھے۔ ہمیں ان کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے۔

بھائی جان کسی تقریب میں شرکت نہیں کرتے۔ ان کی میز پر ڈھیر سارے دعوت نامے رکھے ہوتے۔ لوگ ذاتی طور پر بلانے آجاتے۔

''ارے بھئی جا۔ کہہ دیا نا میں نہیں آسکتا۔''

میں کہتی، ''آپ کیوں نہیں جاتے ہیں؟''

''وہاں ڈھیر سارے فوٹوگرافر ہوتے ہیں۔ میں تصویر نہیں کھنچواتا۔''

''آپ تصویر کیوں نہیں کھنچواتے؟'' میں سوال کرنے سے باز نہیں آتی۔

''ایک تو تُو سوال بہت کرتی ہے۔ میری مرضی، تجھے کیوں بتاؤں؟''

وہ اسی خاص لہجے میں باتیں کرتے، مگر ہم میں سے کسی کو ان کے جواب سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی، بلکہ ان کے لہجے کی شیرینی ہمیں ان سے اور قریب کردیتی۔ وہ ہمیشہ ہی ہم سے قریب رہے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد انھوں نے ''غازی یا شہید'' لکھی۔ جب بھی ان کی کوئی نئی کتاب آتی خوشی خوشی مجھے دکھاتے۔ میں اپنا قد اونچا محسوس کرتی۔

''آپ اتنا اچھا کیسے لکھ لیتے ہیں؟'' اکثر میرا یہ سوال ہوتا۔

''جو پڑھتے ہیں بس وہی لکھ بھی سکتے ہیں۔ مطالعہ بہت ضروری ہے۔''

''آپ کو پینٹنگ سے بھی لگاؤ ہے۔ کیا آپ خود بھی تصویر بناتے ہیں؟''

''نہیں میں بڑے بڑے مصوروں کے درمیان رہا ہوں۔ سب میرے دوست ہیں۔ ہم ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ وہ میری تحریر پڑھتے ہیں میں ان کی لکیروں اور رنگوں کو پڑھتا ہوں، اور پھر میں اس میں چھپی ہوئی کہانی لکھ دیتا ہوں۔ مصور دوست حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ خوش بھی ہوتے ہیں کہ ان کی تصاویر کو الفاظ مل گئے ہیں۔ تجھے تصویریں دیکھنی ہیں تو

میرے گھر چلی جا۔" ان کی طرف سے گھر جانے کی اجازت مجھے ہر وقت حاصل تھی۔

گلشن والے گھر میں روبینہ نے مجھے کونا کونا دکھایا۔ اب باجی دنیا سے جا چکی تھیں۔ ہر طرف تصویریں آویزاں تھیں۔ یہاں کتابوں کو الماریاں مل گئی تھیں۔ میں نے مبارک باد دی۔ ناظم آباد والے گھر میں کتابیں ڈبوں میں بند تھیں۔ ان کی بیڈ کے نیچے رکھے ڈبوں میں بھی کتابیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ مطلوبہ کتابیں ڈھونڈنے میں مجھے خاصا وقت لگتا، لیکن جب وہی کتابیں الماریوں میں سج گئیں تب میں نے ان کے ہی ساتھ گھوم پھر کر قرینے سے رکھی کتابیں دیکھیں۔

"آپ لائبریرین رکھ لیں تاکہ وہ انھیں ترتیب دے دے۔ آپ کو بھی نکالنے میں آسانی ہو جائے گی۔" میں نے جیسے انھیں مشورہ دیا۔ میں بڑی ہو گئی تھی اس لیے ان کا رویہ اب ویسا نہیں تھا۔

جواب دیا، "ایک آدمی بلایا تھا، مگر چند دنوں بعد ہی محسوس ہوا کہ جیسے کتابیں کم ہو رہی ہیں۔ ہاں وہ کتابیں چوری کر کے لے جاتا رہا۔ اسے جلدی فارغ کر دیا۔"

"اس پر کڑی نظر رکھنی چاہیے تھی۔" میں نے مشورہ دیا۔

"اچھا چل چپ ہو جا۔ جیسے مجھے اور کوئی کام تو تھا ہی نہیں۔ بڑی آئی مشورہ دینے والی۔"

میں پھر سے نونہال لیگ میں لوٹ گئی۔ ڈانٹ کھا کر چپ ہو گئی۔ بڑے ہو جانے پر میرے مضامین طلبہ کے صفحے پر آنے لگے۔ پھر خواتین اور ایڈیٹوریئل کے صفحات پر چھپنے لگے۔ یہ سب ان ہی کی مہربانی تھی۔

"اخبارِ جہاں" کی ادارتی ٹیم میں جب داخل ہوئی تب ان کی موجودگی سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور اپنے آپ کو دفتر میں محفوظ محسوس کیا۔ ہر مشکل میں اپنے کمرے سے نکل کر ان کے کمرے میں چلی جاتی۔ پھر سے نونہال بن جاتی۔

"میں آپ کی میز ٹھیک کر دوں۔" بکھرے کاغذات دیکھ کر میں کہتی۔

"خبردار جو تو نے ہاتھ لگایا ہوگا۔ جہاں جو کاغذ ہے وہیں رہنے دے۔"

"میں ترتیب سے رکھ دوں؟"

''مجھے نہیں چاہیے تیری ترتیب۔'' ڈانٹ دیتے۔

ایک دن کہنے لگے، ''یہ میر ہے نا.....'' میں نے پوچھا، ''میر تو کئی ایک ہیں۔ کون سے والے میر حبیب الرحمٰن یا میر خلیل الرحمٰن؟''

''دیکھ جب میں میر کہوں تو سمجھ لے کہ میں میر خلیل الرحمٰن کہہ رہا ہوں۔''

ان دنوں سیّد محمد تقی جنگ کے ایڈیٹر تھے ہم دونوں میر اور انھیں ملا کر میر تقی میر کہتے تھے۔

''جی تو میر صاحب نے کیا کہا؟'' میں سننے کی مشتاق تھی۔

''اُس نے یہ نئی بلڈنگ بنائی ہے تو کونا کونا سونگھتا پھرتا ہے۔ کہیں گندگی تو نہیں ہے۔ ہر ایک کے کمرے میں وقت بے وقت جاتا ہے۔ پردہ ٹھیک کرتا ہے۔ کرسی قاعدے سے رکھواتا ہے۔ میز کی ترتیب بدلوا دیتا ہے۔ گرے پڑے کاغذ اٹھاتا ہے۔ شیشے پر انگلیاں پھیر کر گرد دیکھتا ہے۔'' میں ہنس پڑی۔

''مجھے معلوم ہے تو کیوں ہنس رہی ہے۔ ہاں وہ میرے کمرے میں آیا۔ پردے کا ہُک نکل گیا تھا۔ پردہ آدھا سیدھا آدھا ٹیڑھا تھا۔ کتابیں شیلف میں بس ایسے ہی رکھی تھیں جیسی تو ابھی دیکھ رہی ہے۔ زمین پر اخبار کے بنڈل بکھرے تھے۔ تھوڑی دیر کھڑے رہے۔ مجھے لگا سانس روک رہے ہیں اور ان کا دل سینہ چیر کر باہر نکلنے پر آمادہ ہے۔ میری طرف بے چارگی سے دیکھا۔ بولے کچھ نہیں۔ مروت اور لحاظ آڑے آرہا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

'میر صاحب مجھے پرانی والی بلڈنگ کے پرانے کمرے میں بھیج دیں۔ میں وہاں کے ہی قابل ہوں۔ یہاں رہا تو کمرہ ایسا ہی رہے گا۔ میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتا۔'

وہ چپ چاپ میرے کمرے سے چلے گئے۔ روز دوسروں کے کمروں میں جاتے ٹھیک کراتے، مگر پھر میرے کمرے میں نہیں آئے۔

ایک دن ملے۔ میں نے کہا، 'چند مہینے بعد آپ پھر میرے کمرے میں آئیں گے جب دیگر کمروں کا حال بھی میرے کمرے جیسا ہوجائے گا۔' اور پھر ایسا ہی ہوا سب کے پردوں کے ہُک نکل رہے تھے۔ بکھرے کاغذ، بے ترتیب میز اور شیشے پر گرد کی تہ۔ نئی بلڈنگ پرانی والی جیسی ہونا شروع ہوچکی تھی۔ میر کو اس کا دکھ تھا، مگر ہم سب ہنسی خوشی اسی بے ترتیبی

میں وقت گزارنے لگے۔"

ہمیں جب بھی کسی تصویر کی ضرورت ہوتی، کسی کتاب کی تلاش ہوتی، کچھ جاننا چاہتے، ادیبوں شاعروں سے تعارف حاصل کرنا ہوتا، ہمارے لیے تمام معلومات کا منبع شفیع عقیل ہوتے۔

کالج کی تقریب میں بلایا۔ اب وہ تصویر کھنچوانے لگے تھے، آ گئے۔

میں نے شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے، "تیرا حق بنتا ہے۔"

ان کے دوست آجاتے تب وہ پنجابی میں گفتگو کرنے لگتے۔ مجھے ان کے منہ سے پنجابی بہت اچھی لگتی، مگر میں انھیں چڑانے کے لیے کہتی، یہ کیا آپ پنجابی بولنا شروع ہوجاتے ہیں۔ کہتے، تیری سمجھ میں نہیں آتی ہے نا اسی لیے کہتی ہے، مگر مجھے پنجابی سمجھ میں آتی تھی اور انھوں نے پنجاب کے اہم لکھاریوں کو متعارف کروانے کے لیے روزنامہ "جنگ" سے ہی "پنجاب رنگ" کے عنوان کے تحت مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اسے بہت پذیرائی ملی تھی۔ بحیثیت مجموعی میں نے سب پڑھ رکھا تھا۔ انھوں نے پنجابی ادب سے متعلق تقریباً گیارہ کتابیں مرتب اور تصنیف کی تھیں۔ جن میں "پنجاب کے پانچ قدیم شاعر"، "پنجابی لوک داستانیں"، "پنجابی لوک کہانیاں"، "سیف الملوک"، "سسی پنوں"، "ہاشم شاہ"، "سلطان باہو: حیات و فن"، "سوچاں دی زنجیر"، "زہر پیالہ"، "میری پنجابی شاعری" بہت اہم ہیں۔ انھوں نے کتابوں کے تعارف اور تبصرے بھی تحریر کیے۔ یہ تبصرے اور تعارف عام نوعیت کے نہیں ہوتے۔ وہ ایسے چبھتے ہوئے جملے استعمال کرتے تھے جن میں ان کا ذوقِ کتاب بینی اور تنقیدی مہارت جھلک رہی ہوتی تھی۔ وہ ملکوں ملکوں گھومے اور پھر سفرنامے بھی تحریر کیے۔ پیرس تو پیرس ہے اور چھ ممالک کا سفرنامہ۔ اسی سلسلے کی دو کتابیں ہیں۔ وہ بھرتی کے الفاظ، غیر ضروری معلومات اور خود نمائی سے خود کو ہمیشہ دور رکھتے۔ جب وہ تین کتابیں تصنیف کرلیتے پھر ایک ساتھ ان تینوں کتابوں کی تقریبِ تعارف منعقد ہوتی۔ وہ بھی دوستوں کے بے حد اصرار پر ورنہ وہ تو صرف کام کرنے والے شخص تھے۔

کبھی کبھی میں ان کے پنجابی کلام اور پنجابی شاعروں کے نام لے کر چڑھائی کرتی،

بھلا بلھے شاہ کوئی نام ہوا۔ انھوں نے اپنا کوئی اچھا سا نام رکھ لیا ہوتا۔

''اللہ کرے تیری شادی کسی پنجابی سے ہوجائے۔'' ایک دن انھوں نے جیسے بددعا دے دی، مگر ان کی یہ دعا یا بددعا خالی نہیں گئی، میری شادی پنجابی سے ہی ہوگئی۔ ملانے لے گئی۔ بہت زور زور سے ہنسے اور زندگی بھر کی کسر میری شکایت کر کے نکال لی۔

آخری بار جب مین ان کے گھر ملنے گئی تب بہت سی باتیں ہوئیں۔ پرانے لکھنے والوں کی خیریت پوچھی۔ اپنی باتیں کرتے رہے۔ بیماری کے سلسلے میں بھی گفتگو ہوئی۔ مایوسی لہجے سے نمایاں تھی، مگر آخیر میں اپنا پرانا لہجہ لے آئے، ''خیر ہو یار۔ اللہ مالک ہے۔''

اپنی کتابیں دکھائیں۔ مشکل سے چل رہے تھے، مگر ایک ایک الماری پر رک کر اس میں رکھی ہوئی کتابوں کی تفصیل بتاتے۔ پھر اپنی مخصوص جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ ان کے اپنے کمرے میں رکھی کتابیں، تصویریں، سرٹیفکیٹ، ایوارڈ، مجسمے سب پر نظر ڈالی، کتنی قیمتی ہیں یہ چیزیں۔ عمر بھر کی کمائی۔ عمر بھر کا شوق، مگر چیزوں کی عمر زیادہ اور جمع کرنے والے کی عمر مختصر ہوتی ہے۔ میرے ذہن میں ان کے بغیر یہ کمرہ گھوم گیا۔ انھوں نے اپنی ساری عمر ایک ہی مقصد کے تحت گزاری۔ درجنوں کتابیں تحریر کیں۔ ترجمے کیے۔ کتنی ہی کتابیں مرتب کیں، کتنے مصوروں پر مضامین لکھ کر اُن کے شاہ کاروں کو زندہ کیا۔ باغبانی کا بہت شوق تھا۔ بہت سے پودے خود لگائے۔ ان کی دیکھ بھال کرتے۔ بہت سے لوگوں کے کام آئے، مگر اپنی ذات کے لیے کیا کیا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ایسا کوئی رشتہ نہیں پیدا کیا جو ان کا ہوتا صرف ان کا ہوتا۔ ذات کی تنہائی ان کی شاعری میں جا بہ جا موجود ہے، مگر زبان سے کبھی اس محرومی کا ذکر نہیں کیا۔ خوش رہے اور دوسروں کو خوشیاں بانٹتے رہے۔ دوستوں کی محفلوں کے شوقین تھے اور ان کے دن مقرر تھے۔ ایک دن تو اپنی ان مصروفیات کا ذکر مجھ سے تفصیل کے ساتھ کیا۔

بس اس آخری ملاقات کو آج بھی یاد کرتی ہوں۔ میں ان سے ملنے گئی تھی، بیماری کے بعد ذرا طبیعت سنبھلی تھی۔ چپ چپ سے تھے، میں سوچ رہی تھی، انھوں نے پورے خلوص کے ساتھ ادب کی خدمت کی۔ ہمیشہ اپنے لیے بے غرض رہے، نہ اپنی کوئی سفارش کرائی نہ کوئی مراعات حاصل کیں۔ بس اپنی ان ذمے داریوں کو پورا کیا جو ان کی تھی بھی

نہیں۔ اب وہ دل کے عارضے میں مبتلا تھے۔ ٹانگیں چلنے سے انکاری تھیں، اور بھی کئی ایک تکالیف انھیں وارننگ دے رہی تھیں۔ اگر وہ نہیں رہے، میرے ذہن میں یہ ایک تکلیف دہ سوچ دھیرے دھیرے پریشان کرنے لگی۔ اگر وہ نہیں رہے، ایسے ہی جیسے بہت سے دوسرے لوگ نہیں رہے ہیں، مگر مجھے دوسروں سے نہیں ان سے مطلب تھا۔ یہ ڈھیر ساری کتابیں، تحریریں، تصویریں، ایوارڈ، پیڑ پودے، پھول پھل سب یہیں رہ جائیں گے اور وہ اپنی زندگی سے جڑی تمام چیزیں چھوڑ کر اس دنیا سے چلے جائیں گے۔ ساتھ کیا لے جائیں گے۔ بس اپنا وہ رویہ جو انھوں نے یہاں اپنے اردگرد کے لوگوں سے رکھا۔ وہ عبادات جو انھوں نے اپنے رب کے حضور کیں، وہ سجدۂ شکر جو نعمتوں کے عوض انھوں نے ادا کیے، نہ جانے اس بار ان کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہی تھی، کیوں مجھے یہ شک ہو رہا تھا کہ شاید یہ آخری ملاقات ہے۔ میں دس سال کی بچی تھی جب ان کے پاس اپنا پہلا مضمون لے کر آئی تھی جس میں ''ذ'' اور ''ز'' کی بے شمار غلطیاں تھیں۔ اب نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد میں اپنی تحریر کردہ کتابیں ان کے حضور پیش کر رہی تھی۔ اتنے بہت سارے سال گزر گئے میں نے ان کے لہجے میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی تھی۔ وہی تُو کی تکرار ہوتی، وہی بچوں کے ساتھ پیش آنے والا روّیہ ہوتا، اور یہ رویہ مجھے کتنی طاقت بخشتا تھا۔ مجھے کتنا اچھا لگتا تھا کہ اپنے عہد کا اتنا بڑا ادیب، شاعر اور بہترین انسان مجھ سے کتنا قریب ہے۔ میں اپنی ساری ادبی مشکلات اور ضروریات ان کے سامنے رکھ دیتی۔ ساری معلومات مل جاتی ہیں۔ مطلوبہ کتابیں ہاتھ آجاتی ہیں۔ ان کی رفاقت بھی چند گھنٹوں کی حاصل ہے۔ خوشی خوشی وہ میری آمد پر یوں استقبال کرتے ہیں کہ جیسے اس وقت وہ میرا ہی انتظار کر رہے ہوں۔ ہاں یہ آخری ملاقات تھی۔ شاید وہ بھی اسے آخری ہی ملاقات سمجھ رہے تھے جب ہی تو وہ ایک تصویر تلاش کر رہے تھے جو میری تھی، انھیں نہیں مل رہی تھی۔ کہنے لگے، ''تو دو چوٹیاں باندھے اس تصویر میں کھڑی ہے۔ جانے میرے پاس کہاں سے آگئی تھی، رکھی تھی حفاظت کے ساتھ کہ تجھے دوں گا، مگر جانے کن کتابوں میں دب گئی ہے۔'' ہاں وہ تصویر کتابوں ہی

میں دبی رہی۔ میں ان سے رخصت کی اجازت لے کر جانے لگی تب انھوں نے روک کر اپنے باغیچے کے تین عدد بڑے بڑے لیموں توڑ کر دیے۔ وہ لیموں ان کا دیا ہوا آخری تحفہ تھا۔ اسی دن تو انھوں نے کہا تھا، ''تجھے میری کتابوں کی بڑی فکر ہے، میں نے وصیت کردی ہے، تجھے بھی بتا دیتا ہوں گواہ رہنا۔'' قریب تھا کہ میرے آنسو ٹپک پڑتے اور ان کی ڈانٹ پڑتی میں جلدی سے گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ ہاں ان کے گھر میری ان سے یہ آخری ملاقات تھی۔ جس کا آغاز برنس روڈ کی پرانی بلڈنگ میں واقع جنگ اخبار کے دفتر سے ہوا تھا۔ درمیان میں آدھی سے زیادہ صدی بہت ساری ملاقاتوں سے بھری پڑی تھی، اور پھر یہ ایک آخری ملاقات۔

پھر میری ایک خاموش ملاقات آغا خان اسپتال میں ہوئی۔ کیا خاموشی گفتگو سے زیادہ سنگین نہیں ہوتی ہے۔ میں دبے قدموں لوٹ آئی۔ لیموں فریج میں پڑا رہا، جانے کیوں میں اسے استعمال نہیں کر پائی۔ وہ سوکھ کر چھوٹا سا ہوگیا، اور جب بھائی جان سفید کپڑے پہن کر اپنے گھر سے چار کاندھوں پر سوار ہوئے تب میں نے ایک ہاتھ کے اشارے اور دونوں آنکھوں سے برستی ہوئی برسات کے ساتھ انھیں خدا حافظ کہا۔ میرے منہ میں غیر استعمال شدہ لیموں کی تلخی تھی۔

○

لکھ رہی ہیں انگلیاں... جوش ملیح آبادی

گزری زندگی کی بعض یادیں ایسی ہوتی ہیں جن پر کبھی گرد نہیں پڑتی، وہ اُسی آب وتاب کے ساتھ ذہن کے پردے پر روشن تحریر بن کر قائم رہتی ہیں کہ جسے جب چاہیں پڑھ لیں۔ ایسی ہی یادوں میں ایک یاد جوش صاحب سے متعلق ہے۔ جوش صاحب ان دنوں ہمارے ہی شہر کراچی میں رہا کرتے تھے، اور ہم ہر ہفتے نبی باغ کالج میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل کر لیتے۔ کالج کے پرنسپل خواجہ آشکار حسین تھے جن کی شخصیت کی دھوم کراچی میں تھی۔ ہفتہ وار نشست جوش صاحب کے ساتھ ہوتی جہاں صاحبانِ علم اور تشنگانِ ادب جمع ہوتے۔ اپنی بات بھی کرتے اور جوش صاحب کی بھی سنتے۔ ان ہی دنوں جوش صاحب ''یادوں کی برات'' ترتیب دے رہے تھے اور اکثر اس کے اسباق ہمیں پڑھ کر بھی سناتے۔ یوں ہم ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے ''یادوں کی برات'' چھپنے سے پہلے پڑھ لی تھی، مگر پھر جوش صاحب کراچی چھوڑ کر شہرِ اقتدار میں بسنے چلے گئے، جب کہ اہلِ اقتدار سے ان کی دوستی بھی نہیں تھی۔

ہم علامہ اقبال کالج میں پڑھاتے تھے اور ۱۹۷۹ء وہ سال تھا جب ہمیں وہاں پڑھاتے ہوئے تیرہ سال ہو چکے تھے اور ہم سالانہ تیرہ مشاعرے ترتیب دے چکے تھے جس کی شہرت شہرِ کراچی میں کچھ یوں تھی کہ اگر کسی ایک سال ہم کسی شاعر کو مشاعرے میں مدعو نہیں کرتے، وہ صاحب پورے سال ہم سے خفا رہتے۔ اور اس وقت تک رہتے جب تک

ہم انھیں آئندہ مدعو نہ کرلیتے۔ اس جملے سے ہمارے مشاعرے کی اہمیت اور شہرت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اگر کچھ اور ثبوت بھی مطلوب ہو تو شبنم رومانی کا یہ جملہ جو اُن کے ''مشرق'' میں چھپنے والے اخباری کالم میں شامل تھا، کافی ہے۔

وہ لکھتے ہیں، ''اگر کسی شاعر کو اپنا کلام سنا کر خوش ہونا ہو، حقیقی داد پانی ہو، اور وزیروں جیسا استقبال کرانا ہو اور تحائف سے لدلدا کر آنا ہو تو علامہ اقبال کالج کے مشاعرے میں شرکت کی تمنا رکھے۔''

اُن دنوں کراچی ایسے باکمال شاعروں سے پُر تھا کہ آج ان کا نام بھی لیں تو سرور پیدا ہوجاتا ہے۔ حمایت علی شاعر، سرور بارہ بنکوی، صہبا لکھنوی، صہبا اختر، اطہر نفیس، رئیس امروہوی، جون ایلیا، سرشار صدیقی، ضیا جالندھری، سیّد محمد جعفری، رضی اختر شوق، آرزو لکھنوی، محسن بھوپالی، راغب مرادآبادی، زیڈ اے بخاری، مجنوں گورکھپوری، شبنم رومانی اور بھی بہت سے۔ یہ شعرا میرے ایک ٹیلی فون پر بیچ دوپہر ایک بجے ازخود کالج پہنچ جایا کرتے۔

عجیب اتفاق یہ ہوتا کہ جب بھی مشاعرے کے دن آتے، جوش صاحب شہر سے یا ملک سے دُور ہوتے اور کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہو پاتے۔

۱۸ر جون ۱۹۷۹ء کا دن کراچی پریس کلب کی تاریخ میں ایک سنہرا دن ہے جب جوش صاحب شہرِ اقتدار سے اپنے پرانے شہر کراچی میں پریس کلب کی تاحیات رکنیت کا تاج پہننے کے لیے تشریف لائے۔ دو دن بعد ہمارے کالج کے مشاعرے کو منعقد ہونا تھا۔ جی چاہا کسی طرح جوش صاحب مل جائیں اور ہمارے مشاعرے میں شریک ہوسکیں۔ یہ مشاعرہ ہندوستان سے آئے ہوئے شاعر شاذ تمکنت کی صدارت میں ہونے جارہا تھا۔

جوش صاحب عون محمد رضوی کے ساتھ آئے تھے۔ عون جن دنوں کراچی ٹیلی وژن میں ملازم ہوا کرتے تھے، ہمارے دوست تھے۔ ہمارے کالج میں ہونے والے ایک ڈرامے سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ وہ اسے پی ٹی وی پر پیش کرنا چاہتے تھے۔ یوں ہماری بہت سی ملاقاتیں ہوئیں، اور پھر پکی دوستی ہوگئی، مگر جب ہم پکے دوست بن گئے تب وہ کراچی سے تبادلہ کرا کے اسلام آباد چلے گئے۔

پریس کلب کی تقریب کے اختتام پر میں بھیڑ چیرتی ہوئی کسی طرح عون کے پاس اسٹیج تک پہنچ گئی۔ مل کر وہ بھی خوش ہوئے اور میں بھی، لیکن اس ملاقات میں میری ایک غرض بھی شامل تھی۔ جوش صاحب کا قیام کہاں تھا، یہ صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا۔ حالات ان دنوں کچھ ایسے ہی تھے۔ دوستی کام آئی۔ عون نے کان میں مجھے راز کی بات بتا دی اور صبح سات بجے ہوٹل جبیس آنے کا کہا۔

میں اُن دنوں صدر کے اسٹیٹ بینک فلیٹس میں رہا کرتی تھی جو ریگل سینما کے برابر واقع تھے۔ رات بارہ بجے والا شو کھڑکیاں کھل جانے کے سبب ہمارے گھر کی بند کھڑکیوں کے باوجود پنجابی فلموں کے مکالموں اور گانوں کو زبردستی ہمارے کانوں میں ٹھونسا کرتا۔ وہ دن بھی یادوں میں آج تک زندہ ہیں۔ پیدل کا راستہ تھا۔ ٹھیک سات بجے ہوٹل پہنچ گئے۔ جوش صاحب ناشتے میں مصروف تھے اور شاید گھنٹا بھر پہلے سے ناشتا شروع کر چکے تھے۔ لسی کے چار پانچ خالی اور دو بھرے گلاس میز پر موجود تھے۔ بازاری لسی کے گلاسوں کی لمبائی چوڑائی سے یقیناً سب ہی واقف ہیں۔ ٹرے میں مرغی کی ڈھیروں ہڈیاں چبائے جانے کے بعد بے ترتیب پڑی تھیں۔ کبھی کبھی جوش صاحب ہاتھ کھینچ لیتے۔ تب عون کہتے، ''جوش صاحب لیجیے نا۔'' تب جوش صاحب تکلف سے بھرپور جملہ ادا کرتے، ''اب طبیعت مائل نہیں ہے۔'' اور پھر مائل ہو جاتے۔

ہم نے سلام کیا۔ تھوڑا بہت پہچان گئے، مگر زیادہ حیرت کا اظہار کیا۔

''کیسے آنا ہوا؟''

میں نے مدعا بیان کیا۔ ایک گلاس میری طرف سرکایا اور دوسرا اپنی طرف اور تیسرے چوتھے گلاس کا آرڈر دینے کی فرمائش کی۔

''سرکاری ملازم ہو؟'' مرغی کی روسٹ ہڈی کو منہ میں ڈالنے سے قبل سوال کیا۔

''جی۔'' میں نے سر کو یوں ہلایا کہ جیسے وہ یہ نہ جان پائیں کہ ''ہوں'' یا ''نہیں ہوں'' یہ احتیاط اس لیے تھی کہ میں اس سوال کا پس منظر جانتی تھی۔

سر تو میں نے کیسے بھی ہلایا ہو، جوش صاحب بات صحیح طور پر سمجھ چکے تھے۔

''نوکری کے پیچھے پڑی ہو۔ ابھی تو کئی دہائیاں پڑی ہوں گی تمھاری ملازمت کی۔''

میں نے جملے کے پہلے حصے کو نظر انداز کر کے دوسرے حصے کا جواب دیا۔

''جی ہاں۔''

''پھر — پھر بھی مجھے بلانا چاہتی ہو۔ لوسّی پیو۔'' گلاس انھوں نے میری طرف سرکا دیا جو پہلے بھی سرکایا جا چکا تھا اور اس لبالب بھرے ہوئے گلاس کے چھلکنے کا خدشہ پیدا ہو چکا تھا۔

سوال جواب کے اس مختصر سے عرصے میں ان کا چوتھا گلاس خالی ہو چکا تھا۔ عون نے مرغی کی چند اور ٹانگیں ان کی طرف سرکائیں۔ اُس لمحے مجھے کرنل شفیق الرحمٰن یاد آ گئے۔ ان کے ایک کردار نے مہمان کی طرف ڈش سرکاتے ہوئے کہا تھا، ''لیجیے مرغ کی لات کھائیے۔''

جوش صاحب نے حسبِ معمول پھر وہی جملہ دُہرایا، ''میاں طبیعت مائل نہیں ہے۔''

مگر جلد ہی دو تین ٹانگوں پر پنجہ آزمائی شروع کر دی۔ اس عرصے میں دو اور گلاس آ چکے تھے۔ ایک عون کے لیے اور دوسرا میرے ساتھ آئے ہوئے نثار کے لیے۔

عون نے دھیرے سے جملہ دُہرایا، ''جوش صاحب، یہ گلاس نہیں مکمل جگ ہے۔''

''چلو اور آ جائے گا ابھی تو یہ پیو۔'' گلاس سرک کر پھر نثار تک پہنچ گیا۔

جانے جوش صاحب نے ''جگ'' سے کیا مطلب لیا۔

مجھے نہ مرغی کی روسٹ ٹانگوں سے غرض تھی اور نہ ہی لسّی سے، میرے ذہن میں تو صرف جوش صاحب کی آمادگی کی خواہش تھی۔

ٹرے چبائی جانے والی ہڈیوں سے نہ صرف بھر چکی تھی، بلکہ گرتی پڑتی میز تک آ چکی تھیں۔ خالی گلاسوں کی تعداد اب گننے سے بھی خوف آ رہا تھا۔ جوش صاحب نے پاس پڑی تولیہ سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا، ''اچھا چلو میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں۔ اگر تم نے اس کا صحیح جواب دے دیا تب سوچوں گا۔'' میں ان کے سوال سے ڈر گئی۔ جانے ادب کا کتنا دقیق سوال کر بیٹھیں۔ میں رہی معاشیات کی ادنیٰ سی طالبِ علم جو تیرہ برس سے یہ مضمون پڑھاتی چلی آ رہی تھی، ادب کی چند کتابیں پڑھ لینے سے جوش صاحب کے سوالوں کا بوجھ کیوں کر اٹھا پاؤں گی، فیل ہو جانا یقینی تھا۔ مرے اور مرجھائے ہوئے لہجے میں آمادگی ظاہر کی، ''جناب سوال کیجیے۔''

سوال بڑا آسان تھا۔

''یہ جو حضرت ہمارے برابر تشریف فرما ہیں، تمھارے شوہر ہیں؟''

اگر یہی سوال ہے تو بڑا آسان سوال ہے۔ سو فی صد نمبر ملنے تھے۔ میں نے اثبات میں جواب دے دیا۔

''اب یہ بتاؤ، ان سے لڑائی ہوتی ہے؟''

سمجھ میں آیا کہ پہلا سوال تو سوال نہیں تھا۔ سوال تو یہ ہے۔ جواب اس کا بھی آسان تھا۔ کسی کے سامنے نیک بی بی بننا زیادہ مشکل تو ہوتا نہیں۔ میرا جواب یہی ہونا چاہیے تھا کہ ہرگز نہیں۔ ہم دونوں میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ ہم تو لڑتے ہی نہیں، مخالفت نام کو نہیں۔ گھر میں سکون اور آشتی ہے۔ ایسا خوش گوار ماحول ہے کہ بس۔ ہر بزرگ یہ جواب سن کر خوش ہوگا۔ دعا دے گا، اور ہماری صلح پسندی پر داد دے گا۔ رشک بھی کرے گا اور دوسروں کو مثال بھی دے گا، مگر لمحے بھر میں ہی میں چکرا گئی۔ یہ سوال یقیناً آسان ہے مگر جواب اتنا آسان نہیں جتنا میں سمجھ رہی ہوں۔ سوال کرنے والے جوش صاحب تھے۔ ایک مشکل شخص۔ کیا جواب دوں؟ بات یہاں سچ جھوٹ کی نہیں تھی، اُس جواب کی تھی جس سے جوش صاحب متاثر ہوکر آنے کا وعدہ کرلیں۔

میں نے دل ہی دل میں ڈھیر ساری دعائیں مانگیں۔ کئی ایک سورتیں بھی پڑھیں، نظر بچا کر اُن پر پھونک بھی دیں۔ اللہ میاں سے براہِ راست مخاطب ہوکر زندگی میں کی گئی کئی ایک نیکیوں کا حوالہ بھی دیا۔ دعا کی کہ مشکل آسان ہوجائے۔ جوش صاحب کو میرا دیا ہوا جواب پسند آجائے اور وہ شرکت کے لیے ہامی بھرلیں۔ خواہ جواب سے میری شخصیت مسخ ہی کیوں نہ ہوجائے۔ کیا فرق پڑے گا۔ اس عرصے میں لسّی کے گلاس سے بھی کھیلتی رہی تاکہ جواب دینے کا کچھ وقت مل جائے۔

پھر یا اللہ مدد کہہ کے جواب دے ہی دیا۔

جوش صاحب مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ اگر کسی نے دیکھی ہے تو وہ جانتا ہے کہ مسکراتے ہوئے وہ بالکل ایک چھوٹے سے گول مٹول بچے لگتے تھے۔ مجھے ان کی اس لمحے

والی مسکراہٹ بھولتی ہی نہیں۔ اور پھر ان کا یہ کہنا کہ ''چلو بھئی جب تمھیں اپنی نوکری جانے کی پروا نہیں تو ہمیں کیوں ہو؟'' یہ جملہ بھی بس گول مول ہی تھا۔ مجھے تو واضح آمادگی والا جملہ چاہیے تھا۔ کئی ایک سورتیں اس موقعے کی اور بھی یاد آ گئیں۔

''میں آ ؤں گا۔''

یہ چھوٹا سا جملہ میری ساری دعاؤں کی قبولیت کے نتیجے میں تھا۔ میرا جواب ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ ان کے سامنے بیٹھی بیٹھی میں ہواؤں میں اُڑنے لگی۔

وہ مجھے بہ غور دیکھ رہے تھے اور میری نظر میں میرے کالج کا اسٹیج تھا جس پر جوش صاحب بیٹھ چکے تھے۔

کالج کی تقریبات اور ہفتۂ طالبات میری زندگی میں اس طرح داخل ہو چکا تھا کہ جیسے میں صرف ان ہی مقاصد کے لیے پیدا کی گئی ہوں، زندہ ہوں، اور زندگی کے بقیہ تمام کام اضافی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ ان دنوں طلبہ کے صفحات ہماری تقریبات کی رپورٹنگ سے بھرے ہوتے اور میں اللہ کا شکر ادا کرتے اور مبارک بادیں وصول کرتے کرتے نہیں تھکتی تھی۔

گھر واپس آئی۔ دوسرے دن دوپہر کی تیاری شروع کی۔ دن کے دو بجے مشاعرے کی شہرت شہرِ کراچی میں تھی کہ یہ وقت بھلا مشاعرے کا ہوتا ہے، مگر یہی وقت برسوں مشاعرے کا رہا۔ جوش صاحب نے کہا، ''جب سورج غروب ہوتا ہے تب میں طلوع ہوتا ہوں، اور تم مجھے بھری دوپہر میں طلوع ہونے کا کہہ رہی ہو۔''

۲۰ر جون کی دوپہر آ گئی۔ اُن دنوں میرے کالج کے پرنسپل سیّد محمد نصیر تھے۔ میرے ہی مضمون سے متعلق تھے۔ میری ترتیب دی ہوئی تقاریب کی یوں کھل کر تعریف کیا کرتے اور حوصلہ بڑھاتے کہ جس کی میں ہرگز عادی نہیں تھی کہ اس سے قبل حسنین کاظمی صاحب کا دور تھا جو کالج کے بانی بھی تھے اور میرے استاد بھی۔ میں ان کی چہیتی شاگرد تھی، مگر تعریف سننے کو کبھی نہیں ملی۔ ان کی شخصیت قطعی مختلف تھی۔ وہ کچھ نہ کہہ کر یہ یقین کرلیا کرتے کہ میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں گی۔ پروگرام کے اختتام پر اپنے آپ سے گویا ہوتے، اپنے آپ

سنتے۔ ''ہاں بھئی ہوگیا۔ سب کچھ ٹھیک ہوا۔ اللہ کا شکر ہے۔'' بس میں اسے ہی تعریف سمجھ لوں، اسے ہی تنقید۔ حوصلہ بڑھا لوں اور کل کا سوچوں۔ اُن کے بغیر میں نے اپنی زندگی کے صرف چودہ یا پندرہ برس گزارے ہیں۔ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اب پھر سے محرومی کے سال گزر رہے ہیں۔ بیچ کی ساری عمر ان کے ساتھ شاگردی اور استادی میں گزری۔ حسنین کاظمی صاحب کا خیال آجانا اس موقعے پر ضروری تھا اور یہ ضروری کام میں اکثر کرتی رہتی ہوں۔

شاعر حضرات کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اسٹیج تیار تھا۔ کھانا بھی تیار تھا۔ مجھے جوش صاحب کے آنے کا بے چینی سے انتظار تھا اور نہ آنے کا بھی ڈر۔ یہ جملہ بھی ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ ''اپنی نوکری کی دشمن کیوں ہو رہی ہو۔'' مگر نوجوانی اور بہادری ایک ہی معنوں میں استعمال کی جاتی ہے۔

اسٹیج کی نوک پلک سنوارتے ہوئے دور سیدھ میں کالج کے مرکزی گیٹ پر نظر پڑی تب جوش صاحب دائیں بائیں بغل سے چپکے دو لوگوں کے درمیان چلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ دو لوگ نثار اختر اور سحر انصاری تھے۔

میں چھلانگ مارتی پرنسپل کے کمرے کی جانب لپکی۔ سانس پھولی ہوئی تھی، جون کی گرمی نے سارے جسم کو بھگویا ہوا تھا۔

''سر! ایک غلطی ہوگئی ہے۔'' اسی پھولی سانس اور بھیگے جسم کے ساتھ میں شرمندگی سے اعتراف کر رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' نصیر صاحب نے آہستگی سے پوچھ لیا۔

''میں نے جوش صاحب کو مشاعرے میں بلا لیا ہے۔'' میرے لہجے میں خوف صاف ظاہر تھا۔

''کیوں تم جانتی نہیں کہ وہ مشاعروں میں نہیں بلائے جاسکتے۔ کالج میں وہ نہیں آسکتے۔''

''جی جانتی ہوں۔ مگر اب کیا کروں؟'' مجھے یہ مان لینے میں ذرا بھی تامل نہیں تھا کہ میں اپنے کیے ہوئے فیصلے سے خوف زدہ تھی۔ باز پُرس اور نوکری کی آزمائش پر پریشان تھی۔

''چلو چھوڑو۔ کئی ایک شاعر آ چکے ہیں۔ کھانا لگواؤ۔ باقی لوگ بھی آ ہی جائیں گے۔'' انھوں نے گھڑی دیکھتے کہا۔ ''جوش صاحب کی فکر نہ کرو وہ خود ہی نہیں آئیں گے۔''

''سر مگر جوش صاحب تو گیٹ پر ہیں۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے اطلاع دی۔

اب نصیر صاحب کے چھلانگ لگانے کی باری تھی۔ وہ گیٹ کی طرف بھاگے۔ میں ڈرے ڈرے قدموں سے اسٹیج کی جانب جارہی تھی۔ نصیر صاحب انھیں تھامے اسٹاف روم میں آ گئے۔ وہاں تو ہلچل مچ گئی۔ سارے شعرا تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے۔ انھیں ہرگز یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے سامنے جوش صاحب کو دیکھ رہے ہیں۔ کئی شعرا نے تو دل ہی دل میں آج پڑھی جانے والی غزل دُہرانی بھی شروع کردی۔ جوش صاحب کی صدارت میں اپنا کلام سنانا کوئی معمولی اعزاز تو نہیں۔ اس دن کالج کا اسٹاف روم مکمل غزل کا روپ دھار گیا تھا۔ میری خوشی اور خوف دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے، مگر نصیر صاحب مجھے قطعی فراموش کر چکے تھے۔ خوشی اور میزبانی ان کی ہر ہر عمل سے اڈی نظر آ رہی تھی، اور میں قطعی طور پر نظر انداز کردی گئی تھی۔ میں اسٹیج کی ایک بار پھر نوک پلک درست کر کے اسٹاف روم کے کونے میں کھڑی جوش صاحب کو مسلسل تک رہی تھی، جب کہ آج میزبانی کی میری باری تھی۔ جی چاہ رہا تھا سالن کا سارا ڈونگا جوش صاحب کی پلیٹ میں انڈیل دوں۔ کہیں سے لسی کے ویسے ہی گلاس لاکر قطار در قطار ان کے سامنے سجا دوں، جوش صاحب شوربے میں ڈوب جائیں، یہ سوچیں بھی ناں کہ دن کے دو بجے ہیں اور وہ غروب ہیں، سورج چمکنے کے بجائے غروب ہو چکا ہے اور وہ طلوع ہو چکے ہیں۔ نظموں غزلوں کی آمد ہے کہ روکے نہیں رک رہی ہے۔ جوش صاحب نے رغبت سے کھانا شروع کردیا تھا۔ لسی کے بجائے کولڈ ڈرنک کے کئی ایک رنگ برنگے بوتل میں نے ان کے سامنے سجا دیے۔ جو رنگ پسند آئے بس وہی وہ اٹھالیں۔ سب کے ڈھکنے کھول رکھے تھے کہ لینے میں ذرا بھی زحمت نہ ہو۔ آج جوش صاحب نے ہرگز یہ نہیں کہا، بھئی طبیعت اب مائل نہیں ہے۔ طبیعت مکمل طور پر مائل تھی۔ ہاں نصیر صاحب کی میری جانب سے بے رخی مجھے حیرت میں مبتلا کررہی تھی۔ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھ سے خوش ہیں یا خفا۔ وہ تو بس جوش صاحب پر مکمل طور پر نچھاور ہو چکے تھے۔

کھانے سے فراغت کے بعد اسٹیج کی جانب آنے میں نصیر صاحب ان کی بغل میں ہاتھ دیے چلنے میں مدد دے رہے تھے۔ ان کے چہرے پر نہ کوئی خوف تھا نہ ہی غصہ۔ قد میں چھوٹی چھوٹی چنی ہوئی لڑکیاں سفید شلوار کرتے اور لال تہ کیے ہوئے دوپٹے میں ملبوس دونوں جانب قطار میں استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ بائیں جانب روپہلی کرن والے بیج پر خوش آمدید تحریر تھا۔ ہاتھ میں کاغذ کی پلیٹ ان میں سرخ گلاب کی پتیاں جسے وہ خلوص اور محبت کے ساتھ نچھاور کر رہی تھیں۔ شعرا قطار در قطار آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ دونوں جانب بیٹھی طالبات تالیاں بجا کر شعرا کا استقبال بھی کر رہی تھیں اور اپنی موجودگی کا احساس بھی دلا رہی تھیں۔

میں دور اسٹیج پر کھڑی شعرا کے نام دُہرا رہی تھی۔ ہر نام پر تالیوں کی آواز میں اور گرمی پیدا ہو جاتی۔ جون کا مہینہ تھا۔ شامیانہ گرم تھا جسے اِدھر اُدھر رکھے پنکھے ٹھنڈا بنانے میں اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ اسٹیج کی سجاوٹ دیدنی تھی۔ گاؤ تکیے ان کے سامنے ٹافیوں، چھالیا اور الائچی کی پلیٹیں رکھی تھیں کہ اپنی باری آنے تک شعرا ان سے شغل کرتے رہیں۔

جوش صاحب کئی ایک اساتذہ کی مدد سے اسٹیج پر پہنچا دیے گئے اور وہ اسٹیج پر پہنچتے ہی گاؤ تکیے کے ہو کر رہ گئے۔

اب دوسری مشکل آن پڑی تھی۔ یہ مشاعرہ ہندوستان سے آئے ہوئے ایک اہم شاعر شاذ تمکنت کی صدارت میں ہونا قرار پایا تھا۔ جوش میں جوش صاحب بلا لیے گئے۔ میں نے جوش صاحب کے کان میں سرگوشی کی، جوش صاحب نے دو صدور کی منظوری دے کر اس مشاعرے کو اپنی نوعیت کا ایک انوکھا مشاعرہ بنا دیا۔ شاذ تمکنت بالکل بھی ناراض نہیں ہوئے، بلکہ انھوں نے رخصت ہوتے ہوتے کئی بار میرا شکریہ بھی ادا کیا اور خوشی کا بھی اظہار کیا کہ انھیں جوش صاحب کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھنے کا موقع ملا خواہ صدارت میں شراکت ہی کیوں نہ ہو گئی ہو۔ سنا یہ بھی گیا کہ انھوں نے ہندوستان واپسی پر اس مشاعرے کی روداد بھی لکھی تھی اور تعریف میں کئی پیراگراف تحریر کر گئے، مگر افسوس یہ ہوا کہ یہ مشاعرہ ان کی زندگی کا آخری مشاعرہ ثابت ہوا۔

یہاں میں اپنی تعریف کرلوں کہ اسٹیج پر مجھ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوا کرتی تھی کہ سامنے میری طالبات ہوتی تھیں، لیکن آج کے دن اندر اندر میں ڈھیر سارے خدشات اور بے انتہا خوشیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایسے میں دھڑا دھڑ غلطیاں کررہی تھی۔ تمام شعرا وہی تھے جو پچھلے تیرہ برسوں سے آرہے تھے، حیران بھی ہوئے کہ آج مجھے کیا ہورہا ہے اور یہ جان بھی گئے تھے کہ کیوں ہورہا ہے۔

ڈر اور خوف صرف جوش صاحب کی ذات سے ہی نہیں تھا کہ یہ کام تو میں نے ہی کیا تھا اور جان بوجھ کر کیا تھا۔ ڈر تو ایک اور بھی تھا۔ نصیر صاحب نے پوچھا، ''یہ فہمیدہ ریاض کو بھی تم نے ہی بلایا ہے؟'' حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ شعرا کو میں ہی دعوت دیا کرتی ہوں۔ میں نے نصیر صاحب کو بتا دیا کہ فہمیدہ ریاض کو جوش صاحب ازخود اپنے ساتھ لائے ہیں۔

''اچھا۔'' انھوں نے گہری سانس لی۔ اُن دنوں فہمیدہ ریاض کی چادر اور چہار دیواری والی نظم جرم کے زمرے میں آئی ہوئی تھی۔ وہ حکومت کی جانب سے معتوب تھیں۔

اب یہ دُہرا ڈر۔ نظامت کے دوران میں سامنے بیٹھے نصیر صاحب سے آنکھیں چرا رہی تھی جو اچھل اچھل کر بآوازِ بلند داد دے رہے تھے۔ پھر میں بھی ڈھیٹ بن گئی اور ڈر خوف سے جان چھڑا کر غلطیوں سے پاک ہوگئی۔

جوش صاحب اسٹیج پر گاؤ تکیہ لگائے تقریباً لیٹ چکے تھے۔ آنکھیں بھی آدھی بند اور آدھی کھلی تھیں۔ شاذ تمکنت ان کے پاؤں سمیٹے اپنی عزت کو چار چاند لگائے ہوئے تھے۔ شعرا خوش اور پرجوش تھے۔ سحر انصاری خاموشی ہی میں میرا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

فہمیدہ ریاض نے حد یہ کی کہ اپنی چادر اور چہار دیواری سنانی شروع کردی۔ طالبات، اساتذہ، دیگر شعرا کے ساتھ ساتھ نصیر صاحب کی داد قابلِ دید تھی۔ گویا فہمیدہ ریاض نے تو مشاعرہ ہی لوٹ لیا تھا۔ بعد میں میرا کیا بننا تھا، یہ الگ بات تھی۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ خوشی کا جو لمحہ ملے اسے سمیٹ لو۔ آگے جو ہونا ہے، وہ تو ہونا ہی ہے۔

جوش صاحب کی باری آئی تب طالبات نے تاریخ کی سب سے لمبی تالی بجانے کا ریکارڈ قائم کردیا۔ کئی بار جوش صاحب نے بولنے کی کوشش کی مگر طالبات نے اپنی باری قائم

رکھی۔ مجھے ہی تالیوں کو مؤخر کرنے کی درخواست کرنی پڑی۔ جوش صاحب نے پہلا جملہ بھری دوپہر میں مشاعرے کے انعقاد اور میری بتائی ہوئی مجبوری کی داستان سے شروع کیا، اور پھر اپنا کلام سنانے لگے۔ واہ وا اور مکرر ارشاد کی بھرمار تھی اور یہ تربیت کہ اشعار پر داد دی جاتی ہے تالیاں نہیں، طالبات نے اس پر عمل کیا اور جوش صاحب نے اس کی تعریف کی، ''لگتا ہے آپ کی استانی نے آپ کو مشاعرے کے آداب سکھائے ہوئے ہیں۔'' دیگر شعرا نے بھی مجھ استانی کی شان میں کئی جملے ادا کیے کہ وہ تمام لوگ تو مسلسل تیرہ سال آتے رہے تھے۔

مشاعرہ کامیاب تھا۔ سارے شہر میں حسبِ معمول مشاعرے کا شور تھا۔ نصیر صاحب نے بھی اپنے مخصوص انداز میں سراہا۔ وہ اتنے خوب صورت انسان تھے کہ کبھی بعد میں بھی اپنی ''پیشی'' کا تذکرہ کرکے مجھے بدمزہ نہیں کیا۔ مجھے معلوم بھی ہوا کہ وہ کیسی آزمائش سے گزرے تھے۔ صرف جوش صاحب ہی کی وجہ سے نہیں، بلکہ زیادہ فہمیدہ ریاض کی وجہ سے بھی۔

جوش صاحب کی زندگی کا یہ آخری مشاعرہ تھا۔ شاذ تمکنت کی زندگی کا بھی۔ یہ دونوں صدور پھر مشاعرہ نہ پڑھ سکے۔ یہ محض اتفاق تھا۔ میں نے کئی بار اپنے آپ کو خود ہی سمجھایا اور مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

ایک دن آرٹس کونسل کی ایک تقریب میں فہمیدہ ریاض میرے برابر بیٹھی دوسری طرف بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے گفتگو میں یہ کہہ رہی تھیں کہ میں اکثر یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں کہ میں نے چادر اور چہار دیواری سب سے پہلے کہاں پڑھی تھی۔ تب میں گفتگو میں مخل ہوئی، ''اجازت دیں تو میں بتاؤں۔''

وہ میری جانب مڑیں اور شاید پہچاننے کی بھی کوشش کررہی تھیں۔ خوش ہوئیں، ''میرے ساتھ جوش صاحب بھی تو تھے۔''

اب ان کی یاد انھیں خوش کررہی تھی، مگر جب ہوٹل جبیس سے علامہ اقبال کالج ایئرپورٹ تک کے سفر کی رپورٹ نثار صاحب نے مجھے دی تب تو اس مشاعرے کی مکمل روداد اور بھی یادگار بن گئی۔

ہمارے پاس اس وقت سفید رنگ کی فوکس ویگن ہوا کرتی تھی۔ جن لوگوں نے اس

گاڑی میں کبھی بیٹھنے کی سعادت حاصل کی ہے، وہ بہ خوبی واقف ہیں کہ پیچھے کی نشست میں بیٹھنے کے لیے پہلے آگے والی نشست کو الٹایا جاتا ہے پھر پھنس پھنسا کر دبلا پتلا شخص بھی بہ مشکل پچھلی نشست سنبھال پاتا ہے۔ دونوں طرف کے دروازے مکمل بند ہوتے ہی صرف دروازے ہی نہیں شیشے بھی سیل بند ہوتے ہیں۔

اسی فوکس ویگن میں پچھلی نشست پر سحر انصاری اور فہمیدہ ریاض بہ مشکل داخل ہوگئے۔ اگلی سیٹ یقیناً جوش صاحب کی تھی۔

نرسری پہنچتے پہنچتے جوش صاحب کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔ کڑک کر بولے، ''نثار گاڑی روکو۔''

''جوش صاحب یہ سڑک مناسب نہیں ہے۔'' نثار نے ڈرتے ڈرتے آگاہ کیا۔

''روک لو۔ اب میں نہیں رُک سکتا۔'' جوش صاحب کی آواز میں حکم بھی تھا اور ضرورت کی شدت بھی۔

''کالج کچھ ہی دور ہے۔'' حالاں کہ کالج ایئرپورٹ پر واقع تھا، ابھی خاصا دور تھا۔ نثار نے جھوٹ بول کر تسلی دی۔

''روکتے ہو یا نہیں، ورنہ میں گاڑی ہی میں فارغ ہوجاؤں گا۔''

اب نثار کو ڈر محسوس ہوا۔ انھوں نے ایئرفورس بیس کے قریب گاڑی کھڑی کردی۔ اتر کر جوش صاحب کو پکڑا۔ سحر انصاری پچھلی سیٹ پر قید میں تھے۔ سو، یہ فریضہ اکیلے نثار نے بہ مشکل ادا کیا۔ دیوار کے نزدیک جا کر منہ پھیر کر کھڑے ہوگئے۔

جوش صاحب نے اچھا خاصا وقت لیا اور واپس آکر گاڑی میں بیٹھنے پر بھی وقت لینے پر مجبور نظر آئے۔

اطمینان سے بولے، ''اگر تم یہاں گاڑی نہیں روکتے.....'' آگے وہ کچھ نہ بولے، مگر گاڑی میں بیٹھے سب ہی سمجھ چکے تھے کہ گاڑی کے ساتھ ساتھ ان کے اپنے کپڑوں کا کیا حشر ہوتا۔

نثار کہہ رہے تھے کہ میں منہ پھیرے بس یہ دعا کررہا تھا کہ کوئی اخباری نمائندہ ادھر سے نہ گزرے کہ آگے دیوار پر وہی جملہ لکھا تھا جو ایسا کچھ کرنے پر خوف دلانے کے لیے لکھا

جاتا ہے۔ شکر ہے اُن دنوں پی ٹی وی اکلوتا تھا اور گلی کوچوں میں مارا مارا نہیں پھرتا تھا۔

آج اتنے سال گزرنے کے بعد ہم جب بھی ایک ساتھ بیٹھتے ہیں، اس مشاعرے کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ جوش صاحب یاد آ جاتے ہیں اور اس اعزاز پر بھی خوش ہوتے ہیں کہ جوش صاحب نے اپنی زندگی کا آخری مشاعرہ ''بندش'' کے باوجود ہمارے کالج میں پڑھا۔

اسٹیج سے اس کے بعد کے کئی سال تک ان کی پڑھی ہوئی شاعری مائک کی مدد سے آخری قطار تک اسی جوش وخروش سے سنائی دے رہی تھی۔

جوش صاحب پڑھ رہے تھے:

لکھ رہی ہیں، لکھ رہی ہیں، لکھ رہی ہیں انگلیاں

○

ایک مسیحا... مصطفیٰ خان صاحب

ہم کراچی سے حیدرآباد جارہے تھے اور محسوس کررہے تھے کہ جیسے ہم حکومتِ وقت کی کوئی اہم شخصیت ہیں شاید وزیر سفیر۔ ہمارے چار افراد کے قافلے میں ایک زینت تھیں، ایک طلعت جو مقامی کالج میں تاریخ کی لیکچرار تھیں اور میں بھی جو سرکاری کالج میں پرنسپل کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ چوتھے فرد خاور جمیل جو سندھ سوشل سیکیورٹی کے کمشنر تھے، وہ اپنی کسی سرکاری مصروفیات کے سبب حیدرآباد جارہے تھے۔ ہم نے ان سے خصوصی طور پر اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ہم بھی ان کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔ کسی نئے شہر جانے کا مقصد خریداری ضرور ہوتا ہے، خواتین اسے جھٹلا نہیں سکتیں، مگر اس موقعے پر ہمارے دل کے کسی کونے میں یہ خواہش موجود نہیں تھی۔ ہم تو وہاں کی اہم ترین شخصیت جناب غلام مصطفیٰ خان سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا چاہتے تھے، جن کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سن اور پڑھ چکے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے ان کا تعارف ہم سے یوں کرایا تھا کہ ملنے کا اشتیاق بڑھ چکا تھا۔

آگے پیچھے سرکاری گاڑیاں تھیں جن میں ایک گاڑی میں کمشنر سیسی موجود تھے اور دوسری گاڑی میں ہم تین دوست۔ صاف ستھری چوڑی دوطرفہ سڑک اور ہماری تیز رفتار گاڑی۔ سفر کا مزہ آرہا تھا۔ کراچی کی تنگ اور بھری پُری سڑکوں پر ہچکولے کھاتی گاڑی سے

سفر میں وہ مزہ کہاں۔ راستے بھر ہم مصطفیٰ صاحب کی شخصیت کے بارے میں سنی سنائی باتیں دہراتے رہے۔ مصطفیٰ صاحب سے ملنے میں ہماری ایک غرض بھی شامل تھی کہ ہم اپنی اپنی کوئی ایک یا زیادہ خواہشات ساتھ لے کر چلے تھے کہ ان سے دعا کی درخواست کریں گے۔

دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت طے کر کے سندھ یونی ورسٹی کیمپس پہنچے جہاں اسٹاف ٹاؤن میں ان کا قیام تھا۔ اگر میں اپنی دلی کیفیت الفاظ میں بیان کروں تو شاید اس کی شدت سننے والا پوری طرح محسوس نہیں کر سکے گا۔ دل دھڑک رہا تھا اور آنکھیں انھیں دیکھنے کے لیے بے چین تھیں۔

ہم تینوں دوست ایک چارپائی پر قطار سے بیٹھ گئے جس میں زینت کا پہلا نمبر تھا، پھر طلعت اور آخیر میں میری نشست تھی۔ ہم اپنی اپنی خواہشات میں سے اس خواہش کو پہلا نمبر دینے میں مصروف تھے کہ جسے ان کے سامنے بیان کرنا تھا۔ مصطفیٰ صاحب سفید کُرتہ پاجامہ اور سفید ہی کپڑے کی ٹوپی پہنے دھیمے قدموں چلتے ہوئے آئے۔ سفید ڈاڑھی، پرنور چہرہ، مسکراتے ہونٹ اور شعاعوں سے بھرپور آنکھیں کچھ دیر کے لیے ہم کھڑے کھڑے کہیں گم ہو گئے، خاص طور سے ان کی مسکراہٹ جو کسی چھوٹے سے بچے کے معصوم چہرے پر پھیلی ہوتی ہے وہ ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ انھوں نے شگفتہ انداز میں ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا، مگر بیٹھنے میں ہم نے کئی منٹ لگا دیے۔ ہم تینوں نے اپنا اپنا تعارف کرایا جو صرف نام بتانے تک محدود تھا، لیکن میں نے اپنے نام کے ساتھ علی گڑھ کا حوالہ چپکانا ضروری سمجھا۔ یہ ضرورت کام کر گئی۔ ان کی مسکراہٹ بڑھ گئی، اور ایک خصوصی محبت کی نظر مجھ پر یوں پڑی کہ جیسے وہ مجھ پر زیادہ مہربان ہو گئے ہیں۔ اس لمحے مجھے اپنے والد اور دیگر تمام رشتے داروں کا شکریہ ادا کرنا ضروری محسوس ہوا کہ جنھوں نے مجھے اس مرتبے پر پہنچانے میں میری مدد کی تھی کہ میں عمر کی کمی کے باعث علیگ نہیں، بلکہ صرف علیگ زادی تھی۔ ایک شکریے کے مستحق بابائے علی گڑھ سر سیّد احمد خان بھی تھے جنھوں نے ہر مذہب ہر ملک کے لوگوں کو بلاتفریق ایک لڑی میں پرو دیا ہے اور انھیں ایک خاندان کا فرد بنا دیا ہے۔

زینت کی ان سے کئی ملاقاتیں تھیں۔ جمیل جالبی صاحب اور مصطفیٰ صاحب کی آپس میں جو قربت رہی ہے زینت سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔ زینت نے ان کے آگے جھک کر

ادب کے ساتھ اپنی خواہش کا اظہار کیا اور ان سے دعا کی طالب ہوئیں۔ مصطفیٰ صاحب نے انھیں وظیفے کے ساتھ کچھ ہدایات بھی دیں۔ پھر نمبر طلعت کا تھا۔ طلعت کچھ آب دیدہ تھیں۔ رقت آمیز لہجے میں وظیفے کی طلب گار تھیں۔ کمال ہم دردی سے انھیں وظیفہ ملا۔ اب باری میری تھی۔ میں اپنی خواہش چھپانے کے بجائے بتا دینا پسند کروں گی جو لے کر میں ان کے حضور پہنچی تھی۔ میرے بیٹوں نے ایسی تعلیم اپنے لیے چنی تھی جو نہ صرف مشکل تھی، بلکہ اس کی روایت یہ تھی کہ امتحان دیتے دیتے بچے بڑے ہوجاتے جب کامیابی مل پاتی۔ بس ان کے پاس ہونے کے لیے وظیفہ درکار تھا۔ بچے بلاشبہ ذہین بھی تھے، محنتی بھی، مگر میں اس میں دعا کا اضافہ کرنا چاہتی تھی۔ میری باری آئی تب وہ مجھ سے مخاطب ہوگئے۔ میرے والد اور ان کی تعلیم کا دورانیہ پوچھا۔ انھیں وہ فوراً یاد آگئے، مگر بالخصوص میرے دادا کا جو نواب وقار الملک کے سیکریٹری کے فرائض انجام دیتے تھے، اور اس سے قبل انڈین ایجوکیشن سروس کے سبب کشمیر اسٹیٹ میں ڈائریکٹر ایجوکیشن کے عہدے پر فائز تھے، ان سے بخوبی واقف تھے۔ اس پہچان پر وہ بھی خوش ہوئے اور میں بھی، لیکن دوسرے ہی لمحے میری خوشی مایوسی میں بدل گئی جب انھوں نے میری وہ خواہش پوچھی ہی نہیں جسے راستے بھر بیان کرنے کے لیے میں الفاظ کا چناؤ کرتی رہی تھی۔ انھوں نے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ یقین جانیں مجھے محسوس ہوا کہ ان کی دونوں آنکھوں سے شعاعیں نکل رہی ہیں اور میرے سارے جسم میں پیوست ہوتی جارہی ہیں۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے سر جھکا لیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہہ رہے تھے جسے میں نہیں سن پائی، اور یہ بھی نہیں سمجھ پائی کہ وہ مجھ سے میری خواہش کیوں نہیں پوچھ رہے ہیں؟ ان کے چہرے پر ضرورت سے زیادہ سنجیدگی اور فکر کے آثار تھے۔

کچھ لمحے گزرے انھوں نے نظریں اٹھائیں مجھے پھر غور سے دیکھا کہنے لگے، ''بیٹی آپ کے لیے ایک چھوٹا سا وظیفہ ہے، اسے فوری یاد کرلیں اور ابھی سے پڑھنا شروع کردیں، اور بس پڑھتی رہیں۔ اتنا پڑھیں کہ آپ تھک جائیں، منہ سے جھاگ نکل پڑے، مگر آپ رکیں نہیں۔''

میں پریشان تھی۔ ابھی تو میں نے اپنی خواہش کا اظہار بھی نہیں کیا، انھوں نے مجھ

سے میری خواہش سنی بھی نہیں پوچھی بھی نہیں۔ وہ سارا تعلق جو علیگ کے رشتے سے ابھی ابھی استوار ہوا تھا، کہاں گیا؟ دل کی حسرت دل ہی میں رہی، کاش مجھ سے پوچھ لیتے، لیکن ادب مانع تھا میں کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ ہاں البتہ ان کا بتایا ہوا وہ وظیفہ جو جانے کس دعا کے پورا ہونے کے لیے تھا، دہرانا شروع کر دیا۔

ہم لوگ دو دن حیدرآباد میں رہے۔ بازار گھومے، چوڑیوں کے کارخانے دیکھے، تفریح کی، لیکن دل میں وہ حسرت بار بار سر اٹھاتی رہی اور میں وظیفے کا ورد کرتے کرتے گھر آ گئی۔ گھر پہنچتے ہی کچھ ایسا ہوا کہ اسپتال پہنچ گئی۔ خطرناک آپریشن ہوا۔ ڈاکٹروں کے مطابق مجھے دوسری زندگی ملی تھی۔ یہ اچانک تشخیص کیوں اور کیسے تھی؟ یہ معما ہی رہا، لیکن ہاں میں نے اس کا سرا اس وظیفے سے جوڑ دیا جس کے باعث مجھے دوسری زندگی ملی تھی۔

تقریباً سال بھر بعد مصطفیٰ صاحب کے خطوط کا مجموعہ شائع ہوا جس کی تقریبِ پذیرائی کراچی میں خاور جمیل کی معرفت پاکستان نیشنل اکیڈمی سے ہوئی جس کی نظامت حسبِ سابق میرے حصے میں آئی۔

پچیس سال لگاتار نظامت کرتے ہو گئے تھے، لیکن یہ جدا تقریب تھی۔ مصطفیٰ صاحب کی کتاب، ان کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھنا، ان سے گفتگو کرنا، یہ بھی تو کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ سو، یہ اعزاز جب مجھے ملا تب میں ان کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ ان کے چہرے پر پہلے جیسی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں سے نکلتی شعاعیں تھیں جو میرے سارے وجود میں ایک بار پھر پیوست ہو گئیں۔

''آپ صحت یاب ہو گئیں۔'' ان کا چھوٹا سا یہ جملہ پہلی ملاقات سے لے کر اس دوسری زیارت کو ایک دم جوڑ گیا۔ ''تو یہ بات تھی۔'' میرے دل کو قرار آ گیا. شاید میرے چہرے پر ایک ایسی جان لیوا بیماری تحریر تھی جسے انھوں نے ڈاکٹر نہ ہوتے ہوئے بھی پڑھ لیا تھا، اور چاہتے تھے کہ میں اس اذیت سے گزر کر صحت یاب ہو جاؤں جو شاید اس دعا کے بغیر ممکن نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دعا میں سارے مشکل مرحلوں کا حل نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔

میں اسٹیج پر تھی اور آج میری نظامت میں وہ جوش اور روانی تھی جو نہ پہلے تھی اور نہ بعد میں محسوس کی۔ مصطفیٰ صاحب اسٹیج پر یوں بیٹھے تھے جیسے کوئی آسمان سے اتر کر فرشتہ بیٹھ

گیا ہو۔ وہی سفید کرتا پاجامہ، سر پر کپڑے کی سفید ٹوپی، سفید خوب صورت ڈاڑھی، چہرے پر سکون کا گہرا سمندر، ہونٹوں پر بچوں جیسی کھلکھلاتی مسکراہٹ۔ وہ جب بھی نظر اٹھا کر دیکھتے مجھے لگتا ان کی آنکھوں سے دودھیا لکیر نکل رہی ہے جو سیدھی میرے وجود میں پیوست ہوتی جارہی ہے۔ میرا سارا جسم ٹھنڈا تھا۔ الفاظ خود بہ خود ادا ہورہے تھے۔ پسندیدگی پر تالیاں بج رہی تھیں۔ میں حیران تھی میری تیاری میں تو یہ جملے تحریر بھی نہیں تھے جسے میں ادا کررہی ہوں۔

خطوط کا یہ مجموعہ ''یادگار خطوط'' کے نام سے چھپا تھا جسے خالد محمود صاحب نے بڑی محنت اور محبت کے ساتھ مرتب کرکے زبیر پبلشر حیدرآباد سے شائع کیا تھا۔ یہ خطوط ان کے احباب، جاننے والوں، چاہنے والوں، شاگردوں اور مریدوں کے تحریر کردہ تھے۔ میں نے سوچا، کاش میری بھی گنتی ان لوگوں میں ہوتی اور اسی کتاب میں میری بھی تحریر شامل ہوتی۔

مصطفیٰ صاحب سے اسٹیج کی یہ ملاقات بہت اہم یوں بھی تھی کہ ان کے ساتھ بہت ساری تصاویر بنیں جو آج بھی یادگار کے طور پر میرے پاس موجود ہیں۔ تصویریں ان موقعوں کی مکمل یادگار ہوتی ہیں جو آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، ذہن میں نقش چھوڑ جاتے ہیں، تصویریں انھیں اور بھی نمایاں کردیتی ہیں۔

عصر اور مغرب کی دو نمازیں مصطفیٰ صاحب کی امامت میں ہوئیں۔ شیرٹن ہوٹل کا سارا عملہ اپنا اپنا کام چھوڑ کر شریک تھا۔ کیا بیرے، کیا منیجر، کیا انتظامیہ اور وہ سارے لوگ جو اس تقریب میں مدعو تھے۔ اس وقت کے چند وزرا اور گورنر سندھ بھی جو مصطفیٰ صاحب کے حضور جھک گئے تھے اور تمنا کررہے تھے کہ وہ ان کے سر پر دستِ شفقت رکھ دیں، اور بلا امتیاز مصطفیٰ صاحب ایسا کر بھی رہے تھے۔ یہ ایک ایسی محفل تھی جو پھر کبھی منعقد نہ ہوسکی، لیکن میری زندگی کی درجنوں محفلوں میں سے سب سے اہم، سب سے خوب صورت، سب سے بامعنی تقریب بن کر آج بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ حافظے میں موجود ہے۔

یہ میری ان سے دوسری ملاقات تھی، لیکن تشنگی اب بھی باقی تھی۔ ہمارے کالج کی چند اساتذہ اور میری کچھ دوستوں نے مل کر حیدرآباد جانے کا پروگرام بنایا۔ مقصد ان سے ملنا ہی تھا۔ اس بار ان سے ملاقات یوں دشوار تھی کہ خاور جمیل ساتھ نہیں تھے اور ہم کمشنر والے

پروٹوکول والی گاڑی میں بھی سوار نہیں تھے۔ کراچی سے حیدرآباد جانے والی بس میں سوار تھے۔ ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے والی سیٹ پر لائن سے بیٹھے تھے کہ حیدرآباد پہنچتے پہنچتے ہماری بس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ ونڈ اسکرین کا شیشہ چور چور ہوکر ہم پر برس رہا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کو دبوچے جی جان سے کانپ رہے تھے۔ خوف سے ہماری چیخیں نکل رہی تھیں۔ ڈرائیور سخت زخمی تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے لوگ زخمی تھے اور ان کے چہرے اور ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اپنے حواس قائم کر پائے اور اپنے جسم کو ٹٹولنے لگے تب ہم نے دیکھا ہمیں تو ان شیشے کے ٹکڑوں نے کوئی نقصان پہنچایا ہی نہیں تھا۔ گود میں ٹکڑے یوں جمع تھے جیسے ہم نے انھیں خود اٹھا اٹھا کر رکھا ہو۔ جنھیں ہم نے کھڑے ہوکر جھاڑا۔ سب لوگ بس سے اتر گئے۔ دیر تک گاڑی کی صفائی ہوئی۔ ڈرائیور بدلا گیا لوگوں نے اپنے زخم صاف کیے۔ ہم دوبارہ اپنی سیٹ پر آبیٹھے۔ حیدرآباد قریب ہی تھا۔ سندھ یونی ورسٹی کیمپس میں مصطفیٰ صاحب کا وہ گھر جو انھیں تاحیات الاٹ کیا گیا تھا جہاں وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی تقریباً تین دہائیوں تک مقیم رہے، ہم پہنچ گئے۔ اندر جانے کی اجازت نہیں تھی، مصطفیٰ صاحب علیل تھے۔ ان میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی، مگر خالد محمود صاحب کی خدمات ہمیں حاصل ہوگئیں۔ ہم خصوصی طور پر ان کے گھر میں داخل ہوگئے۔

مصطفیٰ صاحب پہلے سے زیادہ ضعیف، زیادہ کم زور تھے، مگر چہرے کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی کشش میں ذرّہ بھر بھی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا اور میرے ساتھ آئی ہوئی دوستوں کو خوش دلی سے خوش آمدید کہا۔ کہنے لگے، ''سفر حفاظت سے طے ہوا؟'' ہم سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کیا یہ صرف ایک عام سا جملہ تھا جو پوچھا جاتا ہے یا انھیں اس حادثے کا علم ہوگیا تھا۔ دوسروں نے کیا سوچا پتا نہیں۔ میں نے اس جملے کو اسی جملے سے جوڑا جو ایک بار خطوط کے اختتامی اجلاس میں وہ مجھ سے کر چکے تھے، ''آپ صحت یاب ہوگئیں۔''

ہم کرسیوں پر بیٹھے تھے، سامنے چٹائی بچھی ہوئی تھی، مصطفیٰ صاحب آکر نیچے بیٹھ گئے۔ ہم نے بھی نیچے بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ شاید کچھ بھی کہنے سے پہلے مسکراتے ضرور

تھے سو، مسکرا کر بولے، ''بچیو اوپر ہی بیٹھی رہو۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' ہماری ایک دوست نے کہا۔

درمیان میں جلد ہی دستر خوان بچھا دیا گیا۔ یہ کھانے کا وقت تھا۔ ہم شرمندہ ہوئے کہ بے وقت آ گئے۔

وہ دلی بات سمجھ گئے۔ ''بے وقت نہیں آئی ہو۔ تم لوگ اپنا دانہ اپنے ساتھ لائی ہو۔'' کھانا چن دیا گیا۔ مصطفیٰ صاحب کی پلیٹ میں بے نمک ابلی ہوئی لوکی کے چند ٹکڑے اور آدھا کٹا ہوا لیموں تھا۔

اب ہم ان سے کچھ باتیں بھی کرنا چاہتے تھے۔

''آپ بس یہ کھاتے ہیں؟''

''ہاں لیموں بڑی اچھی چیز ہے۔ فائدہ مند بھی اور ذائقہ دو چند کر دیتا ہے۔ بے نمک لوکی کی ترکاری اس پر نچوڑ کر لیموں اور اگر مزید مزے دار بنانا چاہو تو کالی مرچ چھڑک دو۔ بہترین غذا ہے۔ کبھی پیٹ میں گرانی نہیں ہوگی۔ بھوک بھی مٹ جائے گی۔''

ہم لوگوں نے بھی اس وقت یہی تقلید کی اگر چہ اور سالن بھی دستر خوان پر موجود تھا۔ اس وقت تو لگا واقعی اس ترکاری اور لیموں سے بڑھ کر ذائقہ کسی اور سالن میں ہو ہی نہیں سکتا، پھر ان کے ساتھ کھانا بھی ہمارے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔

کہنے لگے، ''اس کے بعد چاہو تو مسجد بھی دیکھ آنا۔''

ہم نے سن رکھا تھا کہ یہ مسجد خود مصطفیٰ صاحب کی نگرانی میں تعمیر ہوئی ہے اور اس کے ٹائلوں پر جا بہ جا بعد میں اللہ اور محمدؐ کے لفظ ابھر آئے ہیں۔

ہم نے مسجد کی سیر کی۔ نماز کا وقت نہیں تھا۔ مسجد خالی تھی ہاں ہم نے نفل ضرور ادا کیے۔ ایک بچے نے رہنمائی کی اور ہمیں ان ٹائلوں کی زیارت کرائی جہاں یہ معجزہ رونما ہوا ہے۔

جالبی صاحب نے ہمیں بتا رکھا تھا کہ مصطفیٰ صاحب کے پاس جنات کا بھی آنا جانا ہے اور کئی جن تو ان کے قابو میں ہیں جن سے وہ کام لیتے ہیں۔ جی چاہ رہا تھا کہ ہم جنوں کے بارے میں ان سے کچھ سوال کریں، لیکن ہمیں جالبی صاحب نے ایسا کرنے سے منع

گزر رکھا تھا۔ سو، ہم نے اپنی ساتھیوں سے کہا کہ کوئی ایسا سوال نہیں کرنا ہے۔ اس بار بھی سب نے اپنی اپنی ضروریات بیان کیں اور مصطفیٰ صاحب نے ہر ایک کو دعائیں بتائیں۔

مصطفیٰ صاحب کی صحت روز بہ روز گر رہی تھی۔ کم زوری کے باعث دیر تک نہیں بیٹھ پاتے۔ خالد صاحب نے اشارے سے ہمیں اٹھ جانے کا بھی کہا، لیکن مصطفیٰ صاحب نے ہمیں اصرار کر کے کچھ دیر اور بٹھایا۔ بتایا کہ سائلوں سے ملنا اب دشوار ضرور ہو گیا ہے، لیکن ہر سائل کے لیے تہجد کے بعد انھیں دعاؤں میں شریک کر لیتے ہیں۔ ملنے والوں میں ہندو اور عیسائی بھی ہوتے ہیں جنھیں وہ دعائیں اور وظیفے تو نہیں بتاتے بس دم کیا ہوا پانی دے دیتے ہیں۔ میں نے خود اپنی ایک ہندو دوست جو حیدرآباد ہی میں رہتی تھی، پوچھا کہ اسے ان کی دعاؤں اور دم کیے ہوئے پانی پر اعتماد کیوں ہے؟ تب اس نے جواب دیا تھا کہ ان کے دیے ہوئے پانی سے بہت سارے غیر مسلموں کو فائدہ ہوا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ کئی ایک پر سایہ یا جنات سوار ہو گئے تھے جنھیں ان کے عملیات نے چھٹکارا دلایا ہے۔

ہاں میرے ساتھ بھی ایک ایسا واقعہ ہوا ہے جسے میں ضبطِ تحریر میں لانا چاہتی ہوں۔ میری ایک عزیزہ کے پاس سو دانوں کی گز بھر لمبی تسبیح تھی جسے وہ صبح سویرے آفس جاتے ہوئے پڑھتی جاتی تھی۔ اس کے لیے ایک علاحدہ پرس رکھتی تھیں کہ اس تسبیح کے لیے زیادہ جگہ درکار تھی۔ ایک دن وہ تسبیح پرس سے غائب ہو گئی۔ انھوں نے اپنے دفتر اور اور گھر کو کھنگال ڈالا، مگر نہیں ملی۔ چھوٹی سی کوئی چیز تو تھی نہیں کہ چھپ سکتی وہ بہت اداس تھیں ذکر ہم سے کیا۔ مجھے کچھ شک گزرا۔ مصطفیٰ صاحب کو ایک خط تحریر کیا۔ اسی خط کے دوسری طرف ان کا جواب ڈاک سے موصول ہوا۔ لکھا تھا: ''اُسی پرس میں تلاش کرو۔''

ہمیں جواب سے مایوسی ہوئی کہ انھیں تو کوئی دعا بتانی چاہیے تھی یا صاف بتا دیتے کہ وہ کون لے گیا، کہاں گئی، پرس میں ہونا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ جو کئی بار جھاڑا جا چکا تھا پھر وہ پاؤ بھر کی تسبیح کسی کونے میں چھپ بھی تو نہیں سکتی تھی۔

بہرحال ایک طرف پڑا ہوا خالی پرس اٹھایا تو وہ وزنی محسوس ہوا، کھول کر دیکھا تو تسبیح اس میں موجود تھی۔

جوابی خط کو دوبارہ کھول کر پڑھا تو ایک طرف کونے میں تحریر تھا۔ راستے میں صبح سویرے جنات کا گزر تھا، انھیں یہ پسند آ گئی تھی وہ انھوں نے اُچک لی تھی۔ گویا انھیں مصطفیٰ صاحب کی طرف سے ڈانٹ پڑی تو واپس کر گئے۔ اب مصطفیٰ صاحب کے بارے میں اور کیا کچھ تحریر کر سکتی ہوں۔

۹۳ر برس کی عمر میں جب ان کا انتقال ہوا تب لگا کہ جیسے ایک فرشتہ آسمان سے اترا اور پھر آسمان ہی کی طرف پرواز کر گیا۔ ہاں یہ تو ہے کہ جو دنیا میں آیا ہے، وہ اللہ کے حکم سے آیا ہے اور اسے ایک دن اللہ ہی کے حکم سے اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔

O

اللہ خیر کرے گا... حسنین کاظمی

یہ فیصلہ کہ ہمارے ماں باپ، بہن بھائی اور دوسرے رشتے کون لوگ ہوں گے، یہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ دوست ہم اپنی طبیعت اور افتاد کے مطابق خود چنتے ہیں اور استاد ہمارے نصیب سے ہمیں ملتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں، لیکن بظاہر وہ لوگ جو ہماری پیدائش کے بعد ہماری زندگی میں آتے ہیں، اس کے ذمے دار ہم ہی ہوتے ہیں۔

میں اگر زندگی کا تجزیہ کروں تو اپنے آپ کو بے حد خوش نصیب مانتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے نیک نام خاندان اور قابلِ ذکر والدین دیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بے انتہا کرم ہے۔

جو دوست میری زندگی میں آئے اور جنھیں میں نے اپنے سے قریب جانا، جن سے دل کی باتیں کہیں، جن کے ساتھ خوب صورت زندگی گزاری، وہ میرے بہترین رفیق ثابت ہوئے۔ جن سے میں نے کبھی دھوکے نہیں کھائے، جنھوں نے میرا دل کبھی نہیں دُکھایا، جو میرے ساتھ زندگی کے نرم گرم دنوں میں میری سانسوں کے ساتھ ساتھ رہے اور پھر تعلیمی زندگی میں جتنے بھی استاد ملے جنھوں نے مجھے علم کی الف بے سکھائی، بڑے بڑے فارمولے یاد کروائے اور زندگی گزارنے کے درس دیے، وہ سب نامی گرامی استاد تھے۔

بہت چھوٹی کلاس سے شروع کروں تو وہ استانیاں جن کے نام بہت مشہور نہیں تھے،

لیکن جن کے درس دینے کا طریقہ دل چھو لینے والا تھا۔

اسکول کے اساتذہ تو کمال کے تھے۔ اگر صرف ایک نام صفیہ خان کا لے لوں تو سب پر بھاری ہوگا جو اپنے وقت میں اپنے شہر کراچی میں رول ماڈل کا درجہ رکھتی تھیں۔ جنھوں نے نہ صرف کلاس روم لیکچر ہی دیے بلکہ قدم قدم چلنا، پہننا اوڑھنا، ہنسنا، بولنا، کتابوں کا چناؤ، رشتوں کا نبھاؤ اور زندگی گزارنے کی باریک سے باریک باتیں ہماری گھٹی میں ڈال دیں۔ ہمیں ایک منفرد منتظم اور قبول کی جانے والی عورت بنا ڈالا جو اپنے گھر کو انتہائی سگھڑاپے سے چلاتی ہے۔ ان کی تربیت ہر طالب علم کے لیے یکساں تھی۔ اب ہم میں سے کس نے کتنا سیکھا، یہ اپنا اپنا ظرف تھا۔ کالج میں آئی تو ایسے ایسے اساتذہ ملے جو اپنے اپنے مضامین میں یکتا تھے۔ پروفیسر حسن عادل، مجتبیٰ حسین، حسن مثنیٰ ندوی، پروفیسر احمد علی، یحییٰ سلام اللہ، ظفر عمر زبیری، شمس الحق، سیّد مظفر اور پروفیسر حسنین کاظمی۔

قاضی فرید، پروفیسر خورشید احمد، شریف المجاہد، ذکریا ساجد، فرمان فتح پوری اور انجم اعظمی جیسے اساتذہ جو یونی ورسٹی میں ملے، نہ صرف زندگی گزارنے کا سلیقہ دیتے ہیں، بلکہ اڑ اڑ کر آسمان سے تارے توڑ لانے کے گُر بھی سکھاتے ہیں۔ میں اپنی یادوں میں سب کو ہر دم شامل رکھتی ہوں۔ ان کے لیے دعاے خیر چاہتی ہوں اور گزر جانے والے تمام اساتذہ کے لیے بلند درجات کی اللہ سے استدعا بھی کرتی ہوں کہ یہ میرا فرض اور اُن کا حق ہے۔

حسنین کاظمی سے میں نے صرف دو سال نیشنل کالج میں اردو پڑھی۔ گنج ہاے گراں مایہ پڑھاتے ہوئے جب انھوں نے میرے والد پر لکھا جانے والا مضمون شروع کیا تب میں نے اٹھ کر کچھ سوالات کر ڈالے اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ نے ابتدائی جملے ہی نہیں سمجھائے تو آپ آگے کیا پڑھائیں گے؟ انھوں نے تحمل سے میری نو جوانی والی سرکش گفتگو سنی۔

''پھر آپ ہی سمجھا دیں تو بہتر ہوگا۔'' انھوں نے کہا۔

ساتھی طالب علموں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ کچھ نے میرا ساتھ دیا اور کچھ نے اُن کا، مگر میں بالکل بھی نہیں گھبرائی۔ رشید احمد صدیقی علی گڑھ سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں کے خاکے لکھتے وقت بھی علی گڑھ کی فضا کو ان کی شخصیت میں گوندھ کر بیان کیا ہے۔

''بھونپو بے وقت بجا، دل دھک سے ہو گیا۔''

اس جملے سے شروع ہونے والا خاکہ میرے والد کا ہے اور رشید صاحب ان کے استاد تھے۔ استاد نے اپنے شاگردِ خاص پر دل کی روشنائی میں قلم ڈبو ڈبو کر لکھا ہے۔ جو علی گڑھ کی فضا سے آشنا ہے وہ ان کی تحریر کے مزے زیادہ بہتر طور پر لے پاتا ہے۔ یونی ورسٹی سے متعلق کسی بھی شخص کا انتقال ہوتا تب بے وقت سائرن بجا کرتا۔ جتنا بڑا شخص ہوتا اتنی دفعہ سائرن بجتا جسے وہاں کی زبان میں بھونپو کہتے۔ بھونپو بجتے ہی دل دھک سے ہو جاتا۔ کوئی نہ کوئی گزر گیا ہے۔

بے باکی اور بہادری سے کلاس میں یہ جملہ سمجھاتے سمجھاتے میرے آنسو چھم چھم برسنا شروع ہو گئے۔ حسنین کاظمی دونوں کیفیتوں سے متأثر تھے۔ میرے آنسوؤں سے بھی اور میری تقریر سے بھی۔ جب انھیں پتا چلا کہ یہ خاکہ میرے والد کا ہے تب انھوں نے مجھے محبت اور اپنائیت سے دیکھا۔ گھنٹا بج گیا۔ وہ کلاس سے چلے گئے، لیکن ہم دونوں کے درمیان ایک اچھا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ تقدیر نے بعد کے پچاس سال بھی ہمارے ملنے ملانے کے لیے رکھ دیے تھے۔ جس سال میں نے ایم اے پاس کیا، اسی سال علامہ اقبال کالج کراچی قائم ہوا۔ مجھے ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں'' سے نکال کر وہ اپنے قائم کردہ کالج میں لے گئے اور مجھے شروع ہی میں وہ ذمے داریاں سونپ دیں جو بہت تجربے کے بعد اساتذہ کو ملتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے میں نے ہرا گاؤن پہن لیا۔

ان کے اعتماد نے مجھے کام کرنے اور بہتر کام کرنے کا حوصلہ بخشا۔ میں وہاں استاد تھی اور وہ پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے۔ شاگردی کی قیمت میں نے کتنی بار چکائی اور استادی کا حق انھوں نے کیسے کیسے جتایا اور اکثر ترس کھا کر یہ بھی کہتے رہے کہ اس بے چاری کو تو اس درس گاہ میں استاد بننا بھی نصیب نہیں ہوا۔

ان ہی دنوں انھوں نے ''جنگ'' اخبار میں کالم لکھنے شروع کیے جو شروع شروع میں، میں ہی پہنچاتی رہی۔ اسے بھی میں اپنے لیے اعزاز سمجھتی تھی۔

حسنین صاحب تحریکِ پاکستان، استحکامِ پاکستان، اقبال اور اسلام کے گرد اپنے قلم کو

گھماتے رہتے ہیں۔ پاکستان سے محبت، قائداعظم سے عقیدت اُن کی نس نس میں سمائی ہوئی ہے۔ بے حد مخلص، بہت نفیس انسان، شرافت اور پرانی تہذیب کی زندہ علامت ہیں۔ اپنی ذات سے انھیں بالکل محبت نہیں۔ انھوں نے بہت شہرت پائی، لیکن کبھی اس کے جال میں نہیں پھنسے۔

وہ بحیثیت استاد بہت کامیاب تھے، مگر پرنسپل کی حیثیت سے ایک ناکام پرنسپل تھے کہ وہ مروّت کے آدمی تھے۔ اس لیے اچھے منتظم نہیں تھے۔ اس بات سے وہ خود بھی آگاہ تھے۔ اکثر کہا بھی کرتے، ''یہ منصب میرے لیے مناسب نہیں ہے، میں اسے خوبی سے نہیں نبھا سکتا۔''

کسی استاد کو دیر سے آنے پر ٹوک نہیں سکتے تھے۔ کوئی کلاس نہ لے اس سے پوچھ نہیں سکتے تھے۔ کوئی وقت سے پہلے چلا جائے باز پرس نہیں کر سکتے تھے۔ اکثر جب اسٹاف روم میں مل کر بیٹھتے یہی کہتے، ''میں جانتا ہوں کون کیا کر رہا ہے، غلط کر رہا ہے۔ اسے ایسے نہیں کرنا چاہیے۔ یوں طالب علموں کا نقصان ہوتا ہے اور ادارے کی بھی بدنامی ہوتی ہے، لیکن کیا کروں اپنے سے برابر استاد کو کیسے ٹوکوں۔''

مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ جب معاملات بڑھ جاتے تب وہ اسٹاف روم میں آ کر کھڑے ہو جاتے اور ان کی مخاطب میں ہوتی۔

''بھئی آج آپ نے کلاس نہیں لی؟'' یہ کہتے ہوئے انھیں خود بھی محسوس ہوتا کہ وہ یہ بات دل سے نہیں کہہ رہے ہیں۔

میں چونک کر ان کی جانب دیکھتی۔ جھٹ کھڑی بھی ہو جاتی۔ لگاتار تین پیریڈ لینے کے بعد جب یہ جملہ ملے تو کتنی جھنجھلاہٹ ہوگی، مگر میں چپ رہنے پر مجبور ہوتی۔ وہ یہ جملہ ادا کر کے جلدی سے لوٹ جاتے۔

کچھ اساتذہ شک سے میری جانب دیکھتے۔ کچھ حقیقت جانتے ہوئے حیران بھی ہوتے، مگر میں زمین میں گڑی ہی رہتی۔ بھلا کسی استاد کی اس سے بڑھ کر اور کیا بے عزتی ہوگی کہ وہ کلاس نہ لے اور اسے بھرے اسٹاف روم میں ٹوک بھی دیا جائے۔ ایک بار دو بار تین بار اور لگاتار ایسا ہی ہوتا اور ہوتا رہا۔

ایک دن رہا نہیں گیا۔ آنکھوں میں آنسو لیے پرنسپل آفس میں ان کے مقابل جا

کھڑی ہوئی۔ نظریں نیچی اور آواز بھی دھیمی، مگر ہاں اس میں احتجاج ضرور تھا۔

''سر آپ ہمیشہ مجھے ہی کیوں ٹوکتے ہیں، جب کہ.....''

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے بول پڑے، ''ہاں مجھے معلوم ہے تم کبھی کلاس نہیں چھوڑتی ہو، مگر میں دوسروں کو نہیں ٹوک سکتا۔''

وہ اٹک اٹک کر جملہ پورا کررہے تھے، ''تم پر مجھے اختیار ہے، سب پر تو نہیں۔''

میری آنکھوں سے سارے آنسو ایک ساتھ ٹپک پڑے، واپس لوٹ آئی۔ ایسا ہوتا رہا کہ ان کا صرف مجھ پر اختیار تھا۔

دوسری جانب ہر کام کی ذمے داری میری ہوتی۔ یوں میں انجمنِ طالبات کی نگراں بنادی گئی کہ ابھی میں جونیئر ٹیچر ہی تھی، لیکن ان کے اعتماد نے مجھے ہمیشہ سرخ رو کیا۔ جب سالانہ میگزین کی نگراں بنائی گئی تب کئی سینئر اساتذہ کی طرف سے اعتراض ہوا خاص طور سے اردو اور انگریزی اساتذہ نے احتجاج کیا کہ روایتاً یہ ان کا حق ہے، لیکن تب انھوں نے کہا صحافت اور تحریر کا تجربہ میرا ان سب سے زیادہ ہے۔ ایسے موقعے پر میری حمایت کرنے میں وہ ڈٹ کر کھڑے تھے۔ اعتراض کرنے والوں نے سر جھکا دیے۔

کالج قیام کے شروع سال تھے۔ کالج کی طالبات نے بین الکلیاتی مقابلوں میں شرکت کرکے لگاتار اتنے انعامات حاصل کیے کہ ہمارا کالج صفِ اوّل کے کالج میں شمار کیا جانے لگا۔ تب وہ خوش تو بہت ہوئے۔ ہر طرف سے میری محنت پر تعریفی جملے ملے، مگر ان کی جانب سے ایک جملہ بھی میرے حصے میں نہیں آیا، لیکن میں مطمئن تھی کہ مجھے معلوم تھا کہ ان کی خاموشی میں میرے لیے تحسین ہی تحسین ہے۔

ایک بار ایک اخبار کے رپورٹر نے طلبہ کے صفحے پر خبر لگائی۔

علامہ اقبال گرلز کالج کی پرنسپل تقریر کررہی ہیں۔ تصویر میری تھی۔ کالج گرلز بوائز دونوں تھا اور دونوں کے پرنسپل حسنین کاظمی۔ لازمی تھا کہ مجھے خوف محسوس ہو۔ میں پرنسپل کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ وہ سمجھیں گے کہ خبر میں نے خود لگوائی ہے۔

ڈرتے ڈرتے کالج گئی۔ ڈگمگاتے قدموں آفس میں داخل ہوئی۔ حاضری لگاتے

ہوئے انگلیاں بھی کانپیں، مگر وہ اپنی کرسی سے فوراً اٹھ کر مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

''آیئے پرنسپل صاحبہ کرسی حاضر ہے۔''

''سر میں نے یہ خبر نہیں لگوائی ہے۔ شریف کمال عثمانی کی شرارت ہے۔''

''ہاں بھئی میں جانتا ہوں صحافت کے راستے آنے کا فائدہ یہی تو ہے۔ ساتھی صحافی مرتبے میں اضافہ کر دیتے ہیں۔''

ان کے لہجے میں طنز ہرگز بھی نہیں تھا کہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ ان دنوں ہر اخبار میں طلبہ کے صفحے کے نگراں ہمارے کلاس فیلو ہی تھے۔

مگر اس واقعے کا ذکر میں اس لیے کر رہی ہوں کہ بتا سکوں اگر کوئی دوسرا پرنسپل ہوتا تو اسے یوں نہ لیتا جیسا حسنین صاحب نے لیا تھا۔

علامہ اقبال گرلز کالج علاحدہ سے کوئی کالج ہرگز نہیں تھا، مگر ہوا کچھ یوں کہ آگے جا کر میرے ہی ہاتھوں یہ گرلز کالج بھی بنا اور پہلی پرنسپل بھی میں ہی بنی۔

اور اس دن میں نے ''حریت'' اخبار کے شریف کمال عثمانی کو بہت یاد کیا جو بہت کم عمری میں صحافت ہی کیا دنیا بھی چھوڑ چکا تھا۔ مجھے اس کی شرارت پیش گوئی محسوس ہوئی۔

ایک بار سالانہ تقریب کے موقعے پر وہ کسی قدر جھنجھلائے ہوئے تھے۔ طالبات کے ہجوم میں انھیں میں نظر آئی۔ سارا غصہ انھوں نے مجھ پر اتار دیا، جب کہ ان کی جھنجھلاہٹ کی میں ہرگز ذمے دار نہیں تھی۔

طالبات کے سامنے میری سبکی ہوئی تھی۔ اسٹاف روم میں آ کر خوب روئی۔ ہر ایک نے وجہ پوچھی، مگر حسبِ سابق میں نے وجہ نہیں بتائی۔ پھر جب رونے سے بھی سکون نہیں آیا تب آفس پہنچ گئی۔

''سر میں آپ کی شاگرد ضرور ہوں۔ آپ کا مجھ پر حق بھی ہے۔ آپ سب کچھ کہہ سکتے ہیں، مگر یہاں کچھ میری بھی شاگرد ہیں۔ آپ نے ان کے سامنے جو کچھ کہا، وہ صحیح نہیں ہے۔ آپ نے میری عزت کا خیال نہیں رکھا۔'' جانے کیسے میں نے یہ جملہ ادا کر دیا۔

ان کی نظروں میں شرمندگی تھی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔''

اب تو غضب ہوگیا۔ ان کی معذرت نے مجھے اتنا شرمندہ کردیا کہ میں کھڑے کھڑے لڑکھڑا گئی۔ اب میں ان سے معافی مانگ رہی تھی۔

مجھے اپنے آپ پر غصہ تھا۔ مجھے برداشت کرلینا چاہیے تھا۔ ہفتوں اپنے آپ کو معاف نہیں کرسکی۔

اس کے بعد جب بھی وہ اسٹاف روم میں آتے، کلاس نہ لینے والوں کا نام لینے کی ہمت نہیں پاتے چپ چاپ واپس چلے جاتے۔

سارا اسٹاف میری طرف دیکھ رہا ہوتا کہ وہ اسی طرح کے عادی تھے۔ تب مجھے لگا کہ میں ان کی شفقت، چاہت اور اپنائیت کھو بیٹھی ہوں۔

بہت سارے سال گزر گئے پھر انھوں نے اپنی مدتِ ملازمت پوری کرلی۔ جاتے جاتے بھی انھوں نے کوئی جملہ اچھا یا شکوے والا ادا نہیں کیا۔ بس آہستگی سے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

ان کے جانے کے بعد کالج سونا ہوگیا۔ میں بڑی ہوگئی۔ اب دوسروں کی نگرانی پر فائز ہوچکی تھی، لیکن محسوس ہوا کہ کسی کا اپنے سے بڑا ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ اُن کے بغیر رہنا واقعی مشکل تھا کہ زندگی کے لگاتار بیس برس ان کے ساتھ صبح و شام کیے تھے۔ بہانے بہانے سے انھیں کالج بلاتی اور خود بھی ان کے گھر جانا شروع کردیا۔ دونوں موقعوں پر ان کی نرم طبیعت، ان کی شفقت، ان کی گفتگو میرے اندر ڈھیروں توانائی بھر دیتی۔

خوش رو، خوش لباس، خوش گفتار، حسنین صاحب اب خرابیِ صحت کے نرغے میں رہنے لگے تھے۔ میں جلدی جلدی ان سے ملنے جانے لگی۔ ہر بار میں نے محسوس کیا وہ پگھل رہے ہیں۔ ڈھل رہے ہیں۔ ڈرائنگ روم تک آتے آتے تھک جاتے۔ میں کہتی، آپ اٹھ کر نہ آیا کیجیے۔ آپ کو آنے میں دِقت محسوس ہوتی ہے۔ کمالِ شفقت سے کہتے، ''ایسا نہ سوچو، تم آجاتی ہو میں اپنے آپ میں طاقت محسوس کرنے لگتا ہوں۔''

ان ہی دنوں میں نے سوچا، ان کے لیے میں نے آج تک کیا کیا۔ مجھے کچھ کرنا چاہیے کہ وہ میرے استاد رہے ہیں۔ میں ان کی مقروض ہوں۔ تب میں نے ان کے لکھے ہوئے کالموں کو جمع کرنا شروع کیا۔ سوچا کتابی شکل دے دوں۔ یہ کام خاصا مشکل یوں تھا کہ خود ان کے پاس چند کالموں کے سوا کچھ بھی محفوظ نہیں تھا۔ وہ تو اپنے آپ سے ہمیشہ ہی غافل رہے۔ علمیت، محبت، خلوص، رواداری، تہذیب، شائستگی میں وہ شہر بھر کی مقبول ترین شخصیت تھے۔ اُن کے شاگرد بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے، مگر انھوں نے اپنے یا اپنے بچوں کے لیے کبھی کوئی رعایت نہیں چاہی۔ یہ نہیں کہ انھیں ضرورت نہیں تھی بس ان میں بلا کی خودداری تھی۔ شہرت کی چاہت سے وہ ہمیشہ دور رہے۔

مختلف لائبریریوں اور جنگ اخبار کے دفتر کے چکر لگائے۔ یوں ایک دن میں ''دلِ شوریدہ'' لے کر ان کے حضور کھڑی تھی۔ وہ موقع، وہ لمحہ، وہ دن میری زندگی کا بہت اہم دن تھا۔ میرے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''تم نے مجھے مقروض کردیا۔'' انھوں نے یہ جملہ کیوں ادا کیا مجھے نہیں معلوم، مگر میں نے اپنا قرض چکانے کی چھوٹی سی، تھوڑی سی جو کوشش کی تھی اس پر میں بہت خوش تھی۔

علم حاصل کرنے، تعلیم دینے اور ادب و آداب سیکھنے کے ان تمام دنوں کے نام جو آدھی صدی پر محیط ہیں۔ یہ تمام خوب صورت اور قابلِ ذکر لمحے محترم حسنین کاظمی کے ساتھ گزرے۔

بحیثیت شاگرد، بحیثیت ساتھی استاد اور پھر آج تک کے تمام دن جو ناقابلِ فراموش بھی ہیں، قابلِ فخر بھی اور بامعنی زندگی کی ضمانت بھی۔

یہ انتساب تھا اس کتاب کا جو ان کی تھی جسے میں نے تحریر کیا تھا۔ انھیں پسند آیا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں جو آنسو دیکھے وہ سب کے سب اس خواہش سے جڑے تھے کہ کاش وہ اپنی تحریروں کو خود یک جا کرپاتے اور اس تشکر کے بھی ترجمان تھے کہ اسے انھوں نے

میرے ہاتھوں پورا ہوتے دیکھا۔

''شکریہ سر۔'' میں نے سر جھکا کر کہا۔

''شکریہ نوشابہ۔'' انھوں نے سر اٹھا کر کہا۔

اگر میں خود کتاب کا نام رکھتا تب بھی اتنا بامعنی اور خوب صورت نام نہ رکھ پاتا۔ انھوں نے اقبال کا شعر پڑھا جو انھیں اب بھی یاد تھا:

ہوئی ہے تربیت آغوشِ بیت اللہ میں تیری
دلِ شوریدہ ہے لیکن صنم خانے کا سودائی

انھوں نے باآواز بلند اقبال کا بس یہی آخری شعر پڑھا تھا کہ اس کے بعد ان کے جسم کی نقاہت بڑھتی گئی۔ میں نے جلدی جلدی جانا شروع کردیا۔ انھوں نے تیزی سے ڈھلنا شروع کردیا۔ اب وہ اپنے کمرے سے چل کر نہیں آپاتے، بلکہ بستر پر لیٹے لیٹے ملتے، کبھی جاگتے ہوئے، کبھی غنودگی میں۔

کئی بار ایسا ہوا کہ میں کھڑی رہی، وہ آنکھیں بند کیے رہے۔ ان کی بیگم نے جھک کر سرگوشی کی۔

''دیکھیے کون آیا ہے؟''

پلکیں ہلیں کم زور آواز میں بولے، ''نوشابہ ہوگی، اللہ خیر کرے۔''

اب ہر بار ایسا ہی ہوتا، کبھی آنکھیں کھلی ہوتیں، کبھی بند ہوتیں۔ انھیں آزمایا جاتا، ''پہچانتے ہیں یہ کون ہیں؟''

لب مسکرانے کی کوشش کرتے، ''میں اسے نہیں پہچانوں گا۔ اللہ خیر کرے''

''اللہ خیر کرے'' کی گردان بڑھتی گئی، وہ کم سے کم ہوتے گئے۔ اسپتال گئے، اسپتال سے گھر آگئے اور پھر گئے۔ آئی سی یو میں کئی چہرے کئی بیڈ پر لیٹے تھے۔ کوئی اگر مجھ سے پوچھتا، پہچانو اس میں سے کون ہیں تمھارے استاد؟

تب میں پہچاننے کی کوشش میں لگ جاتی۔ کیسے پہچانوں، نہ وہ رنگ نہ وہ روپ، نہ مسکراہٹ نہ سنجیدگی، نہ محبت، نہ شفقت، کہاں گئیں ان کی یہ ساری صفات۔

میں نے تو بس ہر بار یہی کہا، اللہ خیر کرے۔

بیماری سارے نقوش بدل کر رکھ دیتی ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص کبھی کتنا شان دار استاد رہا ہوگا۔ خوب صورت، باوقار، صاف ستھرا، شیروانی جس کی پہچان تھی، مروت میں ڈوبی ہوئی آواز، اب وہ ایک لفظ بھی ادا کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ کہاں گیا کلاس روم کا وہ دھواں دار لیکچر، ''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل'' کے اشعار، علامہ اقبال، اسلام، پاکستان، قائداعظم، یہ چار محبتیں، دل کے ہر کونے میں جذب ہو کر رہ گئیں تھیں۔

میں پھر بھی زیرِلب ان سے پوچھا کرتی، ''بتایئے میں کون ہوں؟''

وہ خاموش رہتے۔ آدھی صدی کی قربت کتنی دوری میں بدل رہی تھی۔

کوئی مجھ سے پوچھتا میرے دل میں کون سا طوفان بپا تھا؟ کہاں کہاں درد تھا۔ کہاں کہاں سسکیاں چھپی تھیں؟

کرتی کیا بس ان کی ہی دعا انھیں لوٹاتی رہی، اللہ خیر کرے۔

اور پھر اللہ نے خیر کیا۔ انھیں اپنے پاس بلالیا۔

پھر جب ان کا ورثہ تقسیم ہونے لگا تب سوائے چند کتابوں، ایک قلم اور کلائی کی گھڑی کے بانٹنے کے لیے ان کی کوئی جائیداد نہیں تھی۔

قلم، گھڑی اور کتابیں تینوں چیزیں میرے حصے میں آ گئیں۔

کتابیں علامہ اقبال کالج کی لائبریری پہنچ گئیں کہ طالبات اس کی حق دار تھیں، میں نے یہی سمجھا۔ قلم اور گھڑی میرے پاس ہے۔ قلم کی سیاہی آخری کالم لکھنے کے بعد خشک ہو چکی تھی۔ گھڑی بارہ بج کر پانچ منٹ پر برسوں پہلے بند ہو چکی تھی۔ یقیناً یہ رات کا وقت رہا ہوگا کہ بس اُسی وقت زندگی کی چھٹی کی گھنٹی بجی تھی۔ اللہ نے خیر کیا تھا۔ یہ بات حیرت ناک

تھی اور یہ بات بھی حیرت ناک تھی کہ چاروں بچوں نے والد کی کُل جائیداد خود لینے کے بجائے اپنے باپ کی ایک شاگرد کے ہاتھوں میں خوشی خوشی تھمادی تھی تب ان کی شریکِ حیات نے مجھے گلے سے لگا کر اپنے ڈھیر سارے آنسو میرے کندھے پر بہادیے۔

''اپنے استاد کے لیے دعا کرتی رہنا۔ کہتی رہنا، اللہ خیر کرے۔''

میں نے جواباً کہا، ''ہاں اللہ خیر کرے گا۔''

میرے دونوں کندھوں سے اُترا ہوا ہرا گاؤن بھی یہی کہہ رہا تھا، استادِ محترم! اللہ خیر کرے گا۔

بے حد سنجیدہ... یوسفی صاحب

شہر کراچی پر بڑا پیار آتا ہے اگرچہ ہجرت کر کے یہاں آئے تھے یا یوں کہیے لائے گئے تھے۔ آباؤ اجداد کی کہانیاں اور کامرانیاں پڑھنے کو ملیں تو خود پر غصہ آیا۔ یہاں کیا کرنے آ گئے؟ وہاں رہتے تو حسب نسب تو قائم رہتا۔ خود کچھ نہ بھی ہوتے کہلاتے تو فلاں بنتِ فلاں بنتِ فلاں۔ یہاں تو ہم جو کچھ بھی ہیں بس ہیں۔ پھر ہم خود کچھ بن بھی کیا پائے؟ لیکن جب بڑے ہوئے تھوڑی سی سمجھ آئی جس پر آج تک گزارا کر رہے ہیں، کراچی سے محبت ہو گئی۔ یہ ہمارا پہلا پیار تھا اور آج تک قائم ہے۔ وجہ بس یہی ہے کہ کراچی سارے ہندوستان کو اُجاڑ کر آباد ہوا ہے۔ شہر شہر کے لوگ اپنا ماضی چھوڑ کر یہاں آ بسے اور اپنا مستقبل بنانے لگے، لیکن کسی نے بھی اپنے آباو اجداد کے شہروں سے رشتہ توڑا نہیں۔ کسی نے اپنے نام کے ساتھ رام پور لگایا، کسی نے دہلوی، کسی نے کان پوری، کسی نے بجنوری، کسی نے لکھنوی، کسی نے بھوپالی یا بریلوی۔ درجنوں شہر یہاں مشاہیر کے نام کا حصہ بن گئے۔ بس یہی ان کا ماضی تھا جسے وہ لے کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کوئی کسی کو ذرا سا چھیڑ دے آبگینوں کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ تب داستان کا آغاز ہو جاتا ہے۔

ماضی یوں بھی حسین گنا جاتا ہے اور آباو اجداد کو دیکھے بغیر فخر و مسرت کا دریا سا بہنے لگتا ہے۔ کتنوں کے تو ہم قریب بھی نہیں گئے اور یہ پتا بھی نہیں چل پایا کہ وہ لوگ کس شہر کو

چھوڑ کر آئے ہیں۔ کسی تقریب میں ان پر گفتگو ہوئی تو بھید کھلا۔ کراچی نہ آتے تو اتنے ڈھیر سارے شہروں کے لوگوں کو یک جا بھلا کیسے دیکھ پاتے؟

مدت ہوئی ایسا ہی ایک شخص کے بارے میں پتا چلا کہ وہ جے پور کے رہنے والے ہیں اگرچہ ٹونک میں پیدا ہوئے۔ یہ بات بہت مدت پہلے کی ہے کہ ہم اس وقت چھوٹے تھے اور ادب سے دل چسپی پیدا کر رہے تھے۔ وہ صاحب اسٹیج پر تشریف فرما تھے اور میں سامنے کی قطار میں بیٹھی ایک ٹک انھیں دیکھے جا رہی تھی۔ اپنے آپ ان کے بارے میں رائے قائم کر لی تھی کہ یہ نحیف و نزار شخصیت لگتا ہے ''ستوانسے'' کی ہے۔

میرے بائیں جانب بیٹھی خاتون اچک کر بولیں، یہ ستوانسا کیا ہوتا ہے؟

مجھے حیرت یہ ہوئی کہ میں نے ان شخصیت کے بارے میں جو لفظ استعمال کیا تھا وہ خودکلامی میں تھا۔ جسے ظاہر ہے صرف میں ہی سن بھی سکتی تھی، لیکن جواب نہیں ان خاتون کا کہ خود سے کی گئی گفتگو بھی وہ سن سکتی ہیں۔

اب جواب دینے کی باری میری تھی۔ وہی جو بچہ صرف سات ماہ میں بے چین ہو کر ماں کی گود میں آ ٹپکے۔

انھوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ آپ نے ان کے دبلے پتلے جسم کو دیکھ کر یہ اخذ کر لیا ہے۔ ایسے تو درجنوں لوگ اس تقریب ہی میں موجود ہوں گے۔ کیا وہ سب کے سب ستوانسے ہیں۔ یہ لفظ انھوں نے بدقتِ تمام ادا کیا۔ پھر مجھ پر نظریں دوڑا دیں وہ اپنی رائے کو دلیل سے معتبر کرنا چاہتی تھیں۔

مجھے دوسروں سے کوئی سروکار نہیں صرف ان ہی صاحب سے ہے جو اس وقت لمبی چوڑی اونچی کرسی میں دھنسے نظر آ رہے ہیں۔

انھوں نے بُرا مانا۔ ان صاحب سے کیا مراد ہے؟ آپ جانتی ہیں یہ مشتاق احمد یوسفی صاحب ہیں ''چراغ تلے'' والے۔

ابھی وہ مزید تعارف کرانا چاہ رہی تھیں کہ مجھے یہ بتانا ضروری محسوس ہوا کہ میں بھی ان کی تحریروں کی قاری ہوں۔ مجھے آپ نے کیا سمجھ رکھا ہے؟ لیکن مائک پر نظامت کار کی آواز

گونجی تب میں نے صرف خاموش رہ جانے پر خود کو آمادہ کرلیا۔ وہ صاحب یوسفی صاحب کا تعارف کرا رہے تھے۔ یوسفی صاحب راجستھان ضلع ٹونک میں پیدا ہوئے جہاں کے خربوزے بھی مشہور ہیں۔

''آپ کی تاریخِ پیدائش ۴؍ستمبر ۱۹۲۳ء ہے۔ آپ کی مادری زبان مارواڑی ہے اردو بدقت سیکھی۔''

ہرگز نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ بائیں جانب بیٹھی خاتون نے مائک پر بولنے والے صاحب کو جھوٹا قرار دینا شروع کیا۔

''اتنی اچھی اردو بولتے اور اس سے زیادہ اچھی اردو لکھتے ہیں یوسفی صاحب۔ کمال ہے صاحب، کمال ہے۔''

میں بائیں جانب والی خاتون کے مکالمے میں زیادہ مائک والے صاحب کے انکشافات سننے میں دل چسپی رکھتی تھی۔ ناگواری سے پہلو بدلا۔ دیکھا وہ خاتون بھی پہلو بدل رہی ہیں، بلکہ بدل چکی ہیں۔

یوسفی صاحب کہتے ہیں، یوں تو ٹھیٹ اہلِ زبان میں بھی ہوں، بشرطے کہ زبان سے مراد مارواڑی زبان ہو۔ اردو سیکھنے کے لیے انھیں سخت محنت کرنا پڑی۔ یوں تو صحت ہمیشہ سے خراب تھی، مگر صحبت ہمیشہ اچھی ملی۔ یوں اچھا بننے میں کوئی دقت نہیں اٹھانی پڑی۔

آپ کے چہرے پر اتنی ''مجلسی'' کیفیت کیوں طاری رہتی ہے؟ ان سے پوچھ لیا گیا۔

بھئی محرم میں پیدا ہوا تھا، اب کیا ہنستا مسکراتا پیدا ہوتا۔ کتنے ہی لوگ خفا ہوجاتے۔

آپ کپڑے بڑے نفیس پہنتے ہیں، ایک نے کہا۔

جی ہاں لباس کسی شخص کا وزیٹنگ کارڈ ہوتا ہے۔

لباس کون سا پسند ہے؟

دنیا میں وضع قطع کے ڈھیروں لباس ہیں۔ ہمیں دنیا کے وضع قطع سے کیا لینا دینا ہے۔ لباس تو مجبوراً پہننا پڑتا ہے، مگر آپ وضع قطع میں الجھنا پسند کرتے ہیں تو جواباً عرض ہے کہ کرتہ شلوار آرام دہ بھی ہے اور پھر پسندیدہ بھی، مگر تقاریب میں اہتمام ضروری ہوتا ہے کہ

اس پر ''ٹائی'' اور ''بو'' نہیں لگائی جا سکتی لہٰذا سوٹ پہن لینے میں کوئی حرج نہیں۔

آپ مارواڑی تو نہیں لگتے؟ سوال بڑا بے رحمانہ اور ہم دردانہ بھی تھا۔

''جی میں کسی کو بھی ویسا نہیں لگتا جیسا کہ میں لگنا چاہتا ہوں۔''

کچھ اپنی بیگم کے بارے میں بتائیں۔

بائیں جانب والی خاتون اس سوال پر جی بھر کے خوش ہوئیں۔ میں نے ایسا یوں جانا کہ وہ کرسی جس پر وہ جم کر بیٹھی تھیں ہل رہی تھی۔

''ہوتا یہ ہے کہ دلھن جب رخصت ہونے لگتی ہیں تب دل میں خواہ پھلجھڑیاں پھوٹ رہی ہوں، مگر رونے کی اداکاری خوب کرتی ہیں، مگر میری بیگم وقتِ رخصت بالکل بھی نہیں روئیں، حالاں کہ انھیں روایتاً ضرور رونا چاہیے تھا۔ چپ چاپ نکاح نامے پر دستخط کر دیے۔ رخصت ہوتے وقت سب کے گلے لگیں، مگر مجال ہے کہ آنسو ٹپکے ہوں یا جی ہی بھر آیا ہو۔ گاڑی میں سوار ہوئیں چپ چاپ تھیں۔ جب میں نے ان سے آہستہ سے کہا، منہ اوپر اٹھایئے آرام سے بیٹھ جایئے۔ آنکھیں کھولیے۔ یہاں دوسرا کوئی نہیں سوائے میرے، تب انھوں نے تابع داری کے ساتھ آنکھیں کھول دیں، بلکہ مجھ پر طائرانہ نظر ڈالیں اور پھر تو خوب پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ اب میں کیا کروں؟

ستوانسا ہوں، محرم میں پیدا ہوا جسمانی اعتبار سے نہ سوٹ میں سماتا ہوں نہ شلوار کرتے میں۔ سو، اب ان کے مقدر میں یا میں تھا یا میرا سراپا روتیں نہیں تو اور کیا کرتیں؟

کسی بڑی شخصیت سے اس کی پسند ضرور پوچھی جاتی ہے سو، ان سے بھی پوچھ لی گئی۔

''سانڈ، کھانڈ اور بھانڈ اور سلیم شاہی۔''

صاحب راجستھان بھی خوب تھا۔ مارواڑیوں کو جس چیز پر بھی پیار آجائے اس کے نام میں ٹھ، ڈ اور ڑ لگا دیتے ہیں۔ رانڈ سے مراد خوب صورت عورت ہوتی ہے۔ وہاں تو سب ہی عورتیں خوب صورت ہوتی ہیں۔ سو، پسند آ جاتی ہیں۔

راجستھان کی کوئی تین شخصیات کا نام بتائیں جو آپ کو بھی بہت پسند ہوں۔

''جی ہاں کیوں نہیں؟ میرا بائی، مہدی حسن اور ریشماں۔''

''کیا آپ کو یہ تینوں شخصیات پسند ہیں؟'' ان کا یہ سوال حاضرین سے تھا۔ بھلا کون میرا بائی، مہدی حسن اور ریشماں کا منکر ہوسکتا تھا۔

سب نے جی ہاں کہہ کر گردن یوں ہلائی گویا نکاح تمام ہوا۔

یہ آپ کے چہرے پر عینک جو سوار ہے کب سے اس نے ڈیرا جما رکھا ہے؟

''پانچویں جماعت میں قدم رکھنے سے پہلے ہماری عینک کا نمبر سات ہو چکا تھا۔''

کہتے ہیں آپ کے زمانے میں فارسی کا چلن تھا۔ ہر شریف مسلمان گھرانے میں اس زبان کا پڑھنا، سمجھنا اور بولنا ضروری تھا۔ آپ پر اس کے کتنے اثرات تھے؟

''جی خاندان تو بے شک شریف تھا، مگر ایک ادبی بدعت اور بدمذاقی میرے ساتھ یوں ہوئی کہ عاجز نے باقاعدہ فارسی صرف چار دن چوتھی جماعت میں پڑھی۔ آمدن نامے کی گردان اس قدر دہشت ناک تھی کہ اس سے بچ کر ڈرائنگ لے لی۔ ہر چند کہ اس میں گردان نہیں تھی، مگر مقاماتِ آہ وفغاں کہیں زیادہ نکلے۔

سنا ہے آپ گھڑی استعمال نہیں کرتے؟

''جی آپ نے صحیح سنا ہے، کبھی کبھار سنی سنائی بھی غلط نہیں ہوتی، بس جواب اتنا ہی کافی ہے۔''

یوسفی صاحب کا تعارف کرانے والے صاحب نے پوچھا، آپ کے بزرگ، آباواجداد نے ہجرت کی یا بس آپ نے ہی کی۔''

''کچھ نے کی۔ کچھ نے نہیں کی۔ ہمارے بزرگ جاہ ومال سے بے نیاز تھے، فقط ہمیں اپنی نشانی چھوڑ کر دنیا سے چلے گئے۔''

پھر وہ ماضی میں چلے گئے۔ ماضی میں جانا اچھا بھی لگتا ہے اور تکلیف دہ بھی ہوتا ہے، لیکن اللہ کا کرم یہ ہوتا ہے کہ وہ گزر جاتا ہے۔ ماضی جتنا جلدی گزر جاتا ہے حال اتنی ہی دیر تک موجود ہوتا ہے۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو ہم جے پور سے چلے، کراچی میں براہِ کھوکھراپار وارد ہوئے۔ وہ صبح ذہن پر آج بھی روشن صبح کے طور پر تحریر ہے کہ جب ریلوے لائن کے کنارے ایک چھوٹی سی سفید چمکتی تختی پر پہلے پہل پاکستان لکھا نظر آیا تو اسے ہاتھ سے چھو چھو کر دیکھا۔

ساربان دیکھے۔ ہندوستان کے نوٹوں پر پہلی دفعہ حکومتِ پاکستان چھپا دیکھا اور پھر ریگ زار راجستھان میں پُرکھوں کی قبریں، وہ بولی جو ماں کے دودھ کے ساتھ وجود میں رچی بسی تھی اور اپنے پیاروں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے، تیرگیِ امروز میں دھندلاتے چلے گئے۔

۱۹۵۰ء میں جنوری کی ایک ایسی ہی صبح کا ذکر ہے کہ کراچی میں یہ ہماری پہلی صبح تھی اور بس اسی صبح سے ہماری بینکاری سے یاری ہوئی جو ساری زندگی پر محیط ہے۔

ہم نے اپنے اس بینک کا ہیڈ آفس ڈھونڈ لیا تھا جہاں ہمیں اپنے نام کی پرچی جنرل منیجر صاحب کو بھجوانی تھی۔

نظامت کار نے انھیں روکا، مگر آپ نے بینک کی نوکری کو اپنے آپ پر فرض کیوں کرلیا تھا۔

آپ کچھ اور بھی تو کر سکتے تھے۔ بھلا فلاسفی جیسے مضمون کا بینک سے کیا جوڑ؟

خاتون غصے سے بولیں، ''یہ صاحب بیچ بیچ میں کیوں بولتے ہیں؟ کتنی اچھی باتیں کررہے تھے یوسفی صاحب۔''

ہم نے اپنی قابلیت جھاڑی، ''انٹرویو ایسے ہی ہوتا ہے۔ ورنہ تو یہ نری تقریر بن کر رہ جائے گی۔''

خاتون نے اب غصے سے ہمیں گھورا، ''یہ سوال کرنے والے صاحب آپ کو اچھے لگ رہے ہیں کیا۔ ہمیں تو زہر لگ رہے ہیں۔''

''کیا زہر ایسا ہوتا ہے؟ ہم نے تو پہلی بار دیکھا ہے۔'' انھوں نے پھر ہمیں گھورا۔

''زہر تو اب پینا ہی پڑے گا۔ آپ کو اچھا کون لگ رہا ہے؟'' ہم نے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے پانچ لوگوں کی طرف اشارہ کرکے ان کی پسند جاننی چاہی۔

''ظاہر ہے ہمیں تو صرف یوسفی صاحب ہی اچھے لگ رہے ہیں۔ ہم صرف ان کو ہی سننے آئے ہیں۔ دوسروں سے ہمیں کیا مطلب۔''

''یہ جو دوسرے ہیں وہ تیاری کرکے آئے ہیں یوسفی صاحب سے متعلق ہی بولیں گے۔ انھیں بھی سن لینے میں کوئی حرج نہیں۔ فی الحال ہم ان صاحب کو سن لیں جو سوال

کررہے ہیں۔'' میں نے بہت اپنائیت کے لہجے میں کہا۔

پگھل گئیں۔ جواب کچھ نہیں دیا۔ پرس سے چھالیا، سونف، الا ئچی نکال کر چبانے لگیں۔

بیچ کی کچھ گفتگو ہمارے مکالمے کے دوران نکل گئی تھی، لیکن سلسلہ یہاں سے سننے میں آرہا تھا جب یوسفی صاحب نے یہ بتادیا کہ:

''بچپن میں جب کبھی خیال آتا تھا کہ بڑے ہوکر کیا بنیں گے تو انجن ڈرائیور بننے میں بڑا رومانس تھا۔

مگر چوں کہ ہم نے کبھی کوئی بینک اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ تجسس تھا۔ دیکھنے چلے گئے۔ بینک کی تو تعریف بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ معاشیات کا مضمون تھا جسے ہم نے کبھی نہیں پڑھا تھا اور اسے مختار مسعود کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اور اچھا ہی کیا تھا کہ ان کے کلاس فیلو ہوکر ہم نے ہمیشہ دوسری تیسری یا چوتھی پوزیشن ہی حاصل کرنی تھی کہ مختار مسعود صاحب اللہ میاں کے یہاں سے اول آنے کا لکھوا کر لائے تھے، جب کہ فلاسفی ہمارے کسی کام آئی ہو، یا نہ آئی ہو مگر اوّل درجے پر فائز کرنے کا اعزاز اُسی کے سر جاتا ہے۔

بینک کے متعلق ہم بس اتنا جانتے تھے کہ یہاں قرض دیا جاتا ہے اور ان کو دیا جاتا ہے جنھیں اس کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ یہ نہیں پتا تھا کہ سود جسے حرام قرار دیا گیا ہے اور ہم بھی اسے حرام ہی سمجھتے آرہے تھے وہیں ہمیں اپنے ناک کے نیچے اس کا کاروبار چلتا دیکھنا ہوگا۔''

ہندوستان میں آپ کیا کرتے تھے؟

''وہاں تو میں اورینٹ ایئرویز میں ملازم ہو چکا تھا۔ سول سروس بھی کی۔ چھوڑ کر آیا پتا نہیں کیوں آیا اور کب یہ فیصلہ کرلیا۔ ڈپٹی کمشنر بھی رہ چکا تھا۔ اب یوسفی صاحب اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اُچکے۔ اور زیادہ نظر آئے۔

''اچھا۔'' سوال کرنے والے کی آنکھوں میں حیرت کا سماں اُمڈ آیا تھا۔

''جی ہاں۔'' یوسفی صاحب کی آواز میں اعتماد سے زیادہ منصب کا غرور تھا۔

''اور کیا؟ مگر تقدیر میں کچھ یوں لکھا تھا کہ مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر کی کرسی چھوڑ دی اور بینک کے چار فٹ اونچے اسٹول پر براجمان ہوگیا۔''

بینک کا پہلا دن یاد ہے؟

''جی ہاں روزِ اوّل کی طرح آج بھی حفظ ہے۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ واسکٹ کی جیب میں نہایت قیمتی سونے کی گھڑی تھی جو ہماری پرسنیلیٹی کے پس ماندہ حصوں سے جو سوٹ سے باہر نکلے رہ گئے تھے، قطعی لگا نہیں کھاتی تھی۔''

یہ گھڑی کہاں سے آئی تھی؟ تعارف کرانے والے نے انتہائی احمقانہ سوال کیا۔

میں نے بائیں جانب والی خاتون کی جانب دیکھا۔ انھیں بھی یہ سوال احمقانہ ہی لگا، بلکہ انھوں نے تو ایک جملہ بھی ادا کر دیا، ''کوئی انھوں نے چوری تو نہیں کی ہوگی؟''

یہ پہلا موقع تھا کہ ہم دونوں کے خیالات ایک جیسے تھے، اور ہمارے درمیان مکالمے کا جو تبادلہ ہوا تھا وہ بالکل دوستانہ تھا۔

''نواب سر ابراہیم خان، والیِ ریاست ٹونک نے ۱۹۲۸ء میں ابا جان کو تحفے میں دی تھی۔ ابا جان نے مارے محبت کے کچھ اور خریدنے کے بجائے اسی تحفے کو مجھے منتقل کر دیا۔ جب میں نے بی اے میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ ہمارے پاس تو کُرتے کے سونے کے بٹن بھی تھے۔'' یوسفی صاحب کرسی پر پھر اعزاز کے ساتھ اُچکے، مگر فوراً ہی نیچے ہو کر بیٹھ گئے۔ اطلاع دی کہ ان بٹنوں کو بیچ کر ہم نے مکان کی پگڑی دی تھی اور ابھی تک تو یہ گھڑی بچی ہوئی تھی۔

''اچھا تو آپ کو بینکاری کے شعبے میں آنے کے بعد یہ احساس تو ہو گیا ہوگا کہ اب یہی ہمارا نصب العین ہے اور ہمیں اسی میں ترقی کرنا ہے۔'' تعارف کرانے والے صاحب نے سمجھا کہ یہ سوال ضروری ہے۔ خاتون پہلی بار سوال کرنے والے صاحب سے بھی متفق نظر آئیں۔ کم از کم ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہم نے کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھ کر یہ جانا تھا۔

''جی نہیں۔'' یوسفی صاحب کی کرسی ہلی۔

''کامیاب بینکر بننے کے لیے پچھتّر فی صدی یاری، پچاس فی صد عیاری اور پچیس فی صد نہاری درکار ہے۔'' اب یوسفی صاحب خاموش ہو گئے۔ انھوں نے غالباً اس موقعے پر تعارف کرانے والے صاحب کی ریاضی جانچنی چاہی۔

''یوسفی صاحب یہ تو ڈیڑھ سو فی صد ہو گیا۔ کچھ کم نہیں ہو سکتا۔''

یوسفی صاحب مسکرائے، ''میں ریاضی میں ہمیشہ کم زور رہا ہوں۔ آپ کھرے نکلے۔''

آگے سنیے، اب یوسفی صاحب کو بھی بولنے کا مزہ آنے لگا تھا۔

''جناب یہ پروفیشن تو ڈیوڑھا آدمی مانگتا ہے۔ آدھے پونے سے کام نہیں چلتا۔ بینکاری مکمل توجہ مانگتی ہے۔ یہ پیشہ حاسد خواتین کی طرح ہوتا ہے۔ ہم نے محنت کی ٹھانی ہوئی تھی۔ کام زیادہ تھا آدمی کم تھے۔ ہم چار آدمیوں کے برابر کام اور آٹھ آدمیوں کے برابر غلطیاں بڑی تن دہی کے ساتھ کر رہے تھے۔ ہمیں کون اچھا کہتا اور کیوں ترقیوں سے نوازتا۔

اسی دوران ہم نے صرف تین دن کی رخصت مانگی کہ میرے والد اخبار پڑھتے پڑھتے زمین پر لیٹ گئے۔ زمین نے اپنی امانت واپس لے لی تھی۔ تدفین میں شرکت کے لیے یہ تین دن کی چھٹی تین دن کی تنخواہ کی کٹوتی کے ساتھ ملی۔ یہ ہمارے محترم یعسوب الحسن غوری صاحب تھے کہ جن کے بس میں کاٹنا لکھا تھا، مگر ایک تھے بے چارے اینڈرسن جنھوں نے اس وارننگ کے ساتھ یہ پیسے ہمیں واپس دلوا دیے کہ آئندہ ایسا واقعہ نہیں دہرایا جائے گا۔''

حاضرین اس وارننگ پر ہنس پڑے۔

یوسفی صاحب نے اپنے غم زدہ چہرے کو اور غم زدہ بناتے ہوئے پوچھا، ''کیا آپ میرے والد کے گزر جانے پر ہنسے ہیں؟''

اب حاضرین نے اپنا سر اجتماعی طور پر نیچا کر لیا۔

تھوڑی دیر کا وقفہ ہوا۔

''کیا آپ میرے والد صاحب کے بارے میں جاننا چاہیں گے؟'' یوسفی صاحب کی آواز میں لرزش تھی۔

''ان کی شخصیت کا خاکہ میں پاکستان آنے کے بعد کا کھینچ رہا ہوں۔

ایک دن وہ حیدرآباد سے کراچی آئے تو ٹاٹ کا ایک تھیلا ان کے ہاتھ میں تھا، وہ اپنا کھانا اس میں اپنے ساتھ لائے تھے کہ بیٹے نے جو روزی تلاش کی ہے، اس میں سود کی آمیزش تھی۔ شاید اسی لیے انھوں نے مجھے کندھا دینے کی سعادت سے بھی محروم رکھا۔ اب

ان کے بعد میری ماں تھی۔ بے روزگار بھائی، اس کی بیوی بچے، بہن اور اس کے کنبے کے گرد گھومنے والے طفیلی سیارے۔ ان سب کی ذمے داری، بلکہ فاقہ کروانے کی اخلاقی ذمے داری ہم پر ہی عائد ہوتی تھی۔ یوں ہم نے اپنی تنخواہ کو کنبے کے لواحقین اور لواحقین کے متوسلین پر تقسیم کیا تو مقسوم تئیس روپے پونے چار آنے نکلے۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک آدمی تئیس روپے میں بسر اوقات کر سکتا ہے، مگر زندگی ہندسوں سے زیادہ لچک دار نکلی، انسان بڑا سخت جان ہے۔''

دوسروں کو اپنی تحریر سے ہنسانے والے یوسفی صاحب کی پاکستان آمد کے بعد کی زندگی مفلسی سے شروع ہوئی۔ مرزا غالب کے مکان کی طرح بارش چار گھنٹے برستی تو گھر کی چھت ساری رات ٹپکتی۔ یوں یوسفی صاحب نے دوسروں کو ہنسانے کا فن اپنایا۔ بتایا کہ انسان کس قدر سخت جان ہے، سردی میں ململ کا کرتہ پہن کر بھی زندہ رہ جاتا ہے، اور کئی کئی دن کا فاقہ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑتا۔

اور یہ کیسے انسان تھے جو محل نما گھر میں اناج سے بھرے برتن اور کپڑوں سے لدے صندوق چھوڑ کر خالی ہاتھ چمکتی ہوئی اس تختی کو دیکھنے چلے آئے جس پر پاکستان تحریر تھا۔ ہاتھ خالی سہی، مگر محنت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔

پیر الٰہی بخش کالونی کے چھوٹے سے کوارٹر میں ان کی فیملی دیا سلائی کی طرح ایک طرف سرکیے پڑی رہتی، اور پھر بارش ایسی بارش کہ یوسفی صاحب نے گھر کا حال یوں لکھا کہ جدھر دیکھو پانی ہی پانی۔ کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانے کے لیے بھی چھتری درکار تھی۔ سوائے اپنی بیگم کی آنکھ کے کوئی چیز خشک نظر نہیں آئی۔ جوتوں کا صرف ایک ہی جوڑا تھا جو دفتر سے واپسی پر بھیگ کر مخمل کی طرح ملائم ہو گیا تھا اور اسے مزید مخملیں ہونے سے بچانے کے لیے ہم نے اسے ٹوکری میں رکھ لیا تھا۔ پانی میں نہ صرف لطف آیا، بلکہ اس کی انگلی پکڑے پکڑے بچپن بھی لوٹ آیا۔''

یوسفی صاحب اپنا ماضی دہرا رہے تھے جو پاکستان ہجرت کر کے آنے والے ہر شخص کا ماضی تھا۔ سننے والے بھی مہاجر ہی تھے۔ اس لیے انھیں واقعات کی سچائی پر یقین تھا، مگر سننا تو انھیں چاہیے تھا جنھیں یقین ہی نہیں آتا کہ آنے والے کیا کچھ نہیں چھوڑ کر آئے ہیں۔ شاید وہ

اسی سوال میں آج تک الجھے ہوئے ہیں کہ پھر کیوں آئے ہیں؟ انھیں چمکتی ہوئی اس تختی کی قیمت کا احساس کیوں کر ہوسکتا ہے جنھوں نے یہ قیمت چکائی ہی نہیں ہے۔ مفت ہاتھ لگ جانے والی چیز کی وقعت بھلا کیا ہوتی ہے؟

میری آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آیا تھا حاضرین کی چھلکتی آنکھوں کی طرح۔ میں نے خاتون کی طرف مڑ کر دیکھا۔ میری خاموش تحریر کو انھوں نے بھی پڑھ لیا تھا جو کسی گیلے فرضی صفحے پر لکھی ہوئی تھی، اور اس تحریر سے وہ بھی متفق تھیں۔

یوسفی صاحب کہہ رہے تھے:

''اکثر ہمارے گھر تین تین دن پانی نہیں آتا تھا۔ ہر طرف خشکی ہی نظر آتی۔ ایسے میں میری بیگم کی آنکھوں کے سوا کہیں پانی نظر نہیں آتا۔ اکثر تو ایسا بھی ہوتا کہ پینے کے لیے بھی ہمیں تیمّم ہی کرنا پڑتا۔''

یوسفی صاحب کی بھرپور موجودگی میں بھی فضا خاصی سوگوار ہوچکی تھی اور تعارف کرانے والے صاحب اس اداسی کو برداشت نہیں کرپارہے تھے سو، انھوں نے بیچ کے تمام برسوں کا حساب نہ لینے کا سوچا اور خوش حالی سے بھرپور سوال کردیا، ''جی مگر آپ ۱۹۷۴ء میں بینک کے صدر بھی تو بن گئے تھے۔''

یوسفی صاحب بھی شاید اپنی مفلسی کے دنوں کی داستان سے تنگ آگئے تھے جان چھڑا کر خوش دلی سے بولے، ''۱۹۷۴ء سے میری خوش حالی کی زندگی کا جو آغاز ہوا اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ جس انگریز جنرل منیجر نے ۱۹۵۰ء میں میرا انٹرویو لے کر مجھے بینک میں ملازم رکھا وہ اُس وقت نشے میں دُھت تھا۔ اس واقعے سے بھائیو یہ سبق ملتا ہے کہ شراب نوشی کے نتائج کتنے دور رس ہوتے ہیں۔''

تقریب تقریباً اختتام پر تھی کہ ہم نے اپنا پرس کندھے پر جمالیا تھا اور ہماری پڑوسن نے بٹوا نکال کر سونف چھالیا زادِراہ کے طور پر گال میں قید کرلیا تھا۔

اسی لمحے ایک اہم سوال حاضرین کی طرف سے ہوا۔ یوسفی صاحب نے خوش دلی سے سوال کا جواب دینے کی ہامی بھرلی۔

کیا بینک والوں کو آپ کی ادبی صلاحیت کا علم تھا؟

''کچھ تھا کچھ نہیں بھی تھا کہ میں نے اپنے لکھنے والے نام سے یوسفی نکال رکھا تھا۔ شہر میں مشتاق احمد ڈھیروں تھے۔''

ایک حاضر نے ایک اور مزے دار سوال داغ دیا:

آپ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟

''جناب میں جس منزل میں ہوں وہاں انسان تحسین اور تنقیص دونوں سے اس درجہ مستغنی ہوجاتا ہے کہ ناکردہ خطاؤں تک کا اعتراف کرنے میں حجاب محسوس نہیں کرتا۔ چناں چہ اب مجھے یہ اقرار کرنے میں حجاب محسوس نہیں ہوتا کہ میں طبعاً، اصولاً اور عادتاً یاس پسند اور بہت جلد شکست مان لینے والا آدمی ہوں۔ قنوطیت غالباً مزاح نگاروں کا مقدر ہے۔ سو، یہ میرا بھی مقدر ہے۔ باقی آپ جو چاہیں میرے بارے میں رائے قائم کرلیں۔ میں برا ہرگز نہیں مانوں گا۔''

مجمع تتر بتر ہوگیا۔ میں ان خاتون کی طرف مڑی کہ کردہ یا ناکردہ جملوں کی معافی مانگ لوں جو ابتدا میں سرزد ہوئیں، مگر دیکھا تو وہ نہ دائیں تھیں نہ بائیں۔ جانے کہاں مجمعے میں گم ہوچکی تھیں۔

انسان بھی تو دنیا کے ہجوم سے نکل کر یکا یک گم ہوجاتا ہے یوسفی صاحب کی طرح کہ آج وہ بھی نہ دائیں ہیں نہ بائیں۔ ہاں سامنے ان کی کتابیں ہیں جو پھلجھڑیوں کی مانند کچھ دیر کے لیے روشنی پھیلانے، ہنسنے ہنسانے اور غم بھلانے کے کام آتی ہیں۔ یوں یوسفی صاحب ہجوم میں ہیولے کی طرح موجود ہیں، اور حقیقت بن کر بھی ہمیشہ موجود رہیں گے کہ استاد ذوق نے کہا تھا:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ

لیڈی چنگیز خان... عصمت چغتائی☆

عصمت چغتائی سو برس کی ہوگئیں، لیکن اپنی صد سالہ سال گرہ منانے سے چوبیس برس پہلے ہی دنیا چھوڑ گئیں۔ چٹ پٹے جواب دینے والی، اردو افسانے کا وہ قطب مینار جسے دیکھنے کے لیے فی الواقع پگڑی سنبھالنی پڑتی ہے۔ وہ پہلی کھری مغل جنھیں کبھی غصہ نہیں آتا۔ اردو ادب کی شریر لڑکی جس کے سر پر کرنوں کا تاج سج گیا، مگر جس کا قلم بوڑھا نہیں ہوا۔ وہ منظرِ عام پر آئیں تو لگا جیسے کارل مارکس کا جامہ پہنے ہوئے ہیں۔ جن کی منطق بھی عجیب الف سے انار کیسے ہوسکتا ہے؟ کہ الف تو لمبا ہوتا ہے اور انار گول۔ اپنے قاری کو دہلا دینے والی اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں سکون سے رہنے والی۔ جانے جی میں کیا آئی کہ بغیر لڑے بھڑے اللہ تعالیٰ کے بلاوے پر اُس طرف چلی گئیں جہاں سے کوئی کبھی نہیں لوٹا۔ ورنہ وہ تو اپنی کھری طبیعت اور زبان کی بے ساختگی کے ساتھ یوں بھی کہہ سکتی تھیں، کیوں آؤں؟ جب جی چاہے گا آجاؤں گی نہیں جی چاہا نہیں بھی آؤں گی۔ یہ کیسی زور زبردستی ہے۔ ابھی تو مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔

کاش انھوں نے یوں ہی کہا ہوتا اور کاش اللہ تعالیٰ نے اپنی ہی بنائی ہوئی انوکھی، منفرد عصمت کی بات مان لی ہوتی تو آج ہندوستان یا پاکستان کے کسی شہر کے کسی مقام پر وہ

☆۔ یہ مضمون ۲ر دسمبر ۲۰۱۵ء، ویمن کالج علی گڑھ کی جانب سے سو سالہ جشن کے موقعے پر عالمی کانفرنس میں پڑھا گیا۔

موجود ہوتیں اور ان کی پیدائش کا صد سالہ جشن ان کی موجودگی ہی میں منایا جارہا ہوتا۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا عصمت واقعی اپنی اس دنیا سے چلی گئیں جہاں رہتے سہتے انھوں نے چھپے چھپائے کونے کھدروں میں پلنے والی کہانیوں کو اپنے نڈر اور بے تکلف جملوں کو جوڑ جوڑ کر کاغذ پر انڈیل دیا ہے۔

ہم جانتے ہیں دنیا سے صرف شخص جاتا ہے شخصیت باقی رہ جاتی ہے۔ شرط بس یہی ہے کہ شخص میں شخصیت بھی ہو۔ ورنہ ہر روز کے اخبار اور ٹی وی درجنوں، بلکہ سیکڑوں لوگوں کی موت کا اعلان کرتے ہیں جو نام رکھنے کے باوجود بے نام مر جاتے ہیں۔

عصمت کی شخصیت آج بھی زندہ ہے اپنے بہت سارے ناموں کے ساتھ۔ عصمت افسانہ نگار، عصمت ناول نگار، عصمت خاکہ نویس، حقوقِ نسواں کی علم بردار، عصمت باغی فکشن نگار، عصمت سماج کی محتسب، عصمت ترقی پسند، عصمت روشن خیال اور آج ہم ان کے مختلف روپ کو کھول کھول کر دیکھ رہے ہیں۔

آج ہم خوشی خوشی ان کا صد سالہ جشنِ پیدائش منا رہے ہیں کہ بدایوں میں پیدا ہونے والی عصمت چغتائی خاندان کی دسویں اولاد کس آن بان اور شان سے زندہ ہے۔ عصمت نے اپنے پیدائش کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے کہ نہ میرے پیدا ہونے پر جشن منایا گیا، نہ مٹھائی بانٹی گئی، نہ دعا تعویذ ہوئی، نہ چومی چاٹی گئی، نہ ہی نظر اُتاری گئی کہ بھلا دسویں اولاد کے بھی چونچلے ہوتے ہیں۔

آج اگر عصمت ہوتیں تو دیکھتیں کہ ان کی پیدائش کی دس دہائی ہم اور دنیائے ادب کی تمام آبادی کس زور شور سے منا رہی ہے۔

عصمت خود اپنی زبان میں کچھ یوں کہتیں، دیکھا دسویں نمبر پر آنے کا بدلہ میں نے لے لیا نا۔ آج کس قدر شان وشوکت سے عصمت عصمت کی رٹ لگی ہے۔

عصمت کا بچپن دیواریں پھلانگنا، درختوں پر چڑھنا اور بندروں کے پیچھے بھاگنا اور یہ ثابت کرنا کہ جو کام لڑکوں کے لیے جائز ہیں وہ لڑکیوں کے لیے کیوں جائز نہیں ہیں۔ انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ وہ لڑکی بن کر کیوں پیدا ہوئیں پر وہ تو ایسی آنکھ اور ایسا شعور لے

کر دنیا میں آئی تھیں کہ جسے کوئی دیکھ ہی نہیں پایا اور وہ بچپن میں غیر اہم رہیں، مگر انھوں نے تو اپنی آنکھوں اور فہم کا استعمال بچپن سے ہی کرنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے بیگم جان کو بھی دیکھ لیا تھا۔ ننھی کی نانی کو بھی پہچان لیا تھا۔ بچھو پھوپھی سے بھی ملاقات کر لی تھی۔ انھوں نے دبی دبائی سات پردوں میں رہنے والی کچلی کچلائی ان لڑکیوں کے اندر بھی جھانک لیا تھا جنھیں ان کے آس پاس پھرنے چلنے والے بھی نہیں دیکھ پائے تھے۔ خود ان کے اپنے ماں باپ بھی واقف نہیں ہو سکے تھے۔ ان کی آنکھوں نے معاشرے کی ساری باریکیوں کو خوب خوب دیکھا تھا۔ ہر جگہ انھوں نے ظلم اور زیادتی دیکھی۔ محبت جتا جتا کر ظلم کرتے دیکھا۔ ناانصافیاں دیکھیں، طرف داری دیکھی۔ برے کو اچھا کہنے والوں کی معصومیت پر ماتم کیا۔ بینا کو نابینا بنتے دیکھا۔ معاشرے کے سارے الجھاوے دیکھ ڈالے۔ اور پھر انھوں نے اپنے آپ کو اس معاشرے میں فٹ نہ پا کر علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ باغی کہلائیں۔ جب لڑکیوں کے لیے اسکول کے دروازے بند تھے وہ دروازہ توڑ کر اس میں داخل ہو گئیں اور یہ اعزاز حاصل کر لیا کہ وہ پہلی مسلم گریجویٹ ہیں۔ انھوں نے معلمی کا منصب سنبھال لیا۔

انھوں نے ہاسٹل کی زندگی بھی دیکھی جہاں لڑکیاں اپنے ڈھکے چھپے مسائل خود حل کرنے پر کیسے مجبور ہو جاتی ہیں۔ وہ دنیا کو صرف دیکھنا نہیں چاہتی تھیں، بلکہ اپنی دو آنکھوں سے دیکھی ہوئی مصدقہ کہانی دنیا کو دکھانا بھی چاہتی تھیں۔ انھوں نے قلم سنبھال لیا، لکھنے لگیں، شروع ہی میں ان کی تحریروں نے لوگوں کو بوکھلا دیا۔ بدحواس کر دیا۔ لوگ پریشان ہو گئے۔ یہ جانتے اور مانتے ہوئے کہ وہ جو کچھ لکھ رہی ہیں، سب سچ ہے، مگر سچ کو بیان کرنا ضروری نہیں، اور اگر ضروری ہے بھی تو یہ اختیار کسی عورت کو تو ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔

کیوں؟ عورت اور مرد میں تخصیص کیوں؟ یہ سوال ان کے ذہن میں تھا۔ کیا مرد کی تین آنکھیں ہیں۔ کیا ان کی چھ انگلیاں ہیں، کیا عورت کے پاس صرف ایک ہاتھ ہے، کیا مرد کے پاس ذہن ہے، احساس ہے، قلم ہے، اور عورت ان تینوں چیزوں سے محروم ہے۔ اگر نہیں تو پھر اس کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں؟ "یہ کیوں؟" پھر ان کے ساتھ زندگی بھر چپکا رہا۔

ان کے بھائی نے کہا، عصمت اب تم بڑی ہو گئی ہو برقع پہن کر کالج جایا کرو۔ انھوں نے جواب دیا آپ تو مجھ سے بھی بڑے ہیں، آپ صرف ایک دن برقعہ پہن کر اپنے آفس جائیں پھر میں زندگی بھر کے لیے برقعہ پہن لوں گی۔ یہ جواب ان کی بے باکی نہیں تھی، نہ ہی ترکی بہ ترکی جواب دینے کی خصلت، بلکہ وہ یہ تمیز نہیں کر پا رہی تھیں کہ عورت اپنے آپ کو کیوں چھپائے؟ آخر مرد کیوں نہیں؟ یہ ان کا سوال تھا اپنے معاشرے سے جہاں مرد ہر آتی جاتی برقعہ پوش عورت کے اندر بھی جھانکنے کی پوری اجازت اور حق رکھتا ہے، وہ دن بھر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کسی لڑکی کے درشن کے لیے کھڑکی کے کواڑ کھلنے کا منتظر رہ سکتا ہے۔ عصمت کو یہ جھوٹی بات پسند نہیں تھی۔

ان سے کہا گیا، تم اتنی کٹیلی زبان کیوں لکھتی ہو؟ وہ اپنے گھر کے ایک محفوظ کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئیں اور سارا دن چپ چاپ اپنے بھرے پُرے گھر کے اندر اور باہر سے آنے جانے والے ہر فرد کی باتیں سنتی اور لکھتی رہیں۔ دن ختم ہو جانے کے بعد سارے گھر والوں کو جمع کر کے بیٹھ گئیں۔ کہنے لگیں، میری سنو۔

اور انھوں نے تمام مکالمے نام بہ نام سب کو سنا دیے جو گھر کے لوگ بولتے رہے تھے۔ سب دم بہ خود تھے کہ ہمیں ہماری آواز نہیں آتی، صرف عصمت کی آواز آتی ہے اور اسی لیے ہم اسے منع کرتے ہیں۔ اس نے تو وہی لکھ دیا جو اس نے ہمارے منہ سے سنا ہے۔

تب انھوں نے سب پر باور کرایا کہ میں اپنی کہانیوں میں وہی کچھ لکھتی ہوں جو میں دیکھتی ہوں۔ دیکھتے تو سب ہیں، مگر کہانی کے مخصوص کرداروں کی میں نفسیات بھی سمجھ لیتی ہوں۔ ان کی خواہشات اور دبی دبائی ہوئی سانس کی گھٹن کو آپ محسوس نہیں کر سکتے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں تو مرتی ہوئی بند ہوتی ہوئی دل کی دھڑکن کو بھی سن لیتی ہوں، بس میرا قصور صرف یہ ہے کہ اسے آپ کو بھی سنا دیتی ہوں۔

آپ بے جوڑ شادیاں کر دیتے ہیں، آپ اس کے نتائج ظاہری پیمانے پر ناپتے ہیں۔ لڑکی سکھ سے رہے گی، گہنا کپڑا پہنے گی، گھر میں رانی کا درجہ پائے گی، گہنا کپڑا پہنے رانی دل کے ٹکڑے روز جمع کرتی ہے۔ دل روز خون کرتی ہے۔ آپ کو وہ خون نظر آتا ہی نہیں

کہ گھنے کپڑے کی چمک زیادہ تیز ہوتی ہے۔ چلیے آپ یہ سب محسوس نہیں کرتے نہ کریں، میں کوئی مصلح اور ناصح بھی نہیں چوں کہ میں دیکھ لیتی ہوں، محسوس بھی کر لیتی ہوں بس اس معاشرے اور اس کے ڈھونگ کو بے نقاب ہی تو کرتی ہوں۔

بے نقاب کرتی ہوں تو آپ اور آپ کا معاشرہ مجھ پر مقدمہ دائر کر دیتا ہے۔ مجھ پر پابندی لگائی جاتی ہے کہ نہ دیکھو، نہ دکھاؤ۔ وہ ڈٹ گئیں۔ میں دیکھوں گی بھی اور دکھاؤں گی بھی۔ معافی نہیں مانگوں گی۔ مقدمہ لڑوں گی۔ وکیل کی طرح ہر جرح کا جواب جرح سے دوں گی۔ ذرا ڈھونڈ کر تو دکھاؤ میں نے ایسا کون سا لفظ یا جملہ ایسا لکھا ہے جو گرفت میں آئے۔ یا کیا غلط لکھا ہے جو ہے نہیں اور میں نے کہا ہے کہ ہے۔ وکیل سے لے کر جج تک متنازع جملے تلاش کرتے رہے اور اتنی دیر میں وہ باعزت بری بھی ہو گئیں۔

عصمت کی بے باکی اور جرأت کے ساتھ کہی ہوئی باتیں ان کی شخصیت کے مثبت پہلو تھے جو مدت تک منفی بنے رہے۔ قلم سے نکلے سچ کو پی جانا ہر کسی کے بس کا روگ بھی نہیں۔ عصمت نے کبھی ایسا کچھ نہیں لکھا جسے بعید از قیاس کہا جا سکے یا وہ سب کچھ تخیل کی پیداوار ہو۔ اگر کچھ چھپا ہوا ہے اور اسے عصمت کی آنکھ دیکھ لیتی ہے تب اس میں عصمت کا کیا قصور؟ اللہ نے ایسی آنکھ بنائی ہی کیوں؟ پڑھنے والے یوں کہہ لیں جلنے والے بس فیصلہ دے دیتے ہیں کہ وہ بے باک ہیں بے جھجک ہیں، بلکہ فحش نگار بھی ہیں۔ ہاں رائے رکھنا تو سب کا حق ہے وہ ضرور رکھیں، مگر فیصلہ کرنا ان کا حق نہیں۔ وہ فیصلہ نہ کریں، عصمت نے ہمیشہ بس یہی تو کہا۔

متوسط طبقے کی پروردہ عصمت نے اپنے گھرانے کے بیشتر موضوعات کو موضوع بنایا۔ وہ طنز سے کہتی تھیں، میں افسانے پڑھتی ہوں، پیانو کے گیت، شفتالو کے پیڑ، میں نے تو کبھی دیکھے نہیں، شفتالو کے پیڑ لکھوں کیسے؟

انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے، میں جو کبھی گیلی لکڑی کی طرح سلگی بھی تو بہتوں کو سلگایا بھی ہے۔ میں صرف قلمی معرکے نہیں مارتی، میں نے زندگی کی ہر گھٹن، زیادتی اور ناانصافی کا منہ توڑ جواب بھی دیا ہے۔ کسی کی دھونس نہیں جھیلی، مطعون ہونے کی مجھے ذرّہ بھر بھی پروا

نہیں، نہ کبھی ہوگی۔ عورت مغربی ہو یا مشرقی، اگر وہ جوتے کھاتی ہے اور چوں نہیں کرتی تب اس کے وجود پر رحم نہیں مجھے غصہ آتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں میں نسوانیت کی قائل نہیں۔ ہاں ٹھیک ہے، مگر میرا سوال ہے نسوانیت ہوتی کیا چیز ہے؟ کیا میں نسوانیت کا مجسمہ لگتی ہوں۔ ابھی میکسی میں تھی ابھی ساڑھی میں۔ انسان صرف انسان ہوتا ہے۔ عورت کو نسوانیت کا پوٹلا چورا ہے پر پٹخنا ہوگا۔

بکری کیا شلوار پہنتی ہے؟ اور بکرا کیا صافہ باندھتا ہے؟ لوگ کہتے ہیں میں حیوانوں کی مثال دیتی ہوں۔ بھئی مثال ہی تو ہے یوں بھی دی جاسکتی ہے۔ مجھے کوری جذباتیت سے کوفت ہوتی ہے۔

کسی نے پوچھا زندگی کے سفر میں آپ نے کیا پایا؟ کیا کھویا؟

ہنس کر اور تنک کر بولیں، کچھ بھی نہیں کھویا میں نے البتہ میری عینک ہر تھوڑی دیر بعد کھو جاتی ہے، کیوں کہ بغیر عینک میں لکھ پڑھ نہیں سکتی۔ اپنے نواسے سے ڈھونڈنے کا کہتی ہوں وہ ڈھونڈ لاتا ہے میں پاجاتی ہوں۔ بس اتنی سی بات کا بتنگڑ کیا؟

شاہد لطیف بھی تو کھو گئے۔ دکھ تو ہوا ہوگا۔

ہاں شاہد نے مجھے چھوڑ دیا۔ سب لوگ ان سے کہتے تھے کہ عصمت کے ساتھ رہو گے تو تمھاری شخصیت اُبھر نہیں پائے گی۔ بڑھ کے پیڑ کے نیچے کوئی دوسرا پودا نہیں پنپتا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی وہ الگ ہوگئے۔ ایک جوان سی بے خبر لڑکی کے ساتھ رہنے لگے۔ کیا ہوا۔ بس اتنا ہی ہوا روز ڈھیروں صفحے لکھتی اور پھاڑتی رہی۔ پھینکتی رہی، مطمئن یوں تھی کہ میرے ساتھ تھے تو جتنی فلمیں ہم دونوں نے اکٹھی بنائیں کامیاب رہیں، الگ ہو کر بنائیں سب فلاپ ہوئیں۔

نام کے ساتھ شاہد لطیف نہیں لگایا؟

بھئی لگایا۔ جہاں بھی عصمت شاہد لطیف لکھ کر بھیجا واپس آگیا۔ جواب آیا کوئی پڑھتا نہیں۔ کوئی دیکھتا نہیں۔ میں پھر سے چغتائی بن گئی۔

شاہد کیسے شوہر تھے؟ سوال ہوا۔

بدتر، بے حد بُرے۔

اور آپ خود کیسی بیوی تھیں؟ جواب دیا۔

بُری بے حد بُری۔

جب زندگی میں کوئی بناوٹ نہ ہو اور جھوٹ بھی شامل نہ ہو تب زندگی گزارنی آسان بھی ہوتی ہے اور بے حد مشکل بھی۔ عصمت بناوٹی زندگی کی قائل نہیں تھیں۔ اس لیے انھوں نے بظاہر آسان، مگر شاید اندر سے مشکل زندگی گزاری ہوگی۔

کامیاب زندگی اسے بھی تو کہتے ہیں کہ اپنے کام کی پذیرائی پائی۔ لوگوں نے عصمت کو ادب کی عصمت جانا۔ بہت سارے ایوارڈ حاصل کیے، مگر یہ بھی سچ ہے کہ کبھی کسی ایوارڈ کے پیچھے نہیں بھاگیں۔

بظاہر سخت، مگر اندر سے نرم تھیں۔ اپنے ہی کرداروں سے محبت کر کے آنکھ سے نہیں دل سے آنسو ٹپکا دیتی تھیں۔ یہ موم دل ہی کی تو نشانی ہے۔ دوسروں کے دل کا پاس رکھتی تھیں اپنا دل کھو بیٹھیں۔ کبھی کبھی دل پاس رہ کر بھی تو پاس نہیں رہ پاتا، مگر کہاں کا شکوہ؟ بس یہی تو ہوا آخر آخر حافظہ کھو بیٹھیں۔

اگر اپنے ہی عہد میں کوئی ایسی شخصیت ہو جس کی ہر تحریر لڑکپن سے ہی پڑھنی شروع کر دی ہو، اس سے ملنے کا تو دل چاہتا ہی ہے۔ میں ادب کی نہیں معاشیات کی طالب علم تھی، مگر مارکس، مارشل، روبنز، آدم اسمتھ یا ریکارڈو مجھے کبھی نہیں ملے، ملنے کی ایسی کوئی تمنا بھی نہیں کی، مگر ان ہی کتابوں کے درمیان عصمت کی چھوئی موئی پڑھتی تھی جی چاہتا تھا ملوں بھی۔ ''ٹیڑھی لکیر'' لکھنے والی دیکھنے میں کیسی ہیں؟

۱۹۷۶ء میں وہ پاکستان اُس وقت آئیں جب میں اسپتال میں تھی اور میرا پہلا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ کیسے اسپتال سے بھاگوں۔ کیسے ان سے ملوں؟ اس پر سے یہ ظلم کہ ہماری ہی کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کی جانب سے سرسیّد کالج میں ان کے استقبال کا دن مقرر ہوا۔ نڈر، بے باک عصمت کی اور تو کوئی پیروی نہیں کر سکی۔ دو دن کے بچے کو چادر میں لپیٹ کر خود ڈھائی گز کے چوڑے دوپٹے سے سر اور بچے کو ڈھانک کر دبے پاؤں، بلکہ ڈگمگاتے پیروں سے

اسپتال سے نکل بھاگی۔ نہ امّاں کو بتایا نہ اسپتال کے عملے کو خبر ہونے دی۔ عصمت کو دیکھا بھی اور سنا بھی۔

ابھی اُن کے سر پر کرنوں کا تاج نہیں سجا تھا۔ وہ صرف باون سال کی تھیں، چھوٹے چھوٹے بال، سوتی پرنٹڈ ساڑھی، تیز دور اندیش آنکھیں جس پر موٹے پلاسٹک فریم کا چشمہ، عصمت اپنی تصویروں سے مختلف نہیں تھی۔ وہ مسکرا بھی رہی تھیں اور قہقہے بھی لگا رہی تھیں۔ لگاتار سوال ہو رہے تھے۔ سوال ابھی ادھورا ہی ہوتا کہ وہ سمجھ کر جواب دے ڈالتیں۔

اخبار والے بھی آئے ہوئے تھے۔ دوسرے دن خبر لگی عصمت کا سب سے ننھا سامع صرف دو دن کا تھا اور اسپتال سے بھاگی ماں معاشیات کی پروفیسر تھی۔ ساتھ میں ثبوت کے طور پر تصویر بھی چھپی تھی۔

واپسی پر ڈانٹ بھی پڑی اور خوف ناک نتیجے کی پیش گوئی بھی ہوئی، مگر کچھ نہیں ہوا۔ ہاں عصمت کو دیکھ لیا اور سن لیا۔ ڈاکٹر بھی خفا ہوئی، مگر اس نے پوچھ لیا۔ تقریب کیسی تھی؟ عصمت چغتائی کا نام تو میں نے بھی سنا ہے اور ''ٹیڑھی لکیر'' پڑھی بھی ہے۔

ڈاکٹر کو بتایا ہماری ایسوسی ایشن کی صدر پروفیسر انیتا غلام علی جو مائیکرو بیالوجی کی استاد ہیں، نے سوال کیا۔

لکھنے کے لیے کیا ضروری ہوتا ہے؟ شاید وہ یہ پوچھنا چاہ رہی تھیں کہ مطالعہ ضروری ہوتا ہے یا فطری رجحان۔ مشاہدہ یا لکھنے کی قدرتی صلاحیت؟ عصمت کا جواب تھا بس کچھ بھی نہیں صرف قلم اور کاغذ۔

اب جب میں اپنی اُس یاد کو دوبارہ تازہ کر رہی ہوں نہ انیتا غلام علی ہیں، نہ عصمت، ننھا بچہ چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ بن کر اپنے پاؤں سے چل کر روزی کمانے دوسرے ملک میں جا بسا ہے۔ میں اسے روز یاد کرتی ہوں۔ اب خط نہیں لکھے جاتے، مگر ہر روز میں اسے قلم کاغذ کے ذریعے مخاطب کرتی ہوں، چند لائن لکھتی ہوں پھر کاغذ کے پرزے پرزے کر دیتی ہوں۔ شاید عصمت چغتائی کی پیروی میں۔ اب سمجھ میں آیا کہ اپنے حروف لکھ کر پھاڑ دینے سے سکون تو نہیں ملتا، مگر بنانا پھر مٹانا شاید لہو گرم رکھنے کا بہانہ بن جاتا ہے۔

عصمت نہ اب لکھتی ہیں نہ پھاڑتی ہیں بس اپنی گراں قدر تحریریں چھوڑ کر زندگی کی سینچری پوری کرنے کے بجائے ۷۶ رنز بنا کر رن آؤٹ ہو گئیں۔

Man of the match کا ایوارڈ بھی جاتے جاتے جیت لیا۔ بھلا انھیں اس کی تمنا بھی کب تھی؟ قلم کاغذ کا Life Time Achievement ایوارڈ بھی ان کے حصے میں آ گیا۔ ان پر سے گزر جانے والی صدی ان کی اپنی گرفت میں تھی، مگر آنے والی صدیوں میں بھی عصمت کی ٹیڑھی لکیر ہو۔ ضدی ہو، دل کی دنیا ہو یا ان کے بے شمار افسانے یا ناول ہمیشہ پڑھے جائیں گے۔ ان کی تیکھی اور بے تکلف زبان کے مزے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اب ان کی تمام تحریریں وقت کی امانت ہیں۔

عصمت کو اپنی عصمت کا مینار بنانا خوب آتا تھا جب ہی تو آج ہم عصمت کا سو سالہ جشن منا رہے ہیں۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو عصمت آپا۔

نائٹ کمانڈر... سر سلطان آغا خان☆

معزز حاضرینِ کرام!

آج دو نومبر ۲۰۱۸ء کا دن ہے۔ ایک دو نومبر ۱۸۷۷ء کا بھی دن تھا جب ایک خوب صورت گول مٹول بچے نے لیڈی علی شاہ کے گھر اور اسی شہر کراچی میں جنم لیا تھا۔

آج ہم سب اسی بچے کا ایک سو اکتالیسواں جشنِ پیدائش منانے کے لیے جمع ہیں، جب کہ ہم میں موجود کوئی شخص اس دن موجود نہیں تھا جب لیڈی علی شاہ نے اس بچے کو جنم دیا تھا۔

لیکن ـــــ لیکن خواتین و حضرات میں اس دن اس لمحے موجود تھی۔ میں نے دیکھا تھا اس کی پیشانی پر لکھی ایک تحریر تھی۔ میں نے اس تحریر کو پڑھ لیا تھا۔ یہ بچہ عام بچہ نہیں۔ یہ برِصغیر کے مسلمانوں کی تقدیر بدلنے آیا ہے۔ یہ دنیا میں اپنا نام اس رجسٹر میں لکھوانے کے لیے آیا ہے جو نام رہتی دنیا تک نہیں مٹتے ہیں۔ ایسے بچے کا کوئی ایک نام نہیں ہوتا ہے۔ یہ ہز ہائی نس ہوتا ہے۔ شمس ہمایوں ہوتا ہے۔ اسٹار آف زنجبار ہوتا ہے، اسٹار آف ترکی ہوتا ہے، ہز رائل ہائی نس ہوتا ہے۔ اس کا نام سلطان محمد شاہ ہوتا ہے۔ شروع میں سر اور آخر میں آغا خان ہوتا ہے۔ ہاں خواتین و حضرات! نام رکھنے کی تقریب میں بھی میں موجود تھی، اور خطابات حاصل کرنے کے ہر ہر موقعے پر میں اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

☆۔ یہ مضمون سر سلطان آغا خان کے ایک سو اکتالیس ویں جشنِ پیدائش ۲ دسمبر ۲۰۱۸ء کے موقعے پر پڑھا گیا۔

میں اس وقت بھی موجود تھی جب آٹھ برس کے اس یتیم بچے کو سلطان محمد شاہ آغا خان ثالث کا لقب دے کر اسے اپنا امیر مان لیا گیا تھا۔

میں تو اس وقت بھی موجود تھی جب پہلی بار ۱۸۹۸ء میں اکیس برس کا خوب رو نوجوان انگلستان گیا تھا۔ تب ملکہ وکٹوریہ نے اسے KCIE کے خطاب سے نوازا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ صرف اس کی دولت یا اس کے حسن سے متاثر نہیں ہوئی تھیں، بلکہ وہ اس اکیس سال کے خوب رو جوان کی لیاقت سے متاثر ہوئی تھی۔ گو کہ وہ ایک یتیم بچہ تھا، مگر جس گود نے اسے تربیت کے مراحل سے گزارا تھا وہ ایک جہاں دیدہ خاتون کی گود تھی۔ ہاں میں نے انھیں بھی دیکھا تھا۔ لیڈی علی شاہ نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے عربی اور فارسی معلم کی خدمات حاصل کی تھیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان کے لیے دو الگ معلم رکھے تھے۔ آٹھ برس کی عمر میں وہ بچہ صبح ساڑھے چھ بجے نیند سے بیدار ہو جاتا آٹھ بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک اس کی انگریزی اور فرانسیسی زبان کی کلاس ہوتی۔ دو بجے دوپہر سے پانچ بجے تک اسے عربی اور فارسی پڑھنی ہوتی۔ یعنی بہ یک وقت یہ بچہ چار زبانیں سیکھ رہا تھا اور اسے چار زبانوں میں استعداد حاصل کرنے میں کوئی دقت بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

لیکن تھا تو وہ بچہ ہی، رات کے کھانے کے بعد اس کی والدہ اسے عربی اور فارسی کی خوش خطی کی مشق کراتیں۔ گویا تربیت تو ان پر فرض تھی ہی، مگر وہ اس کی تعلیم میں بھی اپنا حصہ ڈال رہی تھیں، اور پھر وہ اس کے مستقبل سے بھی غافل نہیں تھیں کہ انھیں یہ احساس تھا کہ بڑے ہو کر اسے اپنے عقیدے کے لوگوں کا حاکم بھی بننا تھا۔ رہنما بھی بننا تھا۔ سو وہ اسے اسماعیلی مریدوں کے درشن کے لیے بھی تیار رکھتیں۔

آپ میں سے اُس وقت کوئی بھی موجود نہیں تھا، لیکن حاضرینِ کرام! یقین جانیے اس وقت بھی میں موجود تھی، میں نے تعلیم کی طرف اُن کا شوق، اُن کی لگن اور محنت کا بغور مطالعہ کیا تھا۔

میں تو اس وقت بھی موجود تھی جب امریکا کے صدر لنکن نے یہ جملہ ادا کیا تھا کہ میں جو کچھ بھی ہوں اور میں نے دنیا میں جو کچھ بھی حاصل کیا ہے اس کا سہرا میری ماں کے سر ہے، اور میں اس وقت بھی موجود تھی جب اس حسین بچے نے نوجوان کا روپ دھارا تھا اور

اس نے بھی ابراہم لنکن کا یہ جملہ اپنی ماں کے لیے ادا کیا تھا۔

حاضرینِ کرام کیلنڈر ہماری زندگیوں میں بڑے اہم ہوتے ہیں۔ ان میں تاریخیں درج ہوتی ہیں، جو ہر سال آتی ہیں اور سال بھی اہم ہوتے ہیں کہ ان سے عمروں اور زمانے کا تعین ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ بعض اوقات بہت سارے لوگوں کو مختلف ملکوں، مختلف شہروں میں تو پیدا کرتا ہی ہے، لیکن بہت سارے اہم لوگوں کو ایک دو کیلنڈر میں ایک ساتھ سمو دیتا ہے۔ ایک ملک اور ایک ہی برِاعظم میں پیدا کر دیتا ہے۔ اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو ایک ہی سال کی دو تاریخوں کو کراچی میں سر سلطان آغا خان پیدا ہوتے ہیں تو اسی سال صرف سات دن بعد سیالکوٹ میں علامہ اقبال کا جنم ہوتا ہے۔

۱۸۷۵ء میں حسرت موہانی پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۸۷۶ء میں قائد اعظم محمد علی جناح دنیا میں آتے ہیں، ۱۸۷۳ء میں مولانا ظفر علی خاں پیدا ہو چکے ہوتے ہیں اور ۱۸۷۸ء میں مولانا محمد علی جوہر کی پیدائش ہوتی ہے۔ ان تمام شخصیات کے نام اور کام، زندگی اور مقصدِ زندگی کا مطالعہ کیجیے تب وہ سب ایک ہی دائرے میں سمٹ آتے ہیں۔ یہ ہم عصر لوگ ہیں جو برِصغیر کے پس ماندہ ملکوں کے نجات دہندہ ثابت ہوئے۔ کسی نے صحافت کے ذریعے، کسی نے شاعری کے ذریعے، کسی نے وکالت کے ذریعے، کسی نے سیاست کے ذریعے اپنا اپنا فرض اور قرض ادا کیا۔

سب کی ماؤں نے اپنے اپنے بچوں کی پرورش میں محنت کی ہوگی، تاریخ ان کے نام اور کوشش میں خاموش نظر آتی ہے، لیکن لیڈی علی شاہ اور بی اماں شاید دونوں منہ بولی بہنیں تھیں کہ مولانا محمد علی جوہر اور سر شاہ سلطان نے اپنی اپنی ماؤں کو اپنے نام اور کام سے امر کر دیا۔ آپ میں سے اس وقت کوئی بھی نہیں تھا، مگر حاضرینِ کرام یقین کیجیے کہ میں اُس وقت بھی موجود تھی۔

کتنا خوش قسمت تھا وہ خوب رو جوان جو اٹھارہ برس کی عمر میں برِصغیر کی اس شخصیت سے ملاقات کرتا ہے جسے برِصغیر کے مسلمانوں کا اس قدر درد تھا کہ اس نے اپنی زندگی، اپنا

چین و آرام سب کچھ اُن کے لیے قربان کر دیا تھا۔ وہ مرد بزرگ سر سیّد احمد خان تھا۔ سر سیّد نے اس نوجوان کا خیر مقدم کیا تھا۔ کیا عجب کہ اپنی بھرپور زندگی کا آخری سپاس نامہ اس کے حضور پیش کیا۔

بس اسی موقعے پر آغا خان کو قوم کی بیداری کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے کا عزم کرنا تھا۔ حاضرینِ کرام اس وقت بھی میں موجود تھی اس وقت اس جگہ اسٹریچی ہال میں ہی اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ ہاں مجھے اس بوڑھے مدبر مصلح سے محنت، شفقت، محبت اور علمیت کی کمان اپنے ہاتھوں میں لینی ہے۔

اس نے پہلے اپنی شخصیت کا جائزہ لیا۔ میں موسیقی کا شوقین ہوں، گھوڑوں کو ریس میں دوڑانا میرا مشغلہ ہے، اچھے لباس مجھے پسند بھی ہیں اور میرا جنون بھی، ہر قسم کے کھیلوں سے مجھے دل چسپی ہے۔

لیکن کیا یہ شوق مجھے اگلے زمانوں میں زندہ رکھنے کے قابل ہوں گے، نہیں نا، کہ شوق انسان کو بڑا نہیں بناتے۔ قد آور شخصیت بننے کے لیے صرف حُسن، وجاہت، مشغلے یا دولت کی فراوانی کافی نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ جانے کتنے لوگ مشہور ہو جاتے جو نہیں ہو سکے۔

بس اسی لمحے انھوں نے اپنی زندگی کے آئندہ چالیس سال ایک ایسی درس گاہ کو بخش دیے کہ جس میں انھوں نے اپنا پہلا قدم اٹھارہ سال کی عمر میں رکھا تھا، اور اپنی زندگی کے آخری سالوں میں کہا تھا، میں مطمئن ہوں کہ میں نے صحیح قدم اٹھایا۔

سر سیّد احمد خان سے وہ کیا ملے ان کی زندگی گزارنے کا رخ ہی بدل گیا۔ انھوں نے بس ٹھان لیا کہ اب انھیں اپنے خطے کے مسلمانوں کے لیے کام کرنا ہے۔ تعلیمی محاذ پر، تہذیبی محاذ پر، اخلاقی محاذ پر اور علمی محاذ پر بھی۔ وہ سیاست میں آگئے۔ ایک ایسی سیاست میں جس کے ذریعے وہ مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا علاج کر سکیں۔ سو، ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے صدر چنے گئے، حالاں کہ وہ عوامی رہنما ہرگز نہیں تھے، لیکن ان کا ہر کام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہوتا تھا۔ وہ ماہرِ تعلیم بھی نہیں تھے، لیکن ان کا شمار ان حضرات میں ضرور کیا جاتا ہے جو علم کے شیدائی ہوتے ہیں، اور جو چاہتے ہیں کہ دنیا کا ہر فرد علم کی روشنی سے

مالا مال ہو۔ بے شک انھیں یہ وصف اپنے آبا و اجداد سے ملا تھا، وہ اسی خانوادے کے چشم و چراغ تھے جس کی سرپرستی میں دنیا کی پہلی جامعہ الازہر قاہرہ میں قائم ہوئی تھی۔ وہ اس درس گاہ سے منسلک ہو گئے جسے سرسیّد نے بنایا تھا۔ ایم اے او کالج ہرگز یونی ورسٹی نہ بن پاتی اگر سلطان شاہ آغا خان اس کی مدد کو نہ آتے، مالی مشکلات کے حل میں انھوں نے اتنی بڑی رقم اس ادارے کو دی جو آج کے کروڑوں میں بنتی ہے اور اس جدوجہد میں انھوں نے ہندوستان کے سارے شہروں کا دورہ کیا اور چندہ جمع کیا۔ ۱۹۲۰ء میں یہ کالج یونی ورسٹی بن گیا اور سرسیّد کے خواب کو تعبیر مل گئی۔

حاضرینِ کرام! اس وقت آپ میں سے کوئی موجود نہیں تھا، مگر میں موجود تھی، اور میں اس وقت انھیں مبارک باد دینے والوں میں شامل تھی جب انھوں نے اس یونی ورسٹی کے پہلے پرو چانسلر کے عہدے کا حلف اٹھایا تھا۔

اس دولت مند شخص کے پاس دنیا بھر میں گھر موجود تھے۔ کراچی کی ایک پریس کانفرنس میں ایک صحافی نے ان سے سوال کیا:

What is your nationality? Your Highness!

ان کا جواب ملاحظہ کیجیے:

I am a citizen of the world.

ان کے اس جواب کے وقت بھی میں موجود تھی، اور جب اسی صحافی نے ان سے دوسرا سوال کیا:

But where is your home?

تب اس کا ذو معنی جواب تھا:

My home is in my suitcase.

ان کی شہریت کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں تھیں کہ وہ لیگ آف نیشن کے صدر تھے، ہندوستان میں بمبئی اور پونا میں ان کے محل تھے۔ یوں لوگ کہتے کہ وہ ہندوستان ہی کے شہری ہوں گے۔

مگر وہ پیدا تو کراچی میں ہوئے، تقسیم کے بعد لوگوں کا خیال تھا کہ ان کا پاسپورٹ پاکستان کا ہوگا۔

مصر کے بادشاہ انھیں چچا کہتے تھے، سو وہ کیا مصر کے شہری تھے۔ ایران کے شاہ ایران بھی انھیں چچا ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ وہاں بھی تو ان کا گھر تھا۔ پھر وہ ایرانی ٹھہرے، لندن میں بھی گھر تھا بس وہ انگلستانی تھے۔

لیکن انسان خواہ کچھ بھی کہے، کچھ بھی کرے، تقدیر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، اور اکثر تقدیر کی چالیں کامیاب بھی ہوجاتی ہیں۔

سر شاہ سلطان کو سیاحت بھی پسند تھی، بس وہ ہٹلر کی چالوں میں پھنس گئے اور سوئٹزر لینڈ میں رہنے پر مجبور ہوگئے۔ یہ جنگ دوم کے اثرات تھے۔ یوں ۱۱؍ جولائی ۱۹۵۷ء کو مصر کی سرزمین نے انھیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنالیا۔

حاضرینِ کرام! علامہ اقبال کے ساتھ پیدا ہونے والا شخص اگرچہ مصر میں سو رہا ہے، لیکن اسے ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان ہرگز نہیں بھول سکتے۔ آج آغا خان پیدا ہوئے تھے سات دن بعد علامہ اقبال کی تاریخِ پیدائش ہے۔ دونوں کی ایک سو اکتالیس ویں سال گرہ ہے، کیوں نہ ہم سب مل کر کہیں ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔

معزز حاضرین! سچ سچ بتاؤں۔ میں نے ابتدائے آفرینش سے آج تک بہت سے انسانوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی زندگیوں کے لمحے لمحے سے آگاہ ہوں۔ بے شک دنیا کی قوموں نے اپنے عظیم الشان رہنما پیدا کیے ہیں، مگر مجھے اجازت دیں کہ میں یہ کہہ سکوں کہ برِصغیر کے سرسیّد احمد خان اور قائداعظم کے درمیان ایک پل کا فریضہ انجام دینے والا، سر سلطان محمد شاہ آغا خان جس کے ڈھیروں القاب ہیں، بے شمار خطابات ہیں، بڑی قربانیاں ہیں، بڑی فتوحات ہیں۔ وہ بڑا مخلص تھا۔ حق کا طرف دار تھا، بے انصافی سے نفرت کرتا تھا، اپنے عقیدے کے مُریدوں کا وفادار تھا۔

وہ بہت بڑا انسان تھا۔ آپ نے اسے کتابوں میں پڑھا ہے، لیکن میں تو اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ رہی ہوں۔ میں جو کچھ کہوں گی سچ کہوں گی، اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔

حاضرینِ کرام! میں کون ہوں؟ یہ سوال آپ کے ذہن میں اُس وقت سے آپ کو بے چین کیے ہوئے ہے جب سے یہ مقرر آپ سے مخاطب ہے۔

تاریخ آپ کو بہکا سکتی ہے، کتاب آپ کو جھٹلا سکتی ہے، لیکن میں سچ بولتی ہوں، سچ جسے صراطِ مستقیم بھی کہتے ہیں۔

جہاں بہکنے اور بھٹکنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔

میں زمین پر اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں۔

میں اپنا تعارف آپ سے کراتی ہوں۔

میں شخص کی شخصیت کے ساتھ ساتھ چلتی ہوں۔

''میں روحِ عصر ہوں۔''

حاضرینِ کرام! روحِ عصر کی کہانی کو نوشابہ صدیقی کی زبانی سننے کا شکریہ۔

O

مختار مسعود... جو آج اپنی درس گاہ میں موجود ہیں☆

آج میں اس درس گاہ میں موجود ہوں جہاں میرے آبا و اجداد نے دامے، درمے، سخنے مقدور بھر خدمت کی ہے۔ پردادا مولوی عبدالصمد نے غازی پور میں سرسیّد کے قیام کے دو سال ان کی رفاقت میں گزارے۔ صبح شام کی بیٹھکیں۔ ادبی شامیں، مشاعرے کی محفلیں اور سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے دنوں میں ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ جس کا حق سرسیّد نے ظہور گیٹ کی جنوبی دیوار پر ان کا نام کندہ کرکے ادا کردیا کہ یہ نام اس عظیم درس گاہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جڑ گیا۔ دوسرے پردادا قاری محمد علی نے اپنا فارسی مجموعۂ کلام اسی درس گاہ کے پریس سے چھپوایا اور سرسیّد کی اس پکار پر ہمیشہ ساتھ دیا کہ ''محمد علی چندے کی رقم کچھ اور بڑھادو، درس گاہ کو اس کی ضرورت ہے۔'' جواب دیا، ''نام نہ لکھنا، ذکر نہ کرنا، لو میں نے رقم کچھ اور بڑھا دی ہے۔''

شکریہ کا خط وصول کیا۔ دادا مولوی ابوالحسن نے آئی ای ایس کی نوکری سے سبک دوش ہوکر علی گڑھ کی خدمت اپنے آپ پر فرض کرلی۔ وہ بنارس کمشنری میں پہلے مسلمان بی اے تھے۔ بعض بھولے بھالے لوگ ان کا سر ٹٹول کر اور ناپ کر دیکھتے تھے کہ کتنا بڑا دماغ ہے اس لڑکے کا کہ اس نے بی اے کرلیا ہے۔ یہ قصہ ۱۸۹۹ء کا ہے۔

☆۔ شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا۔

وہ مسلم یونی ورسٹی کورٹ اور ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بنے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے قریبی دوست اور ریاضی کا مضمون ان کا جرم بن گیا۔ یوں سائنس کالج کی بنیاد کے ہی وقت وہ یہاں سائنس کے پہلے استاد مقرر ہوگئے کہ مسلمانوں میں اُن دنوں کوئی فزکس اور کیمسٹری کا استاد نہیں مل سکتا تھا۔ سو، انھیں اس زمانے میں اعلیٰ تنخواہ یعنی ساٹھ روپے ماہوار پر اس لیے سائنس کا استاد بنا دیا گیا کہ ریاضی کا استاد چاہے تو سائنس پڑھا سکتا ہے۔ تنخواہ اکثر تو ملا ہی نہیں کرتی تھی، یا وہ خود کبھی کالج کو بطور عطیہ دے دیا کرتے کہ کالج کی مالی حالت کچھ بہتر نہ تھی۔

مولوی ابوالحسن اپنے زمانے کے بے حد شوقین، خوش پوشاک اور انگریزی میں اوّل درجہ حاصل کرنے پر اقبال گولڈ میڈل حاصل کر چکے تھے۔ انگریزیت کے دل دادہ یوں تھے کہ اپنے بیٹے اور پوتے کو ہمیشہ انگریزی میں خط لکھتے۔ ہیٹ کبھی نہیں پہنی اور نماز کبھی نہیں چھوڑی۔ انگلستان کے سلے سوٹ پہنتے۔ بعد میں شیروانی زیب تن کی اور انگریزی لباس کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔

میرے والد حسن عبداللہ کو ڈاکٹر ضیاء الدین نے خود تار دے کر غازی پور سے علی گڑھ بلایا۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ وہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں اور علی گڑھ میں ان کی ضرورت ہے۔ حسن عبداللہ نے اپنے گھر حسن منزل سے ایڈووکیٹ کی تختی اتاری اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی خدمت میں حاضری دے دی جہاں ان کے بہ قول حسن عبداللہ سے زیادہ ایمان دار اور میرِ سامان ہندوستان بھر میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکتا تھا۔ یہ بات رشید احمد صدیقی نے ''گنج ہائے گراں مایہ'' میں اپنے شاگرد پر لکھے گئے خاکے میں شامل کر کے محفوظ کر دیا۔ لہٰذا دوسری عالمی جنگ کے دوران کنٹرولر آف اسٹور کا عہدہ ان کے لیے قائم کیا گیا اور اُنھیں سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ حسن عبداللہ نے اپنے محسن ڈاکٹر ضیاء الدین کے اس اعتماد پر پورا اتر کر ایک مثال قائم کی جہاں کی مقررہ تنخواہ اپنے والد کی پیروی کرتے ہوئے اکثر درس گاہ کے سپرد کر دیا کرتے اور کہتے مجھے میرے اللہ اور میرے ابا نے تو کھانے بھر کو دے رکھا ہے۔

شام کے اوقات میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، نواب حبیب الرحمٰن شیروانی کے ساتھ مولانا سیّد سلیمان اشرف کی مجلس میں حاضری دیتے جو ممتاز ہاؤس کے سامنے چبوترے پر

منعقد ہوتی۔ علامہ اقبال بھی گاہے گاہے علی گڑھ اور بہ صد شوق ''خانقاہِ سلیمانیہ'' میں حاضری دیتے۔ زندگی میں جتنا کام کر سکتے تھے کیا۔ شاعری کی، سماجی خدمات انجام دیں، علی گڑھ کی ادبی علمی فضا میں اپنے آپ کو ضم کر دیا اور تقریبات منعقد کرنے اور کرانے میں اپنے آپ کو ناگزیر بنا دیا، مگر اللہ تعالیٰ سے عمر کی مہلت لانا بھول گئے تھے سو، صرف چار دہائیاں گزارتے ہی اپنی درس گاہ کے اس خاموش ہوسٹل یعنی منٹو E میں جا سوئے اور قیامت تک وہیں سوتے رہیں گے، اور بند آنکھوں سے اپنی مادرِ علمی کی چہل پہل میں شامل رہیں گے۔

تیسری پشت کے حسن اختر نے صرف چھ سال کی عمر میں سحر انگیز علی گڑھ میں قدم رکھا، اور اپنا جسم، جان، دل اور دماغ سب کچھ گروی رکھ دیا۔

انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ تحریکِ آزادی میں شریک رہے۔ ملک تقسیم ہوا۔ درس گاہ چھوڑی۔ باپ کی قبر پر آخری بار فاتحہ پڑھی اور نئے وطن کی تعمیر میں اپنی صلاحیتوں کا نذرانہ پیش کرنے روانہ ہو گئے۔ وہ میرے بھائی تھے۔ ہم سب چھوٹے بھائیوں کی طرف سے اس شہر کی خدمت میں آخری سلام پیش کیا۔

میں آج اسی درس گاہ میں ایک مسافر کی طرح آئی ہوں۔ پردادا، دادا، والد اور بھائی کی طرح کوئی کارنامہ تو انجام نہیں دیا۔ بس رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور عبیداللہ درانی کی گود میں کھیلتی کھیلتی جب نئے وطن پہنچی تو ساری تعلیم وہاں حاصل کی، مگر تین پشتوں کی تاریخ کی بو سونگھنے کا سودا دل میں سمایا ہوا تھا۔ آئی تو اجنبی کی طرح تھی، مگر لی ہاتھوں ہاتھ گئی۔ باپ دادا کی خدمات تاریخ ہمیشہ سنبھال کر رکھتی ہے۔ سو، آج کام آئی، مگر درس گاہ تھی نا، امتحان لینا نہ بھولی۔ مجھ سے کہا گیا کہ صرف دو ماہ قبل وفات پا جانے والے مختار مسعود پر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ میرے نصاب سے باہر کا سوال تھا اور اسے لازمی سوال کے طور پر حل کرنے کی ہدایت کی گئی۔

مختار مسعود ایک جن تھے میں ایک بونا، مگر اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ مجھ میں اور مختار مسعود میں ایک بات تو ملتی جلتی ہے۔ وہ ہے معاشیات کا مضمون۔ میں کراچی یونی ورسٹی کی طالبہ اور وہ مسلم یونی ورسٹی کے طالبِ علم۔ بس اسی مشترکہ صفت نے مجھے کچھ بولنے کا حوصلہ عطا

کیا اور مجھے لگا کہ جیسے مختار مسعود ابھی اس وقت بھی اپنی درس گاہ میں موجود ہیں۔ سامنے کھڑے ہیں، اور کہہ رہے ہیں کہ چلو کچھ تو کہو۔ تم نے "آوازِ دوست" بھی پڑھی ہے، "لوحِ ایام" کا بھی مطالعہ کیا ہے اور "سفر نصیب" بھی۔ "حرفِ شوق" تو ابھی اس شہر تک پہنچی بھی نہیں۔

میں نے اپنی تین نسلوں کی ڈیڑھ سو سالہ مدت کو ذہن سے پہل بھر میں جھٹکا دیا۔ سوچا کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحے بن مانگے مل جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ حالات اور اللہ تعالیٰ اتنا مہربان کیوں کر ہو گیا کہ ہم تو اس لائق تھے ہی نہیں۔ کہاں یہ شہر علی گڑھ، کہاں یہ درس گاہ اور ایک چھوٹی سی بچی جس نے نہ ابھی پڑھنا سیکھا تھا نہ لکھنا۔ نہ ٹھیک سے چلنا پھرنا۔ آج اسی بچی کو اللہ تعالیٰ نے انعام کے طور پر اس شہر کے چند صبح شام، درس گاہ کا یہ گوشہ اور روسٹرم قابلِ قدر مقام بخش دیا ہے۔

چار دہائیاں روسٹرم پر ہر صبح بولتی رہی۔ بلیک بورڈ پر ڈائیگرام بنا کر قیمتوں کے اتار چڑھاؤ، طلب و رسد کی لکیریں اور افراطِ زر اور تفریطِ زر کا مفہوم سمجھاتی رہی، لیکن یہ شان محسوس نہ کی جتنا اس روسٹرم پر آپ سے مخاطب ہونے پر خود کو بڑا اور اہم سمجھ رہی ہوں۔

اس عزت افزائی پر آپ کا شکریہ۔ مختار مسعود جو اس درس گاہ کا طالبِ علم تھا اور جس نے اپنے نئے وطن میں یہاں سے حاصل کی ہوئی تعلیم اور تربیت کا اس قدر بہتر استعمال کیا کہ اُس کے وطن نے اس کا ماتھا چوما اور اسے بہتر سے بہتر مقام پر فائز بھی کیا۔ میں کچھ یوں مخاطب ہوئی۔

بعض شہر، یوں معتبر ہو جاتے ہیں کہ اُس شہر میں کچھ ہنر مند رہتے ہیں اور بعض درس گاہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں کے طالب علم اپنی جھولی میں علم کے بیش بہا موتی ہی نہیں، بلکہ جینے اور جیتے رہنے کے تمام گُر، تمام آداب اپنے جسم و جاں میں سمیٹ کر اور جھولی میں بھر کر اپنے داخلے کی مدت گزر جانے کے بعد بادلِ نخواستہ رخصت ہوتے ہیں۔ لاہور شہر میں ایک ایسا ہی ہنرمند سکونت پذیر ہو گیا۔ اپنی درس گاہ سے سیّدی تحفہ علم اور تربیت اپنی جھولی میں ضرورت سے زیادہ بھر کر قواعد کے مطابق رخصت ہوا۔ یہ درس گاہ کرۂ ارض پر اپنی نوعیت کی بس ایک ہی ہے۔ شہر علی گڑھ کی مسلم یونی ورسٹی جسے تحفے کے طور پر تمام دنیا کے بے ہنروں کو

ہنرمند بنانے کے لیے سیّد نے جی جان، دعا، تمنا اور بے انتہا ہمت و محبت کے ساتھ عطا کی ہے۔

ذکر ہے اس لعلِ گہر کا جسے ماں باپ نے مختار مسعود کا نام بخشا۔ جو اس دنیا میں ہمیشہ جینے کے لیے آیا تھا کہ بڑے لوگ مالکِ حقیقی کی جانب سے انعام کے طور پر دنیا پر اتارے جاتے ہیں اور ایسے ہی لوگ سزا کے طور پر کسی شہر، ملک اور درس گاہ پر اترنے سے روک بھی لیے جاتے ہیں کہ دینے والے کو اپنے عطیے کی رسوائی اور ناقدری گوارا نہیں ہوتی۔ مختار مسعود کو اللہ تعالیٰ نے شہر علی گڑھ اور اس کی درس گاہ پر انعام و اکرام کے طور پر عطیہ کیا تھا۔ ہاں یہ مان لینے میں کیا ہے کہ شہر علی گڑھ اور اس کے مایہ ناز درس گاہ نے اسے اپنایا۔ مانجھا، چمکایا، محبت اور دعاؤں سے رخصت کیا۔ پھر اس نے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو بامقصد گزارنے کا عہد کیا اور اپنے اساتذہ کے دیے ہوئے درس کو اپنے اندر سمو کر پھر دنیا کو وہ کچھ دیا کہ جس کے باعث وہ ہمیشہ جیتے رہنے کا مشکل ترین کام کر گیا۔ مختار مسعود نہ مرے ہیں نہ مریں گے، کیوں کہ جب انھوں نے درس گاہ کے نام رخصت کی عرضی بھیجی تب اُن کا کُل اثاثہ سیاہ شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامہ، ڈھیروں کتابوں کا نچوڑ، اساتذہ کے ایک ایک جملوں میں معنی کا سمندر ان کی مٹھی میں تھا۔ سیاہ شیروانی سے انھوں نے مساوات کا پہلا سبق سیکھا تھا۔ جامے کی تراش میں علی گڑھ کا سارا فیض شامل تھا، اور جب رہنے کے لیے وطن چنا تب ان کا کُل اثاثہ جناح کیپ تھی۔ ایک تحریک جو علی گڑھ شہر سے شروع ہوئی تھی، اس سے وابستگی کی علامت یہی کیپ تھی۔

ہاں ساتھ میں ایک آٹو گراف بک یا البم بھی تھا جس کے مختلف صفحات میں اُن کا ماضی، ماضی کی تمام یادیں تھیں۔ وہ تمام دوست وہ لوگ جنھوں نے ان کو متاثر کیا تھا ورق ورق میں وہ زندہ تابندہ موجود تھے اور ان کے سفر کے ساتھی بن چکے تھے، اور شاید اُسی وقت انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی آئندہ زندگی کو ان ہی لوگوں کی یاد اور بسر کی ہوئی راہ کو اپنے جینے اور جیتے رہنے کی بنیاد بنائیں گے۔ اپنے والد کے کہنے پر انھوں نے ایک آٹو گراف بک خریدی جس کی قیمت صرف چھ آنے تھی۔ اُس وقت وہ آٹو گراف بک اُنھیں بہت مہنگی لگی تھی اور زندگی کے آخری ایام گزارتے ہوئے جب ان کے پاس نوٹوں اور

سکوں کی تعداد اُن کی ضروریات سے زیادہ تھی تب بھی اُنھیں وہ آٹو گراف بک بیش قیمت ہی لگتی تھی، کیوں کہ اُن دنوں کی وجہ کچھ اور تھی اور اِن دنوں کی وجہ کچھ اور۔

پہلا آٹو گراف ایک مسلم چینی عالم محمد ابراہیم شا کیو چن کا تھا۔ وہ ایک طویل سفر پر نکلے تھے۔ ان کے دستخط کی بدولت خود وہ بھی ایک سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ یہ سفر اپریل ۱۹۱۷ء تک جاری رہا۔ جب تک وہ دنیاوی اور جسم و جان کی رعایت کی مدت لے کر دنیا میں آئے تھے۔ دوسرا صفحہ بھرنے کی اُنھیں جلدی تھی کہ بچپن میں ہر کام جلدی جلدی اور بغیر مقصد کے سرزد ہوتا ہے، مگر والد نے روک دیا۔ ہدایت ملی کہ آٹو گراف البم کے صفحات ہوں یا زندگی کا ورقِ سادہ اُنھیں یوں ہی نہیں بھرنا چاہیے۔ جاؤ نگہِ انتخاب کو کام میں لاؤ۔ بڑے آدمی زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔ ان سے تعارف کے لیے کارلائل سے مدد مانگو۔ ان سے ملاقات کے لیے پلوٹارک کے پاس جاؤ، اُن کو سمجھنے کے لیے سعدی سے لے کر شموئل تک سب کے سب دروازے پر دستک دو۔ راہ کا نشان اتنا واضح ملا تو سفر بھی شروع ہوگیا۔

پہلی منزل نہ عظیم مصنف تھے نہ ضخیم کتابیں۔ یہ سفر تو بچوں کی کہانیوں کی چھوٹی سی پگڈنڈی پر شروع ہوا۔ اسکول میں انعام تقسیم ہوئے تو ایک کتاب جس کا عنوان ''بہادر لڑکا'' تھا، اُن کے حصے میں آئی۔ ایک ولندیزی بچے کی کہانی جو سرما کی ایک شام سمندری پشتے پر جا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک چھوٹے سے سوراخ پر پڑی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ گاؤں جا کر اس کی خبر کرے گا تو اتنی دیر میں پانی کے زور سے پشتے میں شگاف ہوجائے گا اور پھر وہ ساری بستیاں اور وہ سارے کھیت جو سطحِ سمندر سے نیچے ہیں غرق ہوجائیں گے۔ وہ اس سوراخ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ رات آئی تو وہ اسی حالت میں سو گیا۔ پہلے سردی اور پھر موت سے اس کا جسم اکڑ گیا، مگر ننھا سا ہاتھ جوں کا توں پشتے کے چھوٹے سے سوراخ پر رکھا رہا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کا محسن ایک بہادر لڑکا ہے۔ اُن کے سفر کی یہ پہلی منزل تھی۔ اس کا نقش دوسری ساری منزلوں سے گہرا اور روشن ہے۔ یہ منزل جرأت اور قربانی کی منزل تھی۔ اس کے بہت سے نام ہیں اور وہ نام جس سے اس کی ساری عظمتیں عیاں ہوتی ہیں، شہادت کہلاتا ہے۔ انھوں نے از خود اس بہادر بچے کی اس انگلی کو اپنی آٹو گراف بک پر دستخط

کے طور پر محفوظ کرلیا۔ پھر اُنھوں نے سوچا کہ ماضی کو پکڑو گے اور مستقبل پر نظر رکھو گے تو حال بے حال نہیں ہو پائے گا۔ سو، انھوں نے ماضی کی لی ہوئی دستخطوں اور دستخط دینے والی شخصیتوں کو اپنی زندگی سے اور عمل سے کبھی خارج نہیں کیا۔ مستقبل پر نظریں جمائے رکھیں تب وہ حال جو ماضی کے ایک سرے سے شروع ہوتا ہے مستقبل کے آخری نکتے پر ختم ہوتا ہے۔ خوش گوار اور کامیاب گزرتا ہے۔ ہاں دستخط دینے والی شخصیتوں کا انتخاب اس فہم سے ہوتا ہے جسے درس گاہ تحفے کے طور پر دیتی ہے۔ درس گاہ نے جو فہم دیا اُن میں قطار در قطار وہ شخصیتیں سمٹ آئیں جو مشعلِ راہ بن گئیں۔ ای ایم فارسٹر، مفتی کفایت اللہ، حکیم اجمل خاں، ملا واحدی، حسرت موہانی، فقیر حسرت موہانی نے صرف اپنا نام لکھا تھا۔ فقیر کے نکتے نہیں ہیں اور موہانی تو صرف شوشے دار نصف دائرہ اور ایک ٹیڑھی لکیر ہے۔ نقطے نہ سہی وہ شخص تو نکتہ سنج تھا، لکیر سیدھی نہ سہی وہ خود تو ساری زندگی صراطِ مستقیم پر چلتا رہا۔ خط بد خط سہی خود شاعر تو خوش نوا تھا۔ ظفر علی خاں کی دستخط یوں لی کہ وہ ہر چٹان سے ٹکرا گئے جسے باطل سمجھا۔ دشمن بنانے اور زیر کرنے میں وہ مہارت رکھتے تھے۔ دشمن کی طاقت اور تعداد سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ شاعری کو محفلِ مشاعرہ سے نکال کر اکھاڑے میں کھڑا کردیا کہ کبھی کبھی شاعری سے یہ کام لینا پڑتا ہے۔ ایک تقریب میں صرف اس لیے گئے کہ ظفر علی خاں تقریر کررہے تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو اسکول کے اس بچے نے آٹوگراف ان کے آگے کردی۔ انھوں نے لکھا بجز اللہ کے اور کسی قوت سے نہ ڈرو۔ یہ ۲۳ر اگست ۱۹۴۰ء کا دن تھا، اپنے پہلو میں بیٹھے ایک شخصیت کے سامنے کردیا۔ انھیں اچھا نہیں لگا کہ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ وہ کون ہیں۔ ان صاحب نے اسی ورق پر ان کی تحریر کے نیچے انگریزی میں اپنے دستخط کیے اور تین الفاظ لکھ دیے: Truth, Hope اور Endeavour۔ انھیں کبھی اس مشہور اجنبی کا نام معلوم نہیں ہو پایا۔ وہ کہتے ہیں، میں نے سوچا قدرت جو دانے دانے پر مہر لگاتی ہے وہ صفحے صفحے پر دستخط بھی تو ثبت کرتی ہے۔

زبان پر مکمل عبور، لکھنے والے کی تحریر کو دوام بخشتا ہے۔ انھیں چوں کہ اردو اور فارسی پر عبور تھا لہٰذا نپی تلی نثر احتیاط کے ساتھ برتی ہوئی تراکیب، مختصر مگر جامع جملوں نے ان کی

کتابوں ''آوازِ دوست''، ''سفرِ نصیب'' اور ''لوحِ ایام'' کو پڑھنے والوں کے لیے ٹھنڈا میٹھا شربت بنا دیا ہے۔ پڑھنے والے پڑھ کر سیر ہو جاتے ہیں۔ مزاج میں شگفتگی سی در آتی ہے۔

انھوں نے ایک ضرب المثل کو اپنا دستور العمل بنالیا تھا۔

جب انسان دولت کھودے تو کچھ نہیں کھوتا۔

اگر حوصلہ کھودے تو بہت کچھ کھو جاتا ہے۔

آبرو چلی جائے تو قریب قریب سب کچھ کھو جاتا ہے۔

لیکن روح مر جائے تو سب کچھ مٹ جاتا ہے۔

یہ ضرب المثل ہمیشہ ایسے انسان کے کام آتی ہے جو انتقال کے بعد بھی زندہ باد کہلاتا ہے۔ مختار مسعود نے اپنے والد سے، اپنی درس گاہ سے، اپنی کتابوں سے، اپنے اساتذہ سے اور چن کر جن شخصیتوں سے آٹوگراف لیے ان سے یہی کچھ سیکھا۔

ہر ورق سے کوئی شخصیت کوئی یاد اٹھ اٹھ کر گلے ملنے لگتی ہے۔ زندگی کا ورق بھی تو کتاب ہی جیسا ہے۔ ہر ورق پر داستانِ حیات کی جھلکیاں بکھری ہوتی ہیں۔ ہر ورق پر کوئی دوست کوئی بڑا انسان اپنی تمام تر قوت کے ساتھ کھڑا ملتا ہے۔ ہم زندگی میں جس سے ملتے ہیں یا جس کے بارے میں پڑھتے ہیں وہ از خود اس کتاب کا قصہ بن جاتا ہے۔ مختار مسعود بھی ایسی ہی کتابوں کے ورق میں سجے سجائے کھڑے ہیں۔ کتاب کا مالک مر جاتا ہے کتاب اور اس کی داستان کبھی نہیں مرتی۔ ''لوحِ ایام''، ''سفرِ نصیب'' اور ''آوازِ دوست'' جیسی کتابیں بھلا کہاں گم ہو سکتی ہیں۔

شخص دنیا سے چلا جاتا ہے شخصیت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

○

علیگ قلم مزدور... حسن اختر

آج بارہ دسمبر ہے۔ پانچ سال قبل حسن اختر علیگ قلم مزدور دنیا سے چلے گئے۔ آباو اجداد پر انھیں فخر تھا۔ ان کے پس ماندگان کو ان پر فخر ہے۔

غازی پور یوپی سے قریب ایک گاؤں تھا جسے ان کے بزرگوں نے بسایا تھا۔ وہ لوگ عشقِ رسول ﷺ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پہلے بزرگ جن کا مزار گاؤں شروع ہوتے ہی آج بھی موجود ہے، ٹوٹے پھوٹے پس ماندہ سے اس گاؤں میں جہاں اب ایک گھر بھی سلامت نہیں، کچھ نے ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں میں ہجرت کی اور کچھ نے تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کا رُخ کیا۔ شان دار مسجد موجود ہے جو وقف کی ملکیت ہے۔ وہاں ہر مذہب اور مسلک کے لوگ آج بھی در کے سوالی بنے دعائیں مانگتے بیٹھے ہیں۔ قبرستان میں چند قبروں کی اٹھان قبرستان کا پتا دیتی ہیں۔ نہریں سوکھ گئی ہیں۔ کھیت اجڑ گئے۔ فصلوں نے اُگنا بند کر دیا، باغ کا وجود مٹ گیا۔ محل نما کوٹھیاں زمیں بوس ہوگئیں۔ کہیں کہیں کوئی ستون ہے۔ کہیں تھوڑی سی دیوار بچی ہے تو اس پر طاق نمایاں ہیں جو پرانے زمانے کے فنِ تعمیر کا پتا دیتے ہیں۔ دروازوں کی لکڑیاں چیخ رہی ہیں، لوہے زنگ آلود ہیں۔ درخت بوڑھے ہو چکے ہیں اور اب جھک کر دوبارہ زمین سے رشتہ جوڑ چکے ہیں۔ فضا میں سناٹا ہے، مگر سننے والے وہ آوازیں بھی سنتے ہیں جب ہرے بھرے اس گاؤں میں زندگی کا میلہ سجا رہتا تھا۔ ہاں ایک

کنواں ہے جہاں حسن اختر کے پُرکھوں کے ہاتھوں بنا۔ بے پانی کنواں اپنی تاریخ کی تختی سجائے جھاڑیوں کے درمیان خود تاریخ بنا موجود ہے۔ چاروں طرف جھاڑیوں نے اس تختی کو سمیٹا ہوا ہے جس پر تحریر ہے، یہ کنواں مولوی محمد علی کی یادگار ہے جس کی بعد میں دیکھ بھال ان کے بیٹے مولوی ابوالحسن نے جاری رکھی۔

مولوی محمد علی پردادا تھے۔ دنیا سے چلے گئے، ابوالحسن اس علاقے کے پہلے آئی ای ایس افسر تھے جو انڈین ایجوکیشن سروس کا مخفف ہے۔ انھوں نے خوب ترقی کی۔ کشمیر تک گئے۔ جہاں تعلیم کے وزیر مقرر ہوئے۔ گاؤں چھوڑا شہر میں مکان بنایا۔ حسن منزل کی تعمیر ہوئی جسے انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے نام کردیا۔ یہ بیٹا حسن عبداللہ تھا جس نے علم بھی حاصل کیا۔ شہرت اور عزت بھی کمائی، لیکن تھوڑی زندگی لے کر آیا تھا، باپ کی موجودگی میں بیٹا دنیا سے رخصت ہوگیا، لیکن نشانی کے طور پر اولاد دے گیا۔ حسن اختر ان کا ہی بیٹا ہے جس نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ باپ کو علی گڑھ کے قبرستان میں چھوڑا اور ماں کو لے کر پاکستان آ گیا۔

دنیاوی تعلیم میں یکتا، روزگار میں چوٹی تک پہنچا۔ خوب دنیا بنائی، خوب دنیا گھومی، خوب نام اور عزت کمائی، مگر سر جھکائے رکھا اور پھر سب کچھ چھوڑ کر اس نے قلم پکڑ لیا۔ قلم مزدور بن گیا۔ اگر فخر کرتا تو بس اپنے علیگ ہونے پر۔

عشقِ رسول ﷺ دل میں ایسا سمایا کہ جذبات اُمڈ اُمڈ کر صفحات پر بکھرنا شروع ہوگئے۔ حدیثِ دل لکھی۔ حدیثِ راز لکھا۔ ہدیۂ دل پیش کیا۔ ''الحبیب الحبیب''، ''البیان''، ''ندائے حرم''، ''خطباتِ نبوی ﷺ''، دل کہاں بھرا ۶۶۲ صفحات کی ''وسلّموا تسلیما'' تحریر کرڈالی۔

رات دن ایک سا تھا۔ ہاتھ میں قلم۔ صفحات پر حروف۔ دل کا زیر و بم آنکھوں میں اُمڈے آنسو بس اسی میں عمر کے چھیاسی برس بیت گئے۔ میلادِ مصطفیٰ ﷺ، ذکرِ مصطفیٰ ﷺ، محفلِ مصطفیٰ ﷺ، مصطفیٰ ﷺ تو ان کے ہر طرف تھے کہ بیٹے کا نام بھی ان سے جوڑ دیا۔

اللہ بھی تو ہے۔ نظر تو کسی کو بھی نہیں آتا، مگر اپنی موجودگی کا احساس تو دلاتا ہے۔ آپ نے آج تک اللہ تعالیٰ پر ایک کتاب بھی نہیں لکھی؟ میں نے پوچھا۔

اللہ خود مصنف ہے بہت بڑی کتاب کا۔ کیسے لکھوں اس پر۔ نہیں میں اس سے صرف

بخشش کی دعائیں مانگتا ہوں، اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس بات کا بھی شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے اپنا رسول دیا۔ اپنا سب سے پیارا پیغمبر ہمیں بخش دیا۔ یہ کہہ دیا، اسے مانو، اسے جانو، اسے چاہو۔ اس کے کہنے پر عمل کرو۔ مجھ تک پہنچ جاؤ گے۔ بس میں نے اس سیڑھی کو پکڑ لیا۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ ہر ایک کو یہ سیڑھی نصیب نہیں ہوتی۔ سامنے ہے، نظر بھی آتی ہے، مگر ہمارے ہاتھوں میں دنیا کی چکا چوند ہے جس کے باعث ہم اسے تھام ہی نہیں پاتے۔ ہاں ہمیں دنیا سے تھوڑا دل ہٹانا پڑے گا۔ اشارہ ملے گا۔ اجازت نصیب ہوگی۔ بس غلام حاضر ہو جائے گا۔ کہے گا:

نام لکھوں گا صرف ایک
اور کوئی نام ہے کہاں
جاؤں گا کس طرف کو میں
ایک ہی ہے سنگِ آستاں

بس اسی کو سامنے رکھو:

وہ تمام ایک جلوہ ، میں تمام ایک سجدہ
مری بندگی میں حائل ، نہ جبیں نہ آستانہ

جی میں اتنی عقیدت، اتنی محبت، اتنا جذبہ، اتنا ایمان پیدا کرنے کے لیے کتنی کوشش کرنی پڑتی ہے، شاید میرے بس میں تو نہیں۔ گناہ گار انسان جب اپنے گناہوں کو پہچانتا ہے تو ندامت کے آنسو خود بہ خود آنکھوں میں گھر کر لیتے ہیں۔ بس یہ چشمِ نم۔ رسائی کا آسان طریقہ ہے کہ ندامت کے آنسو تو پیغام ہوتے ہیں:

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ، میں ہوں امیر

نورِ مجسم ﷺ کا ذکر شروع کر دو۔ اندھیری راتوں میں۔ دن کے اُجالے میں۔ بھرے ہجوم میں۔ تنہائی میں۔ روشنی میں۔ گُھپ اندھیرے میں۔ بغیر ربط اور بے ترتیب الفاظ لیے قلم صفحات پر رکھ دو:

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
نوائے عشق پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اپنے دل کا راز کہنے سے پہلے پاک نیت سے وضو کرلو۔ بند آنکھوں سے روشنی دیکھو۔ دل کی ہلچل میں قرار ڈھونڈو۔ حرفِ راز کہہ دو:

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

پھر تمھیں ایک آواز سنائی دے گی۔ تم خود کہو گی:

ہم نے جاکر دیکھ لیا ہے حدِ نظر سے آگے بھی
نقشِ قدم ہی نقشِ قدم ہے نقشِ قدم سے آگے بھی

آؤ خیر کی طرف۔ آؤ فلاح کی طرف۔ آؤ محمد ﷺ کی طرف۔ اس اعلان کے بعد پراگندہ خیالی ختم ہوجاتی ہے۔ آبِ حیات اب تمھیں خود تلاش کرلے گا۔

محمد ﷺ کا دوسرا نام آبِ حیات ہے۔ آبِ حیات محمد ﷺ ہی کا ایک نام ہے۔ جانتی ہو آبِ حیات ہمیشہ زندہ رہنے کا مشروب ہے۔ جس نے پیا مر ہی نہ پایا۔ موت کو بھی موت آجاتی ہے کہ اس سے یہ مشروب دور رہا۔ گھونٹ گھونٹ سارے اولیائے کرام نے پیا ہے۔ سارے پیغمبروں نے پیا ہے۔ سارے عاشقوں نے پیا ہے کہ یہ تو عشقِ مصطفیٰ ﷺ سے تیار ہوا ہے۔ کیا اب تک کسی پیغمبر کو موت آئی ہے۔ کسی ولی نے موت کا مزہ چکھا ہے۔ کوئی عاشق مرا ہے۔ جسم کو نہ دیکھو روح کو دیکھو اس کے پیغام کو دیکھو۔ اس کے کردار کو دیکھو۔ اس کی طرزِ زندگی کو دیکھو۔

چلو دنیاوی ایک شخص کا نام لے کر سمجھاتا ہوں۔ سقراط کو تو جانتی ہو نا۔ مت اسے مذہب کے ترازو میں تولو۔ بس عاشق سمجھو علم کا۔ علم جو ہر مسلمان مرد اور عورت پر یکساں فرض کیا گیا ہے۔ اسی عالم اسی عاشق کو دیکھو۔ اسے ایک پیالہ ہاتھوں میں پکڑا دیا گیا۔ یہ کہہ کر اس میں زہر ہے۔ لو اسے پی لو۔ حکم ملا۔ اس نے کہاں انکار کیا کہ وہ تو علم کے عشق میں ڈوبا ہوا عاشق تھا۔ گھونٹ گھونٹ پیتا گیا۔ یہاں تک کہ پیالہ خالی ہوگیا۔ اسے موت سے کوئی

خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ زہر موت ہے، مگر بتاؤ کیا سقراط مر گیا؟ میں تم سے جواب نہیں مانگتا، بس ایک شعر سناتا ہوں:

اُس پیالے میں زہر تھا ہی نہیں
ورنہ سقراط مر گیا ہوتا

اچھا شعر ہے نا۔ مجھے امید ہے یقیناً تمھیں اس کی تشریح نہیں سمجھانی پڑے گی۔

انھوں نے یقین کے ساتھ کہا۔ جی میں آپ کی امید پر پوری اتر رہی ہوں۔

''سقراط آج تک نہیں مرا۔''

ہاں سقراط آج تک نہیں مرا کہ عاشق مرا نہیں کرتے۔

ایک بات بتایئے۔ میں ان سے کچھ اور بھی بات کرنا چاہتی تھی اور سوال کرنا چاہتی تھی، کیا آپ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہیں؟ میرا مطلب ہے ملازمت سے فراغت کے بعد لوگ اپنی وہ زندگی یاد کرتے ہیں جہاں مصروفیت ہوا کرتی ہے۔

ہاں میں بالکل مطمئن ہوں۔ تمھیں یہ خیال کیوں آیا؟ کیا اس لیے کہ اُن دنوں میں دنیا بھر میں سفر کرتا تھا۔ لوگ آگے پیچھے ہوتے ہیں، اور اب میں ایک کمرے میں اکیلا رہتا ہوں۔

نہیں، میں نے تو بس یوں ہی پوچھ لیا۔ عموماً انٹرویو کرنے والے ایسے ہی سوال کرتے ہیں۔

اچھا تو تم میرا انٹرویو لے رہی تھیں؟ مگر میں نے آج تک کسی کو انٹرویو نہیں دیا۔ میں بڑا آدمی نہیں۔ کم از کم میں اپنے آپ کو اتنا اہم نہیں سمجھتا۔ میں نے اپنے دفتر میں بھی اپنے سے کم عہدے والوں سے مقابلہ نہیں رکھا۔ اپنی آمدورفت پر کسی کو کھڑے ہو کر استقبال کرنے سے باز رکھا۔ بے شک یہ دفتری آداب ہوتے ہیں، لیکن اس میں کچھ رعونت کا عنصر بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔

لیکن کسی درس گاہ میں طالب علموں کا کھڑے ہونا تو معیوب نہیں۔ مجھے اپنے استاد ہونے اور طالب علموں کے کھڑے ہوجانے پر انھیں منع نہ کرنا شرمندگی کا باعث محسوس ہوا۔

نہیں تم غلط سوچ رہی ہو، درس گاہیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہاں طالب علم ہوتے ہیں

اور انھیں یہاں آداب سیکھنے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ ضروری ہے۔

ان کے اس جواب نے مجھے سکون دیا۔ میری سوچ بھی یہی تھی۔

آپ نے ابھی میرے سوال کا جواب نہیں دیا ہے۔

جواب یہی ہے کہ میں مطمئن ہوں۔ لکھنے کے لیے تنہائی چاہیے۔ وہ مجھے میسر ہے۔ میں نے کئی کتابیں لکھ لی ہیں۔ میں نے "وسلموا تسلیما" لکھی۔ نہیں نہیں میں نے نہیں لکھی۔ بس یہ تو مجھے کسی غیب کی آواز نے لکھوادی۔ تب یہ میڈیا کے کچھ لوگوں تک پہنچی اور یہ آگئے۔ انعام و اکرام اور اعزاز کی بات ہوئی۔ میں نے جواب دیا میں چھوٹا سودا نہیں کرتا، اور ایسا تو ہرگز نہیں جو میرے ساتھ نہ جائے۔ بس دنیا ہی میں رہ جائے۔

مطلب؟ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

وہ کہتے تھے کہ آپ انعام کے مستحق ہیں۔ تشہیر بھی ضروری ہے۔ آپ کا تعارف ہونا چاہیے۔ میں نے جواب دیا میرا تعارف جہاں ہونا چاہیے تھا میں بس اسی جگہ کا طلب گار ہوں۔ مجھے جہاں سے انعام ملنا چاہیے بس اسی کا منتظر ہوں۔ روزِ قیامت۔ حشر کے میدان میں عدل کے ترازو میں تولے جانے کے بعد۔

یقیناً اس روز آپ کو اس کا انعام ملے گا۔

تمھیں یقین ہے۔ انھوں نے پوچھا۔

ہاں۔ اللہ تعالیٰ تو اس تک کی جزا مقدر میں لکھ دیتا ہے کہ جب ہم راستے سے کوئی کنکر کوئی پتھر کوئی رکاوٹ ہٹا دیتے ہیں۔

تمھاری دی ہوئی مثال اچھی ہے۔ کام بہت چھوٹا ہے۔ محنت بھی نہیں۔ وقت بھی نہیں لگتا، بس صرف سوچ اور سوچ بھی مخلوق کے لیے۔

آپ کا خط بہت اچھا ہے۔ اتنا خوب صورت آپ کیسے لکھ لیتے ہیں؟

میں اس دنیا میں پیدا ہوا تھا جہاں لکھنے کی بھی مشق کرائی جاتی تھی تختی پر۔ مجھے تختی دھونی بھی آتی تھی۔ اس کی روشنائی بھی بنالیتا تھا، اور اس کا قلم بھی تراش لیتا تھا۔ اس دور کا ہر بچہ جس نے دل سے مشق کی اس کی تحریر اچھی ہوگئی۔

بد شوق بچے بھی تو ہوتے ہوں گے آپ کی گزری ہوئی بچپن کی دنیا میں، ہاں ہاں خود میرے گھر میں بھی ایسے بچے تھے۔ میرے ہم عمر تھے۔ مجھ سے بڑے بھی اور چھوٹے بھی، مگر شوق نہیں رکھتے تھے۔

جانتی ہو ہمیں اماں نے سب سے پہلی تعلیم جو دی تھی وہ کیا تھی؟ صبح اٹھ کر پہلے کلمہ پڑھو پھر گھر بھر کے سب لوگوں کو سلام کرو۔ میں کلمہ پڑھنے کے بعد ہر ایک کے پاس جاتا سب کو سلام کرتا بدلے میں دعائیں ملتیں۔ پھر میں اپنی بکری کے پاس جاتا اس کی پیٹھ سہلاتا۔ اس کے کان مجھے بہت پسند تھے۔ انھیں دونوں ہاتھوں میں لیتا۔ اسے بھی سلام کرتا۔ وہ فوراً جواب دیتی۔ کبھی ہلکی آواز میں کبھی زور زور سے۔ وہ منہ اوپر اٹھا لیتی۔ میں خوش ہوتا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے، کیوں کہ وہ صرف میرے نام کی بکری تھی۔

''آپ کے نام سے کیا مراد ہے؟''

بھئی اس زمانے میں ہر بچے کے نام سے کوئی نہ کوئی جانور پالا جاتا عموماً وہ بکری یا مرغی ہوتی ہمارا بہت بڑا سا گھر تھا۔ صحن کے آخری کنارے میں مرغی کے دڑبے تھے جس میں ہر رنگ کی مرغی اور مرغے ہوتے۔ ساتھ ہی کھونٹا ہوتا جس میں کئی بکریاں بندھی ہوتیں جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوتے۔ لال پیلے نیلے تا کہ ان کی پہچان بھی رہے اور وہ اچھی بھی لگیں۔ پہچان اس لیے کہ وہ کسی نہ کسی بچے کے نام پر لائی جاتی تھیں۔ اگر وہ بچہ کبھی بیمار ہوتا تب نام کی مرغی یا بکری ذبح کر کے اس کا گوشت غریبوں کو دے دیا جاتا تھا۔ اسے صدقہ کہا جاتا اور بچہ اس صدقے سے ٹھیک ہو جاتا تھا، پھر یہ کہ غریب کو گوشت مل جاتا۔ ہمیں یہی سکھایا جاتا تھا۔ جس بچے کی مرغی یا بکری ذبح ہو جاتی وہ بچہ خوب روتا۔ اس کے لیے دوسری آ جاتی۔

ہمیں دسترخوان پر کھانا کھانے کی تربیت بھی دی جاتی۔ ہمارے ایک پردادا تھے ان کا بڑا رعب تھا۔ وہ حافظ تھے، قاری تھے، شاعر تھے اور نام ور وکیل بھی تھے۔ انھیں سیاست کی بھی بڑی سوجھ بوجھ تھی۔ بڑے بڑے سیاست دان ان سے مشورے کے لیے آتے۔ ہمارے گھر مشاعرے کی بھی محافل ہوتیں۔ ان پردادا کا نام حافظ محمد علی تھا قاری تخلص

کرتے۔ صاحبِ دیوان بھی تھے۔ سرسیّد احمد خان کے گہرے دوستوں میں تھے۔ غازی پور میں ان کے گھر محفلیں منعقد ہوتیں۔ ہمیں ہمیشہ سکھاتے، بچو جھک کر کھاؤ۔ شاید اس لیے کہ کپڑوں پر سالن نہ گرے، یا دسترخوان خراب نہ ہو۔ ایک دن میں ان کے سامنے بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ دیکھا ان کی ڈاڑھی میں چاول اٹکا ہوا تھا۔

میں نے فوراً نصیحت کی، ''دادا جھک کر کھاؤ۔''

پھر تو وہ بہت شرمندہ ہوئے ہوں گے۔

نہیں۔ ہنسنے لگے، کہا، اچھا بیٹا معاف کردو۔ آئندہ جھک کر کھاؤں گا۔

پھر سب سے مخاطب ہوئے، ''دیکھو میرا یہ چھوٹا سا بیٹا میرا ہی دیا ہوا سبق اب دوسروں کو دینے کے قابل ہوگیا ہے۔''

بس اسی دن میں نے سمجھ لیا کہ میں بڑا ہوگیا ہوں۔ اب میں نے اپنی زندگی میں بہت سے احتیاط کو شامل کرلیا تھا۔ جس کے باعث غلطیاں کم سے کم ہوتی گئیں۔ ابا اماں نے مجھے بہت اچھا بیٹا مان لیا تھا۔ یہ میرے لیے فخر کا مقام تھا۔

پھر مزید فخر کرنے کے لیے مجھے سرسیّد کے ادارے پہنچا دیا گیا۔ میں اوّل آنے والا طالب علم تھا۔ اس لیے مجھے آفتاب ہوسٹل ملا۔ پڑھنے کو انجینئرنگ کالج تھا جہاں مجھے اپنے ہی ابا کے عزیز ترین دوست عبید اللہ درانی صاحب ملے جنھیں ہم گھر پر درانی چچا کہتے اور یونی ورسٹی میں ''سر''۔ وہ خاموشی سے میری زندگی میں داخل ہوتے گئے۔ ابا جلد ہی دنیا سے چلے گئے اور اپنا جانشین چھوڑ گئے۔ پھر میری دنیاوی اور دینی پرورش ان کے ہاتھوں میں آگئی۔

برِصغیر تقسیم ہوگیا۔ ہم تحریک کے طالبِ علم تھے، مگر ہمیں جب پتا چلا کہ جو لکیر دو ملک بنانے کے لیے کھینچی گئی ہے، اس میں وہ حصہ تو ہمارے حصے میں آئے گا ہی نہیں۔ جس کے لیے ہم نے قائد کے ساتھ نعرے لگائے تھے۔ نہ ہی ہمارا گاؤں، ہمارا شہر، ہمارا کالج، نہ وہ مکان جس کے صحن میں ہماری بکری اور مرغیاں پالی جاتی تھیں۔ نہ درس گاہ نہ آفتاب ہوسٹل، حتیٰ کہ وہ قبرستان بھی وہاں رہ گیا جس میں ہمارے ابا نے اپنا دو گز کا گھر بنایا ہوا تھا۔

تب ہم بہت روئے۔ ہمارے چچا نے سمجھایا کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔

ہماری امّاں نے کہا، بیٹا میرا باپ میری ماں بھی اسی حصے میں رہ گئی ہے۔ ان کی قبروں کی تختی پر جب ان کا نام دھندلا جائے گا اور جب وہ زمانے کے دست بُرد سے گھبرا کر گر پڑے گی تب اسے دوبارہ لگانے والا کوئی نہ ہوگا۔ میں بھی یہ سب کچھ چھوڑ دوں گی۔ چلو کہ ہم اپنے حصے والے دیس چلتے ہیں۔ یوں ہم پاکستان آگئے۔ ہاں میں ہمیشہ کے لیے پاکستان آگیا۔ اپنا گاؤں، اپنا شہر، اپنا ہوسٹل اور اپنی درس گاہ، زمین، باغ، کنواں، کھیت، پھل، اناج کے ڈھیر سب کچھ جو ہماری ملکیت تھے، ہم نے سب چھوڑ دیے۔ ہم نے ہجرت کر لی۔ سنتِ نبوی ﷺ پر عمل کیا۔

کبھی پچھتائے؟

نہیں۔ کبھی نہیں۔ حضور ﷺ بھی نہیں پچھتائے تھے۔

کبھی دوبارہ جانے کی آرزو کی؟

ہاں آرزو ہمیشہ جوان رہی، لیکن خوف غالب رہا۔ خوف کے باعث کبھی نہیں گیا۔

خوف، کیسا خوف؟

وہی کہ ایک بار اگر گیا تو وہ محبت جو مجھے وہاں کی چیزوں سے تھی وہ مجھے واپس نہیں آنے دے گی۔ میری درس گاہ، میرا گھر، میرے ابّا کا قبرستان، یہاں میری ماں میری جدائی میں مرجائے گی۔ میری بیوی بچے، بہن بھائی، اب میں اتنے رشتوں کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آواز بھرائی ہوئی تھی۔

اچھا چلیں کچھ اور باتیں کریں۔ میں نے ماحول بدلنے کی کوشش کی۔

آپ کے ابّا نے آپ کی پیدائش پر ایک نظم کہی تھی، آپ کے پاس ہے؟

نہیں میرے پاس نہیں، مگر اب جب کہ تم نے ان کا کلام مرتب کر دیا ہے تب اس میں وہ نظم مجھے مل گئی۔

بڑے کمال کے انسان تھے وہ بھی۔ کٹر مسلمان۔ اچھے شاعر، فرماں بردار بیٹے، بیوی کی قدر کرنے والے شوہر اور اپنے بچوں پر جان نچھاور کرنے والے باپ۔ ایمان دار اتنے ایمان دار کہ ان کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ان کا تقرر کرتے وقت کہا تھا کہ ان سے

زیادہ ایمان دار، اور میرِ سامان ہندوستان بھر میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ یہ جملہ ان کے استاد رشید احمد صدیقی نے ان پر خاکہ لکھتے ہوئے ''گنج ہائے گراں مایہ'' میں شریک کر کے انھیں امر کردیا۔ تھوڑی سی زندگی لے کر آئے تھے۔ دنیا سے جاتے جاتے آخری شعر یہ کہہ گئے:

ہم زندگی کے واسطے مرجائیں گے حسؔن
جب کوئی اور زیست کا ساماں نہ کر سکے

دیکھو مر کر بھی لوگ کیسے امر ہو جاتے ہیں۔ اپنے ابا کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ان کے لہجے میں تازگی بھر آئی تھی۔

میں نے وہ نظم پڑھنی شروع کردی جو ان کے ابا نے ان کی پیدائش پر کہی تھی:

کسی کی آمد آمد تھی مجھے تھا انتظار اس کا
مری راتیں بہت اختر شماری میں کٹیں تنہا
وہی میں تھا وہی زنداں فلک کی سمت آنکھیں تھیں
سراپا گوش تھا میں اور دل میں ایک دھڑکا تھا
یکا یک میں نے دیکھا اک ستارہ دفعتاً چمکا
ضیا سے جس کی صبحِ تازہ کے تڑکے کا دھوکا تھا
امید و بیم سے ہیجان جو تھا ہوگیا زائل
وہ ساعت آگئی صد شکر جس کا منتظر میں تھا
طلوع ہوتے ہی اس کے محفلِ انجم ہوئی پھیکی
نہ زہرہ رقص میں تھی اور نہ سیاروں میں نغمہ تھا
بریدِ آسماں نے یہ خبر ہر سمت پھیلائی
طلوع ہونے میں خورشیدِ منور کو تأمل تھا
نظر آتا حسؔن مجھ کو نگوں سر اخترِ جوزا
وجہ پوچھی ندا آئی حسن اختر ہوا پیدا

آپ کو انھوں نے ایک شعر میں یوں دعا بھی تو دی تھی:

ہو عمرِ خضر و جاہِ سکندر اسے عطا
ثابت قدم ہو راہِ شریعت پہ دائما

کوشش تو کی ان کی دعا پر پورا اتروں، مگر— شاید.....

مگر یا شاید ہرگز نہیں۔ آپ نے ان کی دعا پوری کی۔ آپ ثابت قدم رہے۔ اچھے اچھے کام کیے اور آپ کی یہ انگلیاں۔ میں نے ان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

یہ انگلیاں کبھی فنا نہیں ہوں گی۔ کہتے ہیں جسم فنا ہو جاتا ہے۔ ہاں ہو جاتا ہے، مگر جن کی انگلیوں نے پورا قرآن لکھ دیا ہو۔ ڈھیروں کتابوں میں اپنے رسول ﷺ کی خدمت میں اپنے عشق کا اظہار لفظوں میں کیا ہو۔ انگلیوں کو حرکت دی ہو۔ وہ انگلیاں فنا کیسے ہو سکتی ہیں؟

وہ مسکرائے۔ واقعی یہ تو میں بھی جانتا اور مانتا ہوں اللہ کا کلام اور محمد ﷺ سے عشق بس دنیا میں اور رکھا بھی کیا ہے۔

ان کی آواز میں یقین تھا۔ وہ کئی ماہ سے بستر پر تھے۔ اٹھنے بیٹھنے اور بات تک کرنے میں انھیں تکلیف ہوتی تھی، میں نے ان سے اتنی باتیں کر ڈالی تھیں۔

مجھے معاف کر دیجیے۔ آپ تھک گئے ہوں گے۔

نہیں۔ اچھا کیا تم نے۔ آج اتنی باتیں کیں۔ ہمارے تمھارے ابا اور اماں ایک ہی تھے نا۔ وہ دونوں چلے گئے اب میں بھی جانے والا ہوں۔ دعا کرو کچھ دن کے لیے چل پھر سکوں۔ تھوڑی سی طاقت چاہتا ہوں۔ تھوڑی سی اور مہلت چاہتا ہوں اپنی ساری تحریریں جمع کر کے تمھیں دے دوں گا۔ بس اور کچھ تو کیا دوں گا۔ تمھیں ہمیشہ مجھ سے یہ شکوہ رہا کہ میں نے تمھاری مرغی اور طاق میں رکھی گڑیا اُسی گھر میں کیوں رہنے دی جسے عمر بھر کے لیے ہمیں چھوڑ کر آنا تھا۔ سنو، مرغی آ نہیں سکتی تھی اور گڑیا کو ہمارے اُس گھر کی حفاظت کے لیے چھوڑ آیا تھا کہ تم نئے ملک میں بڑی ہو جاؤ گی۔ کتابیں پڑھو گی۔ کتابیں لکھو گی۔ اور پھر تم نے ایسا ہی کیا نا؟ وہ ہنس بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ میں صرف رو رہی تھی کہ وہ دھیرے دھیرے جا رہے تھے۔ ایک اور ہجرت کرنے اور ہمیں اب اپنے ساتھ لے بھی نہیں جا رہے تھے۔

وہ حسن اختر جو اپنی ہر تحریر پر لکھتے علیگ قلم مزدور وہ میرے اکیلے بڑے بھائی تھے۔

○

بچپن کا دوست... انور شعور

میرا قد بہ مشکل چار فٹ رہا ہوگا، بال کندھے تک جنھیں پونی ٹیل بنا کر رکھتی۔ دوپٹا اذان سنتے اور نماز پڑھتے وقت ضروری اور شوقیہ اوڑھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا شوق۔ اُن دنوں ہر اخبار بچوں کے صفحے چھاپتا تھا۔ میرے گھر ''امروز'' آتا تھا۔ بس میں نے اس اخبار میں کہانیاں لکھنی شروع کردیں۔ افضل صدیقی بچوں کے اچھے بھیا تھے جو ہماری تحریریں کاٹ چھانٹ کر اور اکثر اصلاح کرکے چھاپ دیا کرتے۔ اس سارے دن ہم اکڑ اکڑ کر چلتے پھرتے اور رات دیر تک نیند نہیں آتی۔ ان ہی دنوں اچھے بھیا نے ''بزمِ امروز'' کی بنیاد رکھی تاکہ وہ بچے جو لکھتے ہیں، آپس میں مل بھی سکیں۔ پہلی میٹنگ اردو کالج میں ہوئی جہاں اوپر کی منزل میں بابائے اردو مولوی عبدالحق رہتے تھے۔

ہم سب کو اخبار کے ذریعے دعوت نامہ ملا کہ ہمیں وہاں آنا ہے، کیوں کہ آج بزمِ اردو کا افتتاح ہوگا۔ ان دنوں ہم سب انفرادی طور پر اکیلے آنے جانے کے قابل نہیں تھے۔ نہ گھر سے اجازت ملتی تھی نہ راستے آتے تھے، مگر ہم نے اپنے اسکول کی ان سہیلیوں کو راضی کرلیا جو لکھتی بھی تھیں، پڑھنے کی بھی شوقین تھیں اور ہمارا دائرۂ احباب بھی بس یہی تھا۔

بابائے اردو سے ملاقات تو اپنی جگہ اہم تھی ہی، لیکن دل میں ان تمام لکھنے والوں سے

ملنے کا شوق قابلِ دید تھا جو اب تک صرف تحریروں کے ذریعے ہمارے دوست تھے صورت آشنا نہیں تھے۔ پھر بھی ہم ایک دوسرے کو خط لکھا کرتے اور ان کی تحریروں پر تنقید کرتے رہتے کہ ان دنوں خط لکھنا بھی باقاعدہ مضمون لکھنے جیسا فن مانا جاتا تھا۔

ہم نے ان تمام دوستوں کو اسی دن دیکھا۔ ان ہی میں ایک انور افسری بھی تھے جو خوب صورت نظمیں لکھتے اور ماہانہ تنقید جب ان کے حصے میں آتی تب اس ماہ چھپنے والے تمام مضامین اور نظموں پر منظوم تبصرہ کرتے۔ ہم سب ان کے قلم کی مہارت سے رعب میں آجایا کرتے اور افضل صدیقی بھی انھیں خوب سراہتے۔ کچھ ہی دنوں پہلے انور افسری نے میرے مضامین پر منظوم تبصرہ کیا تھا اور خط کے ذریعے میں نے پسندیدگی ان تک پہنچا بھی دی تھی۔ انور افسری سے بالمشافہ ملنا مجھے بہت اچھا لگا۔ ہماری دوستی ہوگئی۔ یہ وہ دوستی تھی جو اسکول کے حلقے سے نکل کر ہماری کسی سے پہلی پہلی دوستی تھی۔ ان میں ہارون رشید، ایم الیاس، بدر الدجیٰ، فصیح چغتائی، عرفان عابدی، رشید شکیب، طاہر نقوی، قدسیہ خان، نعیم ارشاد، سکندر خٹک شامل تھے۔ یہ دوستی آج تک سلامت ہے۔ ہم سب ایک ہی شہر میں رہتے ہیں اور اب بھی ملتے ہیں۔

آرٹس کونسل کی عمارت ان دنوں اتنی بڑی نہیں تھی، مگر موجودہ کاریڈور اس وقت بھی تھا جس میں ایک بک شاپ ہوا کرتی تھی جس میں بڑے بڑے ادیب اور شاعروں کی کتابیں شیشے سے جھانکتی ہمیں نظر آیا کرتیں۔ اکثر ہم ان شیشوں میں رکھی کتاب کے برابر ایسی کتابیں بھی رکھی دیکھتے جن پر ہمارا نام ہوتا، مگر پلک جھپکنے کے وقفے کے دوران وہ کتابیں شیشے کے پار سے چوری ہوجایا کرتیں۔ دوسرے کونے میں چند کرسیاں ہوتیں جو خاص ہمارے لیے رکھی ملتیں جن پر بیٹھ کر ہم ان ہی شاعر ادیبوں کی طرح اپنے مضامین اور شاعری ایک دوسرے کو پڑھ کر سناتے اور دوسرے اس پر تنقید کرتے۔ یہ آداب ہمیں ہمارے اچھے بھیا نے سکھائے تھے۔

ایسی ہی ایک نشست میں میری کہانی پر انور افسری نے تنقید کی تھی۔ ہم نے اس دن ان کے نام پر ''تنقید'' کردی۔ آج وہ انور افسر تھے۔ ہم نے کہا تمھارے نام سے 'ی' کیوں خارج ہوگئی۔ کہنے لگے، مؤنث سے مذکر ہوگیا۔ ہم سب ہنسے۔ خوب ہنسے۔ آج بھی ہمیں وہ

ہنسی یاد ہے۔ ان دنوں ہنسنے کی ''ٹیکنک'' کتنی مختلف ہوا کرتی تھی۔ ہنسی دل سے آتی تھی۔ اب صرف ہونٹوں پر بکھر جاتی ہے وہ بھی بس کبھی کبھی۔

بعد کی ایک اور نشست میں ملاقات ہوئی۔ اسی صبح کے اخبار میں نظم شائع ہوئی تھی، نام انور افسر شعور چھپا تھا۔ یہ ''شعور'' کہاں سے آ گیا؟ ہم سب نے ایک ساتھ سوال کیا تھا۔

قد بڑھنے، عمر بڑھنے اور عقل بڑھنے سے شعور تو آ ہی جاتا ہے، یہ انور افسر شعور کا جواب تھا۔

ہم سب ہی ایک دوسرے کو قابل سمجھتے تھے۔ بڑا ادیب اور بڑا شاعر بھی، مگر یہ حقیقت تھی کہ انور افسر کو ''شعور'' نام کے ساتھ لگانے کا حق سب سے زیادہ تھا سو، ہم نے اب انھیں انور افسر شعور مان لیا تھا۔

بعد کی تحریروں میں وہ انور شعور بن گئے۔ افسر اور افسری دونوں کو اپنے نام سے خارج کر دیا، اور آج تک وہ صرف انور شعور ہیں۔

انور شعور نے جس طرح اپنے نام کو درجہ بہ درجہ تبدیل کیا اسی طرح سیڑھی سیڑھی چڑھتے وہ شاعری کی اعلیٰ پائے دان تک جا پہنچے۔

ہم بچے نہیں رہے۔ افضل صدیقی زندہ نہیں رہے یوں بزمِ امروز کی محفلیں درہم برہم ہو گئیں، لیکن ہم سب تو دوست بن ہی چکے تھے، اور آج تک دوست ہیں۔ انور شعور سے دوستی پر ہم ہمیشہ نازاں رہے۔ اسے ایک بڑے شاعر کے طور پر دیکھتے ہوئے ہم اس پر کم اپنے آپ پر زیادہ فخر محسوس کرتے ہیں اور ہر ایک سے کہتے ہیں، انور ہمارا بچپن کا دوست ہے۔ ہماری ملاقات کم ہوتی، مگر تحریریں شوق سے پڑھا کرتے۔ اب زندگی زیادہ مصروف تھی۔ بڑی کلاسیں تھیں۔ ہم سب پڑھائی میں جٹ گئے اور اس کے بعد اچانک ہماری ملاقات انور شعور سے ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں'' کے دفتر میں ہوئی۔ ہم دونوں کی پہلی ملازمت اور ہم دونوں رسالے کے سب ایڈیٹر تھے۔ ہم دو مختلف کمروں میں بیٹھتے، ایک کمرے میں انور شعور کے ساتھ احفاظ الرحمٰن، نعیم آروی اور مجیب الرحمٰن شامی تھے اور دوسرے کمرے میں سعیدہ افضل، ریحانہ حاتمی اور میں۔ ہمارے ایڈیٹر نذیر ناجی اور بعد میں محمود شام تھے۔ الگ الگ کمروں کا تو بس تکلف تھا زیادہ تر وقت یا تو انور شعور میرے کمرے

میں یا میں انور شعور کے کمرے میں ہوتے اور اتنی باتیں کرتے کہ سچ مچ منہ دکھنے لگتا۔ ہر ایک کو ہماری بچپن کی دوستی اچھی لگتی، ہم خوش ہوتے کہ کیا عجب ہوا ہے کہ ہم دونوں نے ایک ہی ادارے میں ملازمت کی ہے، مگر پھر ایک دن میں نے صحافت چھوڑ کر تدریس کے شعبے کو اپنا لیا۔ پھر انور شعور بھی ''اخبارِ جہاں'' چھوڑ گئے۔

ہماری ملاقات برسوں نہ ہو سکی۔ ایک دن سڑک سے گزرتے ہوئے مجھے انور شعور کی آواز آئی۔ میں شکیل عادل زادہ کے رسالے ''سب رنگ'' میں ہوں تم ضرور آنا۔ میری گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں تو ابھی اس سے ملنے نہیں جا سکی تھی، لیکن وہ میرے گھر کے دروازے پر کھڑا دستک دے رہا تھا۔ ان دنوں کم گھروں پر کال بیل ہوا کرتی تھی۔ سوچتی ہوں گھنٹی کی آواز میں وہ اپنائیت کہاں جو دستک میں ہوا کرتی تھی۔ دوڑی دوڑی دروازے تک گئی تب انور شعور کو کھڑا پایا۔ خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ ''آجاؤ'' میں نے خوشی سے زیادہ جوش کے ساتھ آواز دی۔

انور شعور اپنی جگہ کھڑے ہی رہے۔ مجھے اوپر سے نیچے بغور دیکھا۔ ایسے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر آنکھیں بند کر لیں اور نظر جھکائے جھکائے کہا، ''غلط آ گیا۔ معاف کرنا۔ پھر آؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑے اور سیدھے گلی میں چلتے چلے گئے۔

میں دروازے پر کھڑی اسے دور جاتا دیکھتی رہی، انور نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا، مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی ہیں۔ اور پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ پہلے پہل تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اس طرح چلتے اور ان نظروں سے دیکھتے پہلے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ دروازہ بند کر دیا، مگر ذہن کی کھڑکی کھلی رہی۔

گزرے ہوئے سارے سال ساری ملاقاتیں ایک ایک کر کے سب یاد آ گئیں۔ انور شعور تم نے زندگی کی راہ پر چلتے چلتے یہ کیسا روگ اپنی جان کے ساتھ لگا لیا۔ مجھے دکھ ہے اس کا۔ ایسا دکھ جو کسی بہت اپنے کے لیے ہوا کرتا ہے۔ انور شعور میرا بہت اپنا تھا۔ میں اس لمحے سے پہلے نہیں جانتی تھی کہ میں اس کے لیے کتنی اپنی تھی۔

اس کی اٹھتی نظریں۔ اس کی جھکتی نظریں۔ پھر اعتراف کرنا کہ میں غلط آ گیا۔ پھر پلٹ جانا۔ مڑ کر بھی نہ دیکھنا۔ اس بے ہوشی اور بدحواسی میں بھی اسے اپنی بچپن کی دوست،

اس کی دوستی، لمبی گزری ہوئی رفاقت کا اس نے کس قدر احترام کیا۔

اس دن سے انور شعور میرا اور بھی اچھا دوست بن گیا۔ایسا دوست جس پر ہر قدم پر اعتبار اور بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ انور شعور نے اپنی یہ کیفیت کیوں اپنا لی۔ وہ خود بہتر جانتا ہے۔ میں نے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ میں احترام کے اس رشتے کے درمیان کوئی بال آنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

''می رقصم'' اس کی شاعری کا مجموعہ آیا۔ وہ ایک باکمال شاعر بن چکا ہے۔اس نے ہمارے گروپ کے تمام ساتھیوں میں سب سے اعلیٰ مقام حاصل کرلیا ہے۔ہمیں خوشی ہے اور اسی خوشی کو لے کر میں اس کتاب کی تقریبِ پذیرائی میں شرکت کے لیے چلی گئی۔اسے اسٹیج پر بیٹھا دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔ یہ اسٹیج وہی تو تھا جہاں وہ کبھی انور افسری ہوتا کبھی انور افسر۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک دن وہ انور شعور بن گیا تھا۔ کتابوں کی دکان جانے کس مصلحت کے تحت وہاں سے رخصت کردی گئی ہے ورنہ شیشے کے اس پار ''می رقصم'' شاید ہم سب مل کر رکھ دیتے، برسوں پرانا دیکھا خواب اپنے ہاتھوں پورا کرتے،مگر اب تو دنیا بھر کی کتابوں کی دکان کے ہر شیلف پر انور شعور موجود ہے۔

تقریب جاری تھی اس نے اپنا کلام سنایا، دوسروں نے اس پر اپنی اپنی رائے دی۔ یوں تقریب ختم ہوگئی، مگر ہوتا ہمیشہ یوں ہے کہ منزل انھیں ملتی ہے جو شریکِ سفر بھی نہیں ہوتے۔سفر پر روانہ کرنے والے افضل صدیقی افق کے اس پار تھے اور شاید وہ بھی خوش تھے۔ ہم سب اس کے ساتھی تو اس کے اردگرد تھے اور خوش بھی تھے۔تقریب ختم ہوگئی۔ اس کی نظر حاضرین میں موجود مجھ پر پڑی، دوڑا آیا۔ میں نے تہنیتی کارڈ اور گل دستہ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا، منہ سے کچھ نہیں بولی۔

اس نے پھر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس قیمتی موقعے کی کوئی چمک نہیں تھی، بلکہ مجھے تو اس کی آنکھوں میں چھپے آنسو نظر آرہے تھے۔ پتا نہیں آنسو تھے بھی یا نہیں۔ یا صرف میں نے محسوس کیا،لیکن اس وقت اس نے ایک بات کہی۔ وہ بات بھی بالکل اسی جملے کی طرح گہری اور اہم تھی جو ایک دن میرے گھر کے دروازے پر دستک

دینے کے بعد اس نے کہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا، شہرت کے اس سفر میں، میں نے اپنی پوری زندگی کھو دی۔ کس ڈگر پر چل پڑا بس بلا ارادہ۔ یہ وہ نقصان ہے جس کا ازالہ ممکن ہی نہیں۔ میں نے مکمل طور پر نقصان کا سودا کیا ہے۔

وہ اب بھی اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ بالکل دستک دینے والے دن کی طرح۔ ہارون رشید میرے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہم دونوں کو اس کے نقصان کا بخوبی علم تھا اور افسوس بھی۔

انور شعور کو اپنی شاعری مہنگی نظر آرہی تھی، لیکن دنیائے ادب نے انور شعور جیسا شاعر کم دیکھا ہے جو بلا تکان شعر کہتا ہے، کہہ سکتا ہے، جو روز قطعہ لکھتا ہے۔ جو حالاتِ حاضرہ کو روز شعر میں ڈھالتا ہے۔ وہ دوسرے چند قطعہ نگاروں کی طرح تُک بندی نہیں کرتا۔ وہ بامعنی شعر لکھ کر ہوا کے دوش پر ڈال دیتا ہے۔ وہ شہر کراچی اور اپنے وطن پاکستان کی منظوم تاریخ لکھ رہا ہے۔ روز لکھ رہا ہے۔ آنسوؤں کے ساتھ کامیابیوں کے ساتھ وہ دکھ سکھ کی داستان رقم کررہا ہے۔ آئندہ آنے والے لوگ اس کی شاعری سے پاکستان کے شب و روز جانیں گے۔ وہ تو ڈائری کے اوراق لکھ رہا ہے، اور ہم اس کے دوست اس کی اپنی زندگی کے زیاں کو جانتے ہیں، بلکہ وہ تو خود بھی اس زیاں سے واقف ہے، مگر واپسی کا اب کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔ وہ کچھ ایسا ہی سمجھ رہا ہے۔ وہ دن گزر گیا۔ پھر ایک دن میں نے انور شعور کو فون کیا۔

سنو، تم بہت اچھا لکھنے لگے ہو۔ میں اپنی طالبات کو بتاتی ہوں کہ تم میرے بچپن کے دوست ہو۔ پتا نہیں انھیں یقین آتا ہے یا نہیں۔ ایک دن کالج آجاؤ۔ اپنی شاعری سناؤ۔ بتاؤ میری طالبات کو کہ ہمارا تمھارا بچپن ایک ساتھ گزرا ہے۔

وہ ایک دن آگیا۔ انور شعور کے ساتھ حکیم ناصر بھی تھے۔ حکیم ناصر کی شہرۂ آفاق غزل کس نے نہیں سنی یا پڑھی ہوگی:

جب سے تو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے
سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے

دونوں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ کالج آڈیٹوریم طالبات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ سب داد دیتی رہیں اور انور شعور نے طالبات کو یقین دلایا کہ ہم دونوں دوست ہیں۔ سچے بھی اور پکے بھی۔

ایک دن پھر میں نے انور شعور سے فون پر لمبی بات کی۔ موضوع بہت سارے تھے۔ پھر میں نے کہا، میرے بیٹے کی شادی ہے کچھ لکھ دو۔

کہنے لگا، میں سہرا ہرگز نہیں لکھ سکتا۔

نہ لکھو سہرا، اس کے علاوہ کچھ لکھ دو۔

اچھا لکھ دوں گا۔ اس نے وعدہ کرلیا۔

دوسرے دن فون پر اس نے کہا، کاغذ قلم لاؤ میں بولوں گا تم لکھتی جانا۔ ابھی لکھ لو ورنہ بھول جاؤں گا۔

وہ بولتا گیا میں لکھتی گئی۔ کیا خوب صورت شاعری تھی، میں نے اسے شادی کارڈ پر چھاپ دیا۔ جس نے پڑھا شادی کا دن، تاریخ، مقام کم یاد رہا نظم کی تعریف ہر ایک نے کی۔ اتنی کی کہ شادی کی مبارک باد اس میں دب کر رہ گئی۔ پھول بن کے نام سے اس نے جو شاعری کی زبان میں دعوت دی، کتنی خوب صورت ہے:

آنے والی ہے تازہ بہار، ہو رہا ہے یہ بن پھول بن
کر رہا ہے خدا گھر کی تنہائیوں کو عطا
ہم قدم، ہم نفس
ہم زباں، ہم سخن
اس مسرت کے موقعے پر اے مہرباں
آپ بھی آیئے
آیئے عزت افزائی فرمایئے
دیجیے یہ دعائیں کہ دولھا دلھن
زندگی کی بہاروں میں پھولیں پھلیں

ان کے من کا چمن لہلہایا رہے
آسماں روشنی سے نہایا رہے

اور پھر اس نے کہا، نوشابہ صدیقی اپنی یہ نظم میں نے تمھیں دے دی۔ میں نے لے لی۔

انور شعور سے اپنی طالب علمی کے زمانے میں بھی دو سہیلیوں کی شادی پر رخصتی نظم لکھوائی تھی۔ جسے فریم کرا کے تحفے میں دے دی۔ انور شعور میری زندگی کے کسی دور میں بھی دُور نہیں رہا۔

اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے گھر آنے کا بھی بلاوا بھیج دیا۔ وہ حج کر آیا۔ میں نے کہا، انور شعور میرے گھر آؤ۔ آج ہم سب دوست مل کر تمھیں مبارک باد دیں گے۔ وہ میرے گھر آ گیا۔ اس بار اس نے دستک نہیں دی۔ میرے گھر اب گھنٹی بجتی ہے۔ اب ہر طرف کے شور میں بھلا دستک کی آواز کسے سنائی دیتی ہے۔ اسی لیے گھر گھر اب گھنٹی کا راج ہے۔

اس روز جب وہ دروازہ کھلنے پر گھر میں داخل ہوا تب اس کی چال میں اعتماد تھا۔ اس کی نظریں نیچی نہیں تھیں۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی اور اس نے کہا بھی تھا، آ سکتا ہوں نوشابہ صدیقی۔

ہاں آ سکتے ہو۔ پلٹ کر آج نہ جانا۔

ہم نے اسے گلاب سے گندھے ہار پہنائے۔ تحفہ دیا اور اس نے ہمیں کلام سے نوازا۔ ڈرائنگ روم میں جو رونق اس روز تھی، اس سے پہلے نہیں تھی۔ سارے دوست اس روز بھی جمع تھے اور انگلیوں پر گزرے سال گن رہے تھے۔ ہر ایک کا حساب ایک ہی تھا۔ آدھی صدی سے بھی زیادہ سال ہماری دوستی کے گزر چکے تھے۔ ہم جب پہلی بار ملے تھے ہمارے قد چار فٹ سے زیادہ نہیں تھے میرے بال کندھے تک آ پائے تھے جنھیں میں سمیٹ کر پونی ٹیل بنا لیتی تھی، اور میرے یہ سارے دوست شیو بنانے سے نا آشنا تھے۔

اس روز ہم نے تصویریں بنوائیں۔ یہ تصویریں ہمارے بچوں کے لیے تھیں۔ وہ بڑے ہو کر ہمیں ساتھ دیکھیں گے۔ ہر ایک کے بچے انگلی رکھ رکھ کر اپنے بچوں کو بتائیں گے کہ ہمارے ابا اماں یا دادا دادی کے یہ دوست تھے، اور انور شعور کو گروپ میں دیکھ کر ناز کریں گے کہ ہاں اتنا بڑا شاعر ان کا دوست تھا، اور ان کی دوستی ایک دو دن یا چند سالوں کی نہیں تھی یہ تو

ان کی پوری زندگی پر محیط تھی۔

میں نے اس لمحے انور شعور سے کہا بھی، یہ سوچو کہ ہم نے زندگی کو زیاں کے طور پر نہیں گزارا ہے۔ محبت اور دوستی زیاں کا سودا ہے ہی نہیں۔ اللہ پر یقین رکھو۔ بندوں سے محبت اور بے غرض محبت کے صلے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔

اس روز ہم نے جی بھر کے اس کی شاعری سنی، اس نے جی بھر کے سنائی بھی۔ کہنے لگا سچ جانو کسی مشاعرے میں اتنا مزہ نہیں آتا جتنا اس چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں تم لوگوں کے درمیان آرہا ہے۔ اس نے آگے بھی کہا، کسی سے مل کر اتنی خوشی نہیں ملتی جتنی تم لوگوں سے مل کر ملتی ہے۔ ہم سب کے درمیان ہماری ساری زندگی کھلی کتاب کی طرح ہے۔ ہمارے درمیان محبت اور خلوص کے سوا کوئی لین دین نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے سے جھوٹ کا ایک جملہ بھی نہیں بولتے، بلکہ ہمیں تو کچھ بھی کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ بے کہے ہم ایک دوسرے کے دل کی بات جان لیتے ہیں۔ ہم کبھی ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دیتے۔ دے ہی نہیں سکتے۔ بتاؤ ایسی محفل کتنوں کو نصیب ہے۔ اس دن انور شعور کی گفتگو میں چمک تھی۔ وہ دل سے ہنس رہا تھا اور دل سے بول رہا تھا۔

ہم نے سوچا غلط کہہ رہا ہے وہ۔ بھلا اسے ہمارے درمیان کیا مزہ آرہا ہوگا کہ اس کی سوچ، اس کی شاعری، اس کا فن کس قدر بلند ہے۔ اس کے لیے اسے ایسے ہی بلند اور بڑوں کی صحبت مزہ دے سکتی ہے۔ وہ تو شاعری کے اونچے پائیدان پر پہنچ چکا ہے، اور ہم سب ساتھی پہلی سیڑھی پر کھڑے بس اسے اونچا اور اونچا جاتے دیکھ سکنے کے قابل ہیں۔

میری سوچ منطقی طور پر شاید درست رہی ہو، مگر انور جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ وہ ہمارا دل نہیں رکھ رہا تھا کہ انور شعور تو معصوم سا ایک بچہ ہے۔ اس نے اپنا قد ایک دو فٹ اور بلند ضرور کر لیا ہے، لیکن اس کے اندر اب بھی ایک سچا پکا چھوٹا سا بچہ بیٹھا ہوا ہے۔ جس کے پاس کوئی مصلحت نہیں ہے۔ وہ تو بس سچ بول دیتا ہے۔ اس کا یہ سچ کہ ہم سب آج بھی اس کے دوست ہیں اور ہماری صحبت اسے بہت عزیز ہے کہ وہ تو ہمارا قد بلند کرنے میں لگا ہے، اور ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم چیخ چیخ کر کہیں کہ ہمیں پہچانو کہ صحبت سے کسی کو پہچانا جاتا ہے۔

کسی نے اس کی شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ انور کی زبان ہر شخص سمجھ سکتا ہے، بول سکتا ہے، مگر لکھ نہیں سکتا۔ کیا اچی بات کہی تھی اس نے۔ بھلا یہ شعر اتنی سادہ زبان میں کوئی لکھ سکتا ہے:

پہلے خط میں رہ گئی تھی ایک بات
کر دیا ہم نے روانہ دوسرا

انور شعور اپنے آپ سے، اپنی کاہلی سے شرمندہ شرمندہ رہتا ہے۔ عجیب ہے یہ شخص بھی کہ ہر دوسرا شخص اس کی شرمندگی پر رشک کرتا ہے۔ بھلا کوئی دوسرا کاہل روز شعر کہہ سکتا ہے اس قدر پابندی کے ساتھ۔

بس اس کا یہ ایک شعر سن لیں:

وہ مجھے ایسے ملا جیسے ملا کوئی نہیں
میں نے پوچھا کون ہے؟ اس نے کہا کوئی نہیں

فسانہ ہوگیا... نجم الحسن رضوی☆

نجم الحسن سے میری ملاقات پچاس سال قبل کراچی یونی ورسٹی میں ہوئی۔ ہم ایک ہی کلاس میں ایک ہی مضمون کے طالب علم تھے، لیکن اس وقت بھی ہم اجنبی کی طرح نہیں ملے تھے کہ اس سے قبل ہم روز نامہ ''جنگ''، ''بچوں کی دنیا'' اور رسالہ ''بھائی جان'' میں ساتھ ساتھ لکھتے رہے تھے اور ہم دونوں کے مشترکہ بھائی جان شفیع عقیل تھے۔

نجم الحسن بچوں کی کہانیاں لکھتے لکھتے بڑوں کی دنیا میں داخل ہو چکے تھے اور افسانے کے دنیا میں اپنا مقام بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ یونی ورسٹی کا یہ خوب صورت زمانہ ہماری دوستی کو مضبوط بنانے کے کام آیا۔ جب تک نجم الحسن کراچی میں رہے ہم ملتے بھی رہے اور ایک دوسرے کو پڑھتے بھی رہے۔ پھر وہ سینٹرل انفارمیشن سروس سے وابستہ ہو کر پنڈی، اسلام آباد اور کوئٹہ میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اپنے دفتری کام کے علاوہ اپنی تحریر ہم تک پہنچاتے رہے۔ یوں ہم نے ان کی ''چشم تماشا''، ''ہاتھ بیچنے والے''، ''پُرسے کا موسم''، ''ہمارا بدمعاشی نظام''، ''انٹرنیٹ کیفے''، ''آکسیجن''، ''دریا کا گھر'' کے ذریعے رشتہ جوڑے رکھا۔ ہم نے ان کی تمام تحریریں پڑھیں اور اس تعصب کے ساتھ پڑھیں کہ اگر رسالے کی فہرست میں چار افسانے ہوتے تب ہم بڑے سے بڑے لکھنے والے کا نام نظر انداز کر کے

☆۔ تعزیتی جلسے اور کتاب ''مٹی کا درخت'' کی رسمِ اجرا میں پڑھا گیا۔

سب سے پہلے نجم الحسن کے افسانے پڑھتے، اور دیگر کتابیں جو بھی ہمیں ملتیں، پہلی رات نجم الحسن کی کتاب کی نذر کرتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تعصب جائز رہا ہے کہ بہرحال نجم کہانی کار بعد میں ہیں پہلے ہمارے گہرے اور پکے دوست ہیں۔

نجم کہتے ہیں، ''ہر تخلیق کار اپنی تحریریں گم نام لوگوں کے نام نامعلوم پتوں پر ارسال کرتا ہے۔'' کبھی کبھی ایسا رہا ہے کہ ہم بھی گم نام اور نامعلوم پتوں پر رہنے لگے تھے۔ ایسا وقفہ ان پچاس سالوں میں بارہا آیا بھی۔ مجھے اب یہ خوش فہمی ہے کہ نجم الحسن کے نامعلوم پتے اور گم نام قاریوں میں ایک نام ایک پتا میرا بھی تھا۔ جب ہی تو میں جانے بوجھے بغیر کہ آج کل وہ کہاں ہے۔ اس کی تحریر سے ملاقات کر لیتی۔

نجم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''اسے ایسے کھانے اچھے لگتے ہیں جو جلد ہضم ہو جائیں ایسی دوستی جو دیر تک چلے، ایسے کپڑے جس میں آدمی کھو نہ جائے اور ایسے احباب جو سامنے موجود نہ ہوں تو بھی یاد رہیں۔''

ایک بار ہم دبئی میں برسوں بعد ملے۔ ملنے سے قبل فون پر گفتگو ہوئی، ''پہچانو میں تمھاری کلاس فیلو ہوں۔'' ظاہر ہے میں اکیلی خاتون کلاس فیلو تو نہیں تھی۔ نجم نے کئی نام دہرائے، مگر سرِفہرست میرا ہی نام پکارا۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ ملنے آئے تو اپنی تین کتابیں تحفے میں لے آئے، پھر گھنٹوں ہم نے دبئی ساتھ میں چھان مارا۔ ایسا لگا زندگی پیچھے کی طرف چلی گئی ہے اور ہم یونی ورسٹی کاریڈور میں اِدھر سے اُدھر پھر رہے ہیں۔ اس رات دبئی کی روشنی میں دُگنا اضافہ ہو گیا تھا۔

نجم الحسن اپنی تحریر میں جو اسلوب اختیار کرتے ہیں وہ بہت مسحور کر دینے والا ہوتا ہے۔ اندازِ بیاں قاری کو اپنے جال میں لپیٹ لیتا ہے۔ وہ نکلنا بھی چاہے تو چاہ کر بھی نہیں نکل پاتا۔ ساری کہانی ختم کر لیتا ہے پھر بھی خیالوں میں کئی گھنٹے اپنے آپ کو جکڑا پاتا ہے۔ وہ اپنی تمام تحریروں کو اپنے اندازِ تحریر سے منفرد اور پرکشش بنا دیتے ہیں۔ موضوع اور ماحول کا ایک ایسا تانا بانا بن جاتا ہے کہ پڑھنے اور پڑھتے رہنے کا دل چاہنے لگتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں تازگی ہوتی ہے۔ اندازِ بیان نیا پن لیے ہوتا ہے۔ دونوں ہی مل جائیں تو کہانی پُرلطف بن جاتی ہے۔

نجم الحسن نے صرف افسانے ہی نہیں لکھے ہیں، انھوں نے ناول اور بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھیں۔ صرف اردو ہی نہیں انگریزی زبان پر بھی اپنی گرفت کا لوہا منوایا ہے۔ ایسے لکھنے والے پر رشک کرنے کا جی چاہتا ہے۔ میں تو حسد جیسی بری لت میں بھی پڑ جاتی اگر نجم میرا دوست اور کلاس فیلو نہ ہوتا۔

''ماروی اور مرجینا'' نجم نے دبئی چھوڑنے کے بعد کراچی میں لکھی اور لکھتے رہنے کے دوران مجھے آگاہ کرتے رہے کہ میں اس ناول کے تانے بانے برسوں سے بُن رہا ہوں، ختم ۲۰۱۱ء میں ہوئی۔ کتاب کی تعارفی تقریب بھی منعقد ہوئی اور ایوارڈ سے بھی نوازی گئی، اور مجھے نجم کے ہی ہاتھوں سے اپنے ڈرائنگ روم میں ملی۔ پڑھا اور مزہ آ گیا۔ میں نے نجم سے کہہ بھی دیا کہ اسے کوئی نہ کوئی ادارہ ایوارڈ سے ضرور نوازے گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔

نجم الحسن اپنی تعریف اور اپنی تحریر کی تعریف بیگانگی سے سنتے ہیں۔ یوں انھوں نے میری پیش گوئی بھی سنی اَن سنی کردی تھی۔

''آوازِ پا'' ان کی یادوں پر مشتمل خوب صورت جملوں، مکالموں اور گزرے دنوں کے مختلف موسموں کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

اکثر قلم کار جب پچاس ساٹھ سال تک لکھتے لکھتے تھک جاتے ہیں تب اپنی سوانحِ عمری لکھنے لگتے ہیں۔ اکثر سوانحِ عمری پچاس فی صد جھوٹ پر مبنی ہوتی ہے، یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسرا کوئی ہوش مند میری اس رائے سے اتفاق بھی کرے، لیکن جو لوگ قلم کی حرمت کو سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک قلم ''سچ'' کا علم بردار ہوتا ہے وہ یقیناً احتیاط برتتے ہیں۔ لہٰذا لکھنے والوں سے قریب ترین شخص ہی اس پر تبصرہ کرے تو سچ مانا جاسکتا ہے۔ گویا سچ کے لیے گواہ کا ہونا ضروری ہے یا خود لکھنے والا معتبر ہو اور دروغ گوئی کو گناہ سمجھتا ہو۔

نجم الحسن یوں معتبر ہیں کہ ان کی ''آوازِ پا'' کے کردار ہمارے درمیان رہے ہیں ہم سے کچھ پہلے کے بھی ہیں، مگر جانے پہچانے ہیں۔ سو، نجم نے ان کے بارے میں جو بھی لکھا سچائی کے ساتھ لکھا، لوگوں سے زیادہ انھوں نے زمانے کی تصویر کھینچی ان جگہوں کی کہانی لکھی جس سے ایک دو نہیں درجنوں لوگ وابستہ رہے ہیں۔ لہٰذا وہ سب گواہ بن گئے۔ پھر اُن کے

یہاں ''میں'' جیسی خود پسندی بھی نہیں۔ کئی جگہ تو ہم نے سارے احوال میں نجم الحسن کو ڈھونڈنا چاہا کہ وہ خود کہاں ہیں؟ جو لوگ خود پسندی کے موذی مرض میں مبتلا نہیں ہوتے سب ہی کو اچھے لگتے ہیں۔ سو، مجھے بھی نجم الحسن اچھے کیوں نہ لگیں۔

نجم الحسن کو کراچی میں ٹک کر رہنا شاید اچھا نہیں لگتا۔ جب ہی تو ''آوازِ پا'' کی اشاعت کے فوراً بعد وہ امریکا روانہ ہوگئے۔ وہ اس سے پہلے بھی امریکا گئے تھے، مگر اپنی بیٹی کی چاہ میں۔ اس بار جاتے ہوئے نجم الحسن مجھے اچھے نہیں لگے۔

جانے سے قبل تین راتیں میں نجم الحسن سے گفتگو کرتی رہی۔ ایسے جیسے میں اس کی بڑی بہن ہوں، اور بڑی بہن ماں کے بعد از خود ماں کا رشتہ اپنا لیتی ہے۔

نجم گھبرانا نہیں، حوصلہ بلند رکھنا، یہ مرض مقابلہ کرنے سے ڈر جاتا ہے، بھاگ جاتا ہے، پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا، جو ڈر گیا وہ مر گیا۔ تم ہرگز نہیں ڈرنا۔ میں نے کہا، یہ مرض تمھاری تحریروں میں اور بھی پختگی لانے کے لیے آیا ہے۔ یہ درد کی دنیا سمیٹ لے گا۔ تمھارا قلم پُرسے کا موسم بڑی شدت سے لکھنے کے قابل بنائے گا۔ تم ایسے ہی نکھر کر آؤ گے جیسے تانبے کا برتن قلعی ہوجانے کے بعد چمکتا دمکتا ہے۔ امریکا کا ڈاکٹر تمھارا علاج ضرور کرے گا، مگر تمھاری بیٹی کی کاری گری زیادہ کام آئے گی اور یقین رکھو رشید بٹ کی، شہریار جلیس کی، میری اور تمھارے تمام معلوم اور نامعلوم قاریوں کی دعائیں تمھارے ساتھ ہوں گی۔ میں نے کئی آزمودہ وظیفے اور دعائیں بھی اسے حفظ کرادیں کہ یہ ڈاکٹروں کے نسخوں سے زیادہ کارگر ہوتی ہیں۔

میں نجم الحسن کے معلوم اور نامعلوم قاریوں کو بتاتی رہی کہ آج کل نجم الحسن کے قلم کا دل دھڑکنے لگا ہے۔ وہ کوئی ایسی کہانی لے کر دور دراز برِاعظم سے لوٹے گا کہ پڑھنے والے خوش ہو جائیں گے۔

نجم الحسن نے ''آکسیجن'' کی تقریبِ رونمائی میں تقریر کی تھی اور کہا تھا، ''جیسے مسلمان کا مرنا جینا اللہ کے لیے ہے ویسے ہی لکھنے والے کا جینا مرنا قلم سے وابستہ ہے، یعنی اگر جینا ہے تو لکھتے رہو اور میں ابھی جینا چاہتا ہوں۔''

نجم الحسن ہم سب تمھاری تحریر کردہ کہانیاں دیر تک پڑھنا چاہتے ہیں۔ آکسیجن سے

بھرپور تمھاری زندگی چاہتے ہیں۔ اس کے لیے تمھیں خوب جینا ہے اور خوب لکھنا ہے۔

امریکا سے لوٹو تو ہم سب کے لیے اپنی ''زندگی'' کا تحفہ لانا ہرگز نہ بھولنا۔ نجم نے کہا بھی تھا، تمھاری ساری ہدایتیں میں نے گرہ میں باندھ لی ہیں بھولوں گا نہیں۔ نجم الحسن نے امریکا جا کر لکھنے کی بہت کوشش کی، مگر قلم نے چلنے سے انکار کرنا شروع کر دیا تھا۔ نجم کو ہماری ہدایات زبانی یاد تھیں اور وہ ان ہدایات پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کرتا۔ اس کی انگلیاں جلد تھک جاتیں، آنکھیں بند ہونے لگتیں، سانس پھول جاتی۔ وہ منت کرتا تھوڑی دیر تو میرا ساتھ دو، لیکن انگلیاں آنکھیں اور سانس اس سے بے وفائی پر اتر آئی تھیں۔ اس نے اس بے وفائی کا شکوہ مجھ سے واٹس ایپ پر بھی کیا تھا۔

کوئی بات نہیں نجم یہ سب کچھ وقتی ہے۔ دعائیں تو تمھیں یاد ہوں گی جو میں نے روانگی کے وقت تمھیں یاد کرائی تھیں، انھیں پڑھتے رہنا۔ لکھنے کے قابل ہو جاؤ گے میری ہمت افزائی اسے اچھی لگتی۔ وہ کہتا، ان دنوں تمھارا ساتھ دینا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے ایسا ہی جیسے مجھے اپنے کسی ٹیوٹوریل پر ڈھیر سارے نمبر مل گئے ہوں۔ کسی رپورٹنگ پر زکریا ساجد صاحب نے تعریف کر دی ہو۔ شریف المجاہد سر نے کہا ہو، آپ کا یہ مضمون چھپنے کے قابل ہے۔ پھر وہ کہتا میں جلد واپس پاکستان آؤں گا۔ رشید بٹ سے کہنا میری کتاب تیار رکھے۔ میں اسے تسلی دیتی، میں ہی نہیں ہم سب شہریار سمیت تمھیں لینے ایئر پورٹ آئیں گے۔ اتنے ہار پہنائیں گے کہ تمھارا چہرہ پھولوں میں چُھپ جائے گا۔ تمھاری کتاب کی تعارفی تقریب منعقد کریں گے۔ ہم ایسی ہی بہت سی باتیں لکھ لکھ کر موبائل کی نذر کر دیتے، اس کے جواب آنا بند ہوتے جا رہے تھے اور ہماری گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا کہ ایک دن اس کا داماد فہد کیمرا لے کر میرے گھر پہنچ گیا۔

آپ کا پیغام ریکارڈ کرنا ہے، ابو زیادہ بیمار ہو گئے ہیں، اسپتال میں داخل ہیں۔ میں کل امریکا ان کے پاس جا رہا ہوں۔ ان کے دوستوں کے پیغام ریکارڈ کر کے لے جاؤں گا۔ امید کرتا ہوں کہ وہ سننے اور دیکھنے کے قابل ہوں گے۔ انھیں اچھا لگے گا نا۔

ہاں مجھے بھی یہ سب کچھ بہت اچھا لگا، مگر یہ خبر بالکل اچھی نہیں تھی کہ وہ اسپتال میں

ہے اور اب پہلے سے زیادہ بیمار ہے۔

میری آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل تھیں۔ ذہن پچھلی آدھی صدی کی یادوں سے بھرپور تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ کیمرے کے سامنے کچھ بھی بولنے سے قاصر تھے، مگر مجھے کچھ تو کہنا ہی تھا۔

''نجم تم نے کہا تھا تمھیں ایسے کھانے اچھے لگتے ہیں جو جلد ہضم ہو جائیں، ایسی دوستی جو دیر تک چلے، ایسے کپڑے جس میں آدمی کھو نہ جائے اور ایسے احباب جو سامنے موجود نہ ہوں تو بھی یاد رہیں۔ بس میں تمھیں تمھاری یہی تحریر یاد دلانا چاہتی ہوں۔''

مگر میری آواز اس تک نہیں پہنچی۔ وہ وہاں پہنچ گیا جہاں ہم سب کو بھی باری باری جانا ہے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آنا۔

O

ادھر نگاہ کرو، پھر سے رسم و راہ کرو... طلعت اشارت

دونوں سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک نے رک کر دوسری سے کہا، ''میں طلعت اشارت ہوں اور تم؟'' دوسری میں تھی اور میں بھی رک گئی۔ ہم دونوں نے اشتیاق بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہم ناموں سے واقف تھے، مگر صورت آشنا نہیں تھے۔ ہمارے قد ابھی چار فٹ سے زیادہ نہیں تھے اور ہم اسکول میں پڑھتے تھے۔ یہ سیڑھیاں روز نامہ ''جنگ'' کے دفتر کی تھیں اور ہم نونہال لیگ بچوں کے بھائی جان شفیع عقیل سے ملنے جارہے تھے۔ ہر اتوار میرا مضمون اور طلعت کی نظم بچوں کے صفحے پر چھپا کرتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہیں چھپ جانا بڑے اعزاز کی بات تھی اور ہمیں اپنے اپنے اعزاز کا اچھی طرح علم تھا۔ دوسری بار جب ہم پھر اتفاقاً ان ہی سیڑھیوں پر چڑھتے ملے تب ہم دونوں سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ قد بھی بڑھ چکا تھا۔ طلعت نے کہا، ''میں نے ڈی جے کالج میں داخلہ لے لیا ہے اور میرا یونی فارم سفید ہے، مگر تمھارے کالج میں تو سفید یونی فارم نہیں ہے، پھر یہ سفید لباس کیوں؟''

''ہاں نیشنل کالج میں ایسی کوئی قید نہیں ہے، مگر مجھے سفید کپڑے اچھے لگتے ہیں۔ انھیں پہن کر ایسا لگتا ہے کہ ہم بڑے ہوگئے ہیں۔ بہت قابل بھی ہوگئے ہیں۔'' میں نے واقعی اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ طلعت ہنس پڑی، ''اگر صرف سفید کپڑے پہننے سے ہم بڑے

ہوجائیں اور قابل بھی تب تو یہ بڑا آسان نسخہ ہے، تم کچھ بھی سمجھ لو۔" اب ہم کچھ اسی قسم کی باتیں کرنے لگے تھے۔ اس بار ہم دونوں نے سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے دیر تک باتیں کیں۔ اس نے میرے کئی مضامین پر تبصرے کیے۔ میں نے اس کی کئی نظموں کو بے حد سراہا۔ دونوں نے الوداعی ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، واقعی اب ہم بڑے ہوگئے ہیں۔ "اور قابل—؟" میں نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ "شاید وہ بھی۔" وہ مسکرائی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب گھر سے اسکول کالج کے علاوہ کہیں اور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ میں نے کسی انٹر کالجیئٹ مباحثے میں شرکت کی تب وہ اپنے کالج سے مباحثہ سننے ضرور آئی اور میں نے اسے کئی مشاعروں میں طالب علموں کے ساتھ سنا۔

یوں یہ دوستی دھیرے دھیرے سرکتی رہی۔

ایک دن یونی ورسٹی سے واپسی پر ہم دونوں ایک ہی بس میں سوار تھے۔ وہ پھول دار قمیص اور سفید شلوار دوپٹے میں ملبوس تھی اور میں حسبِ عادت سفید لباس میں۔ ان دنوں شلوار دوپٹا ہمیشہ سفید ہی ہوا کرتا تھا صرف قمیص بدل لینے سے جوڑا بدل جاتا تھا۔ میرا پاؤں بس کے آخری پائیدان پر ٹکا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ بس کے ڈنڈے کو پکڑے تھا اور دوسرا فائل کو سینے سے چپکائے ہوئے تھا۔ وہ بس کے اندر کھڑی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے میرے ہاتھ سے فائل لے لی۔ کہ یہ اس زمانے کے آداب میں داخل تھا۔ لڑکے اور لڑکیوں کی بھی کوئی تمیز نہیں تھی۔ فائل پکڑانے کے بعد میرا دوسرا ہاتھ دوسرے ڈنڈے کو پکڑنے کی کوشش میں تھا۔ بس یونی ورسٹی کے بعد آنے والے "صحرا" سے گزرتی ہوئی گرومندر کی جانب رواں تھی۔ ایسے موقعے پر ہم باتیں نہیں کر سکتے تھے کہ توازن بگڑ جانے کا ڈر ہوتا۔

اسٹاپ آنے کے بعد اس نے مجھے فائل پکڑائی اور ہم دونوں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے گلِ رعنا کلب کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے۔

"تم نے کس شعبے میں داخلہ لیا؟" اس بار بھی پہل اُسی نے کی۔

"معاشیات میں اور تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"مائیکرو بیالوجی۔ تم دنیا کو دور بین سے دیکھنا میں خورد بین سے دیکھوں گی۔"

''خوب۔'' ہم دونوں بہت ہنسے۔

''دنیا کو خوردبین سے کیوں دیکھنا چاہتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بہت قریب سے اس کی باریکیاں جاننا چاہتی ہوں۔ دیکھو دنیا میں جاننے کے لیے کتنا کچھ ہے نا۔'' اس نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

سفید کپڑے میں نے پہن رکھے ہیں، لیکن دانش وری کی باتیں تم کررہی ہو؟'' مجھے اپنی وہ گفتگو یاد تھی جب کالج کے زمانے کی ایک ملاقات میں، میں نے اس سے کہا تھا کہ سفید کپڑے پہننے والے قابل ہوتے ہیں۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔ ہم دونوں یوں ہی کھڑے ''قابلیت'' کی باتیں کرتے رہے۔جس میں ایک موضوع یہ بھی تھا کہ ہم دونوں نے اردو میں داخلہ کیوں نہیں لیا؟ اس نے کہا، ''مگر یہ ضروری تو نہیں کہ ادب پڑھنے والے ہی لکھنا جانتے ہوں۔ پھر اس نے بہت سے قابل لوگوں کے نام لینے شروع کردیے۔جنھوں نے مختلف مضامین پڑھے، مگر بڑے شاعر اور ادیب بنے۔ میں اس کی باتوں سے رعب میں آرہی تھی۔ وہ بغیر سفید کپڑے پہنے ہوئے بھی قابل اور بڑی بڑی لگی۔

پھر ہماری ملاقاتیں یونی ورسٹی میں ہونا شروع ہوئیں۔ ہم تو پوسٹ آفس اور جمنازیم کے اسٹاپ پر اتر کر آرٹس فیکلٹی میں داخل ہوجاتے تھے اور وہ بس میں بیٹھی دور ویران جزیرے یعنی سائنس کی طرف بڑھ جاتی۔

ہم دونوں کے بلاک کے درمیان لائبریری اور ایڈمنسٹریشن کی عمارت حائل تھی، لیکن ٹیلی فون کی سہولت یہاں پر ہی تھی۔ایک دن وہ اپنی اکنی کے ضائع ہوجانے پر افسردہ تھی۔

''یہ ڈبا اکثر اکنی کھا جاتا ہے۔'' اس نے کہا۔

یہ دردِ مشترک تھا۔ میں بھی اپنے کنگورے دار اکنی سے کئی بار ہاتھ دھو چکی تھی۔ ویسے بھی ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں ہوتے تھے کہ نقصان اٹھاتے پھریں اور دکھ بھی محسوس نہ کریں۔ میں نے کہا، ''یہ ڈبا مہینے میں چار دن ٹھیک رہتا ہے۔ بقیہ دنوں ہمارے پیسے بھی ہضم کرجاتا ہے اور ہماری آواز بھی مطلوبہ جگہ پر نہیں پہنچاتا۔ ہم اس پر مضمون لکھیں گے۔''

اب ہم بڑے بھی ہو گئے تھے اور بچوں کا صفحہ چھوڑ کر طالب علموں کے صفحے پر لکھ رہے تھے۔

طلعت کہنے لگی، اور اسے دیکھو یہ جو موچی بیٹھا ہے، پورا ایک آنہ لیتا ہے اور ہماری دو پٹی کی چپل میں صرف دو کیل ٹھونک دیتا ہے۔''

اسے موچی سے بھی شکایت تھی، حالاں کہ میں ان دنوں موچی کو بالکل دوسرے نظریے سے دیکھتی۔ دو پٹی کی چپل جانے فیشن میں تھی یا سستی ملتی تھی، ہم سب وہی پہنتے، لیکن ٹوٹنے کے لیے اسے صرف یونی ورسٹی ملتی۔ ہم ایک پاؤں سے ننگے ہو جاتے اور چپل ہاتھ میں اٹھا کر موچی تک پہنچ جاتے۔ ہمیں چپل پہننے کے قابل بنا دیں۔ میں نے طلعت سے کہا، ''دیکھو اگر یہ موچی جامعہ میں نہ ہوتا تب بتاؤ کیا ہوتا؟''

''تم دنیا کو دور بین سے دیکھو، خورد بین سے دیکھنا میرا کام ہے۔''

طلعت میری توجہ اُدھر سے ہٹا دیتی۔ مجھے وہ موچی جتنا اچھا لگتا طلعت کو اتنا ہی برا۔

پھر ہم دونوں اکثر جامعہ کی وہ چاٹ کھانے ٹھیلے پر پہنچ جاتے جہاں چار آنے میں ایک پیالہ مختلف پھلوں کا مل جاتا۔

میری شکل دیکھتے ہی چاٹ والا پپیتے کی پھانک نکال لیتا اور آدھا کیلا کاٹ کر اس کے عوض میرا چاٹ والا پیالہ بھر دیتا۔

''تم پپیتا کیوں نہیں کھاتیں؟'' وہ پوچھتی۔

''مجھے کالے کالے اتنے ڈھیر سارے گتھم گتھا بیج دیکھ کر جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوتی ہے۔'' میں بولتی۔

''بیج تو نکال ہی دیے جاتے ہیں اور تمھارا کیا بگاڑتے ہیں۔'' وہ کہتی۔

''مجھے وہ دور بین سے کچرے کے ڈبے میں جا کر بھی ہلتے جلتے نظر آتے ہیں۔'' میں کانپ کانپ کر کہتی۔

''چاٹ کھاتے کے دوران دور بین کہیں رکھ دیا کرو۔'' وہ اطمینان سے بولتی اور پپیتے سمیت چاٹ کا پیالہ خالی کر دیتی۔

ایک پیالے سے ہم دونوں کا پیٹ بھر جاتا۔

پھر میں نے ایک مضمون لکھا، ''جامعہ کی چاٹ، موچی اور ٹیلی فون'' جسے بس میں بیٹھ کر ہم دونوں نے ساتھ ساتھ ایک بار پھر پڑھا۔

میں اس مضمون کے ذریعے یونی ورسٹی میں معتبر ہوگئی تھی کہ فون کا ڈبا اب مہینے میں صرف چار دن خراب رہتا۔ بقیہ دنوں میں اکنی ہضم نہیں کرتا تھا۔ موچی کا ریٹ ایک آنے سے کم ہو کر دو پیسے ہوگیا تھا اور چاٹ والے نے بقیہ آدھا کیلا بھی میرے پیالے میں ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ بقول اس کے کہ میرے مضمون سے اس کی چاٹ دور دراز کے شعبوں تک مشہور ہو چکی تھی اور طالب علم جوق در جوق کھانے آتے۔ طلعت نے اس مضمون کی افادیت پر دیر تک گفتگو کی کہ یہ بہ یک وقت تین مسائل پر مبنی ایک مضمون تھا اور ''قابلیت'' سے بھرپور تھا۔

ہم دونوں نے اپنے اپنے مضمون کو دور بین اور خورد بین کے ذریعے مکمل کرلیا تھا، لیکن اس مضمون کو آزمانے نہ طلعت نکلی نہ میں۔

وہ روزنامہ ''جنگ'' کی نئی بلڈنگ کی چمک دار اور صاف ستھری سیڑھیاں ایک دم چڑھ گئی اور اب خواتین کے مسائل پر لکھے گئے مضامین ٹھیک کر کے چھاپنے لگی۔ میں نے ''اخبارِ جہاں'' سنبھال لیا۔ ہم دونوں ایک ہی بلڈنگ کے دو اخباروں میں ملازمت کر رہے تھے۔

ایک دن پھر ہم سیڑھی کی ریلنگ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''یہ ہم کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' جواب تو مجھے بھی نہیں آتا تھا۔

پھر اس کے بعد وہ یہ ملازمت چھوڑ کر ''اخبارِ خواتین'' چلی گئی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں؟

صحافت اور لکھنا میرا شوق سہی، لیکن مجھے اپنی دوربین کو ہاتھ سے نہیں رکھنا ہے۔ مجھے اب معاشیات ہی پڑھانی ہے۔ میں کالج میں جا کر پروفیسر کہلانے لگی۔ وہ پکی صحافی بن چکی تھی۔

ہم بہت دن ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ ہمارے دفتر دور تھے ہمارے راستے مختلف تھے۔ پھر طلعت کی شادی ہوگئی۔

ایک دن جب میں سوسائٹی کے پہاڑی والے ماڈل اسکول سے ہوتی ہوئی لمبا چوڑا

میدان پار کر کے پوسٹ آفس والی گلی سے اس اسٹاپ پر آئی جو میٹروپول کا اسٹاپ کہلاتا تھا، تب وہاں مجھے طلعت کھڑی مل گئی۔ ٹوٹا پھوٹا سا گھاس پھونس والا یہ ہوٹل جس کی دیوار پر کوئلے سے کسی منچلے نے ہوٹل میٹروپول لکھ دیا تھا۔ واضح رہے کہ ان دنوں کراچی میں ایک ہی ہوٹل بہت مشہور تھا جس کا نام میٹروپول تھا اور وہ صدر کے علاقے میں واقع تھا۔ بلڈنگ آج بھی موجود ہے۔ صدر زینب مارکیٹ سے آئیں یا آرٹس کونسل جانے کو مڑیں، یا گورنر ہاؤس کی طرف جائیں، یا کلفٹن کے برج کی طرف بڑھیں درمیان میں آپ کو میٹروپول کی بلڈنگ ضرور روکے گی۔ سنا ہے وہ اندر سے کھوکھلی ہوچکی ہے اور اب وہاں کچھ اور بننے جارہا ہے، لیکن ہماری یادوں میں تو سوسائٹی کا وہی ہوٹل موجود ہے جس کے بائیں جانب ایک گھنا سایہ دار درخت تھا اور جس کے تنے سے لگے دو پتھر آمنے سامنے یوں رکھے تھے کہ جیسے وہ ہم دونوں کی ملاقات کے لیے ہی تھے۔ ہم دونوں اب اکثر اسی پر بیٹھ جاتے۔ دوربین اور خوردبین کی باتیں کرتے۔ ان دنوں ہمیں اچھے اچھے شعر اکٹھے کرنے کا شوق تھا۔ میں نے پوچھا، ''ان دنوں جو تم نے سب سے اچھا شعر پڑھا یا سنا ہو، بتاؤ۔''

ہم دونوں نے الگ الگ ایک پرچے پر لکھا اور جب پرچے کا تبادلہ ہوا تب پتا چلا کہ دونوں نے ایک ہی شعر لکھا ہے:

گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

فرید جاوید کا یہ شعر ہم دونوں کو ایک ساتھ پسند آیا تھا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا۔ میں نے ریڈیو پر ان ہی کی آواز میں سنا تھا۔ ان پتھروں پر بیٹھ کر ہم نے مصطفیٰ زیدی کے بہت سارے اشعار کا بھی تبادلہ کیا تھا۔ وہ زندگی کی باریکیوں کو دیکھنے کی عادی ہوچکی تھی۔ میں اب بھی سفید کپڑے پہنتی تھی اور بڑا بننے کی کوشش میں تھی۔

ایک دن اس نے کئی ایک صفحے مجھے پکڑا دیے اور کہا، دیکھو میری شاعری تمھیں پسند آتی ہے یا نہیں؟

کیوں نہیں؟ میں نے شوق سے وہ کاغذ اس کے ہاتھوں سے لے لیے۔ اس کا ایک

مجموعہ ''اشارت'' چھپ گیا۔ تعارفی تقریب بھی ہوئی۔ مجھے اس پر بہت رشک آیا۔

''لوتم بھی صاحبِ کتاب ہوگئیں۔'' میں نے پریس کلب کی اس چھوٹی سی راہداری سے جو جھاڑیوں سے خود بہ خود خوب صورت بن گئی تھی، گزرتے ہوئے کہا، ''مبارک ہو۔''

''مجھے تمھاری مبارک باد بہت قیمتی لگی۔ میرے لیے سرمایہ ہوگی۔ ہم بچپن سے ساتھ ساتھ چلتے چلے آرہے ہیں۔'' بعد میں اس نے اپنے دوسرے مجموعے کا نام ''سرمایہ'' ہی رکھا۔ جانے کب ہمارے راستے الگ ہوجائیں، میں نے دل ہی دل میں ایک دکھ بھرا جملہ ادا کیا۔ ان دنوں میں یوں ہی سوچنے لگی تھی۔

پھر واقعی طلعت امریکا چلی گئی۔ مجھے جب یہ خبر ملی تب ساتویں، آٹھویں کلاس کی جغرافیہ کی کتاب کا ایک جملہ یاد آگیا۔ جہاں لکھا ہوتا اس ملک میں چنا، جو، باجرا، روئی، پٹ سن پیدا ہوتے ہیں اور دساور بھیج دیے جاتے ہیں۔

دساور کے معنی نہ کبھی ٹیچر نے سمجھائے نہ ہم نے کبھی لغوی معنی سمجھنے کی کوشش کی۔ بس اس کے معنی یہی سمجھ لیے کہ دساور کوئی ایسی جگہ ہے جہاں چیزیں پیدا ہونے کے بعد چلی جاتی ہیں۔

امریکا بھی پاکستان کے لیے دساور ہی ہے۔ کتنے ہی پیارے دساور چلے گئے۔ وہاں سے واپس آنے کا حال ہم نے کسی جغرافیے کی کتاب میں نہیں پڑھا تھا سو، یقین کرلیا۔ طلعت اب دساور سے کبھی واپس نہیں آئے گی۔

اب فون کے ڈبے اکثر ہضم نہیں کرتے۔ ہماری اکثر فون پر اپنی مختلف دوستوں سے باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ طاہرہ حسین بتاتی کہ طلعت اچھی ہے۔ طلعت بیمار ہے۔ اسپتال میں ہے۔ اسپتال سے آگئی ہے اور پھر اسپتال میں داخل ہوگئی ہے۔ طلعت دنیا سے چلی گئی۔

آخری فون کی اس اطلاع نے ماضی کے سارے لمحوں کو پل بھر میں یک جا کیا اور پھر وہ تمام لمحے پل بھر میں ''منجمد'' بھی ہوگئے۔

طلعت نے دنیا سے جاتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے چند دنوں کی مہلت مانگی تھی۔ اپنی بیٹی کو سرخ جوڑا پہنانے کی اور اپنے معصوم بیٹے کو محفوظ ہاتھوں میں سونپ دینے کی۔ اللہ نے اس کی یہ دونوں خواہشیں جلد پوری کردیں۔ اس نے اپنی کتابِ زیست کو بند کیا، چند اوراقِ پریشاں

جو ابھی چھپنے سے رہ گئے تھے، ان پر "اشارت" اور "سرمایہ" کی دو کاپیاں رکھ کر دبا دیا کہ وہ اڑ نہ جائیں۔

ادھورا کام کسی کے ہاتھوں بھی پورا ہونے کے لیے چھوڑ گئی۔

مجھے لگتا ہے میٹروپول ہوٹل کے ان دو پتھروں پر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔

وہ اپنے پرس سے ڈھیر سارے صفحے نکال کر میرے ہاتھوں میں تھما رہی ہے۔

دیکھو یہ ان سارے لمحوں کی داستان ہیں جن میں آخر آخر میں جیتی رہی۔ اب یہ منجمد ہو رہے ہیں۔

میرے جانے کے بعد تو ہو ہی جائیں گے۔ لو میں یہ تمھیں سونپ رہی ہوں۔ جو چاہو ان کے ساتھ سلوک کرو۔ اس کے پیارے طارق بھائی نے بھی شاید اس گھنے سایہ دار درخت کے پیچھے کھڑے ہو کر اس کی یہ گفتگو سن لی۔

دساور سے پاکستان آئے۔ مجھے ڈھونڈا، ان منجمد لمحوں کو میرے حوالے کیا۔

"اسے چھاپنا ہے۔"

"میرے لیے یہ اعزاز ہوگا۔" طلعت اشارت تم سیڑھیاں چڑھ کر کسی نامعلوم کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے تمھاری تلاش میں کئی سیڑھیاں پھلانگ لی ہیں۔ میرے ہاتھوں میں تمھارے "منجمد لمحے" کی ایک کاپی ہے۔ یہ کتاب مجھے تم تک پہنچانی ہے۔ میں کمرہ کمرہ ڈھونڈتی تم تک ایک دن ضرور پہنچ جاؤں گی:

ادھر نگاہ کرو پھر سے رسم و راہ کرو

تمھارا ہی یہ مصرع دہراؤں گی اور پھر ایک شعر سنا کر تمھیں انتظار کی کیفیت میں ڈال دوں گی:

جائیں گے ہم بھی خواب کے اس شہر کی طرف
کشتی پلٹ تو آئے مسافر اتار کے

○

حسن منزل سے حسن منزل تک... میری امّاں

میں نے پوری زندگی اپنے آپ سے سوال کیا ہے کہ لمحے جو گرد بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو چکے ہیں، انھیں اپنی آئندہ زندگی میں جوڑ دوں یا گھٹا دوں؟

یہ جانتے اور مانتے ہوئے کہ یہ سوال بے معنی ہے۔ بھلا زندگی میں کوئی چیز خود سے جوڑی یا گھٹائی جاسکتی ہے؟ قدرت نے تو ازل سے ہی ہماری تقدیر لکھ دی ہوتی ہے اور پھر سب کچھ ویسا ہی ہوتا چلا جاتا ہے، لیکن ہم لکھی ہوئی ہر بات کو چیلنج کرنے میں اپنی عمر گزار دیتے ہیں۔ میرے بھی نصیب میں یہ ازل سے لکھا تھا کہ میں کہاں پیدا ہوں گی؟ کس کی گود میں آنکھ کھولوں گی؟ کس کی بانہیں مجھے نصیب ہوں گی، اور کن یادوں میں، میں اپنی تمام زندگی گزار دوں گی۔ میں نے بارہا بہت سارے لمحے یہ سوچ سوچ کر بسر کیے ہیں کہ میرے ماضی کا سفر کہاں سے شروع ہوا اور کس کس موڑ سے ہوتا ہوا آج کہاں تک آپہنچا ہے۔ یقین جانیے میں ماضی پرست نہیں، مگر پھر بھی اس سے انکار نہیں کہ میں ماضی پسند ضرور ہوں۔

میں آپ کو سچ بتاؤں میں نے مستقبل کا کوئی بھی منصوبہ کبھی نہیں بنایا اور اگر بنایا ہے تو وہ آپ ہی آپ ٹوٹ بھی گیا ہے۔ میں ہر بات فوراً اور ابھی کرتی رہی۔ یوں میں ہمیشہ لمحوں ہی میں جیتی رہی۔

جب مجھ میں سمجھ آئی تب میں نے اپنے آپ کو ایک ایسی لکیر پر کھڑے پایا کہ اگر

پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو بہت سارے پیارے رشتوں کے نشان بھی مٹ چکے تھے۔ بہت سارا ورثہ مجھ سے چھن چکا تھا، اور زندگی گزارنے والی میری آنکھوں کے سامنے والی لمبی لکیر دھندلی تھی، مگر دور تک جاتی تھی۔ کئی ایک رشتوں کی موجودگی کے باوجود صرف ایک سفید ساڑھی، سونی کلائی اور ہاتھوں میں تسبیح تھامے ایک ایک دانے کا شمار کرتی میری ماں بس میرے پاس تھی۔ جس کے پاس ایک وقت کا کھانا دینے کی سکت نہیں تھی۔ ایک جوڑا کپڑا بنانے سے وہ عاری تھی۔ مجھے کتاب، کاغذ اور قلم تک خرید کر پکڑانے سے مجبور تھی۔ میں نے جب اسے اس کے ماضی کی لکیر پر کھڑے دیکھا تب وہ ڈھیروں وراثتوں کے پلندے اٹھائے ہوئے تھی۔ بڑی بڑی حویلیاں، کھیت، باغ، زمینیں، بینک بیلنس، لاکر میں رکھے سیونگ سرٹیفکیٹس، آن بان شان، عزت، نام، پہچان۔ اچانک اس نے قائد کی ایک تصویر کے قدموں میں یہ سب چیزیں رکھ دیں۔ ہجرت اختیار کی، مہاجر بنی اور "ننگی بھوکی" کہلائی۔ میں نہیں جانتی یہ کون سا جذبہ تھا۔ صحیح تھا یا غلط تھا۔ شاید میری عمر یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کی ابھی آئی ہی نہیں تھی، لیکن میرے حافظے میں یہ بات ضرور موجود تھی کہ میرے لیے میرے ابا روز ایک جوڑی جوتا لاتے۔ مجھے نئے نئے جوتے پہننے کا بہت شوق تھا۔ رات میں جب سونے کے لیے وہ جوتا اتارا جاتا تب میں اس کے تلے میں مٹی دیکھ کر بہت روتی۔ یہ گندہ ہوگیا ہے مجھے دوسرا چاہیے۔ میرے لیے وہ جوتا صاف نہ کیا جاتا، بلکہ دوسرا آجاتا۔ مزاج تو بچپن ہی میں بنتا ہے۔ بچوں کے لاڈ میں انھیں خراب کرنے والے دوسرے نہیں اس کے اپنے ابا اماں ہی ہوتے ہیں۔

نئے ملک میں آکر میں بڑی ہوچکی تھی، مگر میرے اندر کا وہ بچہ ابھی بھی موجود تھا۔ ایک دن مجھے اپنے سفید سوٹ کے لیے سفید جوتا چاہیے تھا۔ اس کی قیمت اٹھائیس روپے تھی جو اس وقت کے لحاظ سے اور اپنی حیثیت کے مطابق بھی بڑی رقم تھی۔ میری ماں کی جمع پونجی صرف تیس روپے تھی۔ جانے اُس نے اس رقم کے ساتھ کتنی ہی ضرورتوں کو جوڑ رکھا تھا۔ میری ماں نے وہ ساری رقم میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ آنے جانے کا کرایہ اور بوہری بازار کی چاٹ پر دو روپے خرچ ہوگئے اور میں اٹھائیس روپے کا وہ جوتا لے کر گھر آگئی۔ بلیز ابوٹ

ہاؤس آج بھی بوہری بازار میں اسی جگہ قائم ہے۔

میں اکثر اس بازار سے اب بھی گزرتی ہوں۔ وہاں ٹھہر جاتی ہوں۔ آنکھیں بھر آتی ہیں۔ میں اپنے آپ کو بہت بری لگتی ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ بلا تکلف میں نے اپنی ماں سے وہ ساری جمع پونجی کیوں کر حاصل کر لی تھی۔ اُن کی بھی تو سو ضرورتیں رہی ہوں گی۔ اُن کے اور بھی تو بچے تھے۔ یہ روپے لیتے وقت میرا احساس کیوں سو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ رات یا بعد کی راتیں میری ماں پر کیسے گزری ہوں گی، مگر اُس تاریخ سے لے کر آج کی تاریخ تک میں اپنے احساسِ جرم سے باہر نہیں آ پائی۔

جرم تو میں نے اور بھی بہت سے کیے ہیں، مگر میری زندگی کا سب سے بڑا جرم وہی ہے جو ابھی ابھی میں نے آپ کو بتایا ہے۔ اُس کے بعد سے میں نے پھر اپنی ماں سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ صرف ماضی کی داستان سنانے کی فرمائش کرتی رہی۔ اب سوچتی ہوں تو یہ بھی میرا جرم تھا۔

میں نے ابھی اپنی زندگی کے چند قدم ہی اٹھائے تھے، مگر وہ تو میرے باپ سے جدا ہونے کے بعد بہت سارے قدم اٹھا چکی تھیں۔ بہت سارے نوکیلے پتھروں نے اُن کے پاؤں لہولہان کیے تھے۔ جانے کتنی ٹھوکریں کھائی ہوں گی۔ اپنے سر پر بارہا آسماں بھی تلاش کیا ہوگا۔ کئی بار آنکھیں بند کر کے گزرے ہوئے بے مثال دنوں کی تصویر بھی دیکھی ہوگی۔ وہ دن جو سایہ بن کر اُن کا پیچھا کرتے رہے ہوں گے۔

اُن کا گھر مہکتا آنگن۔ اُن کے اردگرد کھلتے مسکراتے پھول، ہاتھوں میں چمکتی دمکتی چوڑیاں، منہدی سے رنگے لال لال ہاتھ، اُن کی خوب صورت بارڈر والی ساڑھی اور کبھی کبھی دُھلا دُھلایا غرارہ، کروشیا کی بیل ٹکا چنا ہوا دوپٹا، اُن کے جسم کو گدگداتا تو ہوگا، مگر اُن کی آنکھوں میں چھپے آنسو اور ذہن میں گھر کی یادوں کو محسوس کرنے والا پھر کوئی بھی نہیں تھا۔

اب اُن کے پاس اُن کے اپنے بچے تھے۔ وہ اُن کا باپ اور ماں دونوں تھیں۔ بچوں نے اُن کی عزت کی، محبت بھی کی۔ اُن کی ضرورتوں کو پورا بھی کیا۔ اُنھیں محروم نہیں رہنے دیا، لیکن ہم نے اُن کی آنکھوں کی اس حیرت کا راز کبھی نہیں جانا، مگر آج جب میں اُن کی

آخری عمر کی حدوں تک تقریباً پہنچ گئی ہوں، تب میں نے اُن کی حیرتوں کا کسی قدر سراغ پالیا ہے۔

میں بھی اُن ہی کی طرح پانچ بچوں کی ماں ہوں۔ میرے بھی بچے مجھے چاہتے ہیں، یا کم از کم چاہنے کا دکھاوا ضرور کرتے ہیں۔ میں دکھاوے کی بڑی قائل ہوں۔ جانے آپ مجھ سے اتفاق کریں نہ کریں، مگر زندگی کو کسی قدر سکون بخشنے کے لیے دکھاوا بڑا کام کر جاتا ہے۔ وہ مجھے اپنے گھر بلاتے ہیں۔ میری ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے تفریح بھی فراہم کرتے ہیں، مگر اولاد کی طرف سے عطا کردہ تمام مسرتیں اور ضرورتیں ایک طرف، اپنے شریکِ سفر کا دیا ہوا ایک روپیا، ایک بُندہ، ایک انگوٹھی یا ایک جوڑا اُن سب مال ومتاع پر بھاری ہوتا ہے۔ اب میں نے جانا ہے کہ ماں بچوں کو کچھ بھی دے دے ٹھیک ہے، مگر بچے ماں کو دیں تو کچھ بھی ٹھیک نہیں۔ اس سے زندگی کے دن تو پورے ہو جاتے ہیں، مگر زندگی بسر نہیں ہوتی۔ میں یاد کرتی ہوں اپنے گھر کا وہ دالان جہاں وہ اپنی چارپائی پر لیٹی چھت پر لٹکے پنکھے کو ایک ٹک دیکھا کرتی تھیں۔ میں نے تب کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ اُس چلتے پنکھے کے ساتھ ساتھ اُن کے ذہن کا پنکھا بھی تو چلتا رہا ہوگا۔ ماضی کی تمام راتیں، تمام دن، تمام رشتے، تمام ہنگامے، تمام چیزیں، اپنا گھر، اپنا آنگن، اپنا کمرہ، اپنی الماری، الماری میں لٹکے بے شمار جوڑے، صندوق میں رکھے بہت سارے زیور، موقعے موقعے سے ملتے ہوئے تحفے، تصویریں، تحریریں، کتابیں— بس ایک ہجرت نے سب سے بے دخل کر دیا۔ اُنھیں وہ سب کچھ یاد تو آتا ہی ہوگا نا۔ وہ آنگن جہاں کھیلتے اُن کا بچپن گزرا۔ اُن کے ابا اماں جہاں کی وہ اکلوتی لاڈلی تھیں۔ وہ آنگن جہاں اُن کی ڈولی اُتری تھی۔ سجا سجایا وہ کمرہ جہاں انھوں نے ہمارے ابا کا پہلی بار سامنا کیا تھا۔ کیا کچھ نہ تھا اُن کی یادوں میں! میں مجرم ہوں، میں نے اُن دنوں اُن کی محرومیوں کو محسوس ہی نہیں کیا۔ بس یہ دیکھتی رہی کہ وہ پانچ نہیں دن میں آٹھ نمازیں پڑھتی ہیں۔ رات بھر وقفے وقفے سے جاگتی ہیں۔ بار بار وضو کرتی ہیں۔ طویل سجدوں میں کھو جاتی ہیں۔ آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکاتیں، مگر ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بھی تو نہیں لاتیں۔ میں کیوں محسوس نہیں کر پائی کہ اُن کے دل میں سب کچھ خون کیوں ہو چکا ہے، اور یہ کہ وہ کتنی اکیلی ہیں۔ میں اُن سے اپنے لاڈ کراتی رہی۔ کروشیا کی

بیلیں اپنی چادروں پر لگواتی، سلمیٰ ستارے کے کام قمیص کی آستین اور دامن پر بنواتی رہی۔ گوٹا کرن دوپٹے پر ٹکواتی رہی۔ وہ ریشمی لال نیلے کپڑوں پر مجھ سے ماشاء اللہ، یا محمدؐ اور یا اللہ لکھواتیں۔ اُن پر ستارے ٹانکتیں پھر فریم کرا کے دیوار پر سجاتی رہیں۔ وہ محلے بھر کی لڑکیوں کی شادی پر جہیز میں اپنی طرف سے یہ فریم اور قرآن شریف کے جگمگاتے جزدان کا تحفہ دیتی رہیں۔ ڈوری والے گول بٹوے، رنگین ساٹن کی بنائی ہوئی جائے نماز میں بھی ستارے چن دیتیں۔ تب بے وقت بھی نماز پڑھنے کو جی چاہنے لگتا۔

وہ کتنی ہنرمند تھیں۔ خاندان کی تمام لڑکیوں کے جہیز میں اُن کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزیں شامل ہونا ضروری تھیں۔ ساڑھی پر فال لگانا اور دوپٹوں پر گوٹا ٹانکنا تو گویا اُن کی ذمے داری تھی ہی۔

میرے جہیز میں دسترخوان بنانے بیٹھیں تب میں نے کہا، امّاں اب تو میز پر کھانا کھایا جاتا ہے۔ دسترخوان کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے دسترخوان کا کپڑا پھیلا دیتیں۔ پلیٹ، چھری کانٹے، ریشمی دھاگوں سے کاڑھتیں۔ کھانے سے متعلق فارسی کے اشعار درمیان میں لکھتیں۔ تکیے کے غلاف پر ''اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی'' میری ہی لکھائی میں لکھواتیں۔

''امّاں آپ تو سونے سے پہلے اُٹھانے پر تلی بیٹھی ہیں۔''

''زیادہ سونا اچھا نہیں۔ راتوں کو بھی جاگنا چاہیے۔ اللہ ہمیں رات میں نیند دے کر ہماری بندگی کو آزماتا ہے۔'' امّاں کا جواب ہوتا۔

بستر کی چادریں بھی پھول پتوں سے آراستہ کرتیں۔ ایک ایک بالشت چوڑی کروشیے کی خوب صورت بیل بُن کر خود ٹانکتیں۔

''امّاں اب تو چھپی چھپائی خوب صورت چادریں مل جاتی ہیں۔ آپ اتنی محنت کیوں کرتی ہیں؟''

''مل جاتی ہوں گی۔'' وہ بیزاری سے کہتیں، ''اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔''

جگ گلاس پر موتیوں کا Cover بنایا تب میں پھر بولی، ''امّاں یہ کیوں بنایا ہے؟ بازار میں یہ سب بنے بنائے ملتے ہیں۔''

''ملتے ہوں گے۔ میرے ہاتھ کی چیزیں تمھارے لیے یادگار ہوں گی۔''

چاے دانی پر اُن کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ٹی کوزی جس پر انھوں نے ستارے ٹانک کر Hot Tea لکھ دیا تھا۔

میں ہنس کر بولی، ''امّاں چاے دانی جو ٹی کوزی اوڑھے ہوئے ہے، اس پر ہاٹ ٹی لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ چائے تو گرم ہے ہی۔''

''ہوگی مگر لکھنے میں کیا نقصان ہے۔'' وہ آپ ہی آپ جواب دیتیں۔

میں ان کے جواب کی گہرائی میں کیوں نہیں جاتی تھی؟

ڈوری والے بٹوے میں میوہ اور سونف سپاری بھر کر جب وہ مجھے اور دوسروں کو دیتیں تب میں پھر بولتی، ''امّاں بٹوے میں میوے اور سونف تھوڑے ہی دنوں میں نرم پڑ جائیں گی۔ اسے شیشی میں نہ رکھ لیں۔''

''میں نے تو بٹوہ اسی کے لیے بنایا ہے۔'' وہ کہتیں۔

میں غور سے بٹوہ دیکھتی۔ اس کے گول کناروں پر چپٹی گول گول چمکی لٹکتی بھلی لگتی۔ اُن کی ڈوریوں میں پھندنے لگے ہوتے جنھیں کھولنے بند کرنے میں بڑا مزہ آتا۔ کتنا ہنر چھپا تھا اُن ڈوریوں کے الٹ پھیر میں۔

بہت سارے رنگ برنگے بٹوے بنا کر انھوں نے مجھے دے دیے۔

''امّاں کی یادگار۔'' ایک بٹوے کے اندر سے یہ تحریر نکلی۔

یہ تحریر آج بھی اُن ہی بٹوؤں میں دفن ہے۔ اس پر میری آنکھوں سے ٹپکا ہوا آنسو بھی جذب ہے۔ شیشی میں رکھی سونف سپاری پر بھلا کبھی کسی نے اپنے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی گرایا ہے؟

مزے دار کھانے جو صرف وہی پکا سکتی تھیں۔ کڑھی کی طرح کی بیسن کی ٹکیاں جسے وہ بھاپ پر پکاتیں پھر مزے دار شوربہ بنا کر ناؤ کی طرح تیرا دیتیں۔ ویسا سالن پھر کبھی کھانے

کو نہیں ملا۔

اروی کے پتوں میں ماش کی پسی دال چھپا کر اسے وہ مچھلی کے قتلوں کی طرح بناتیں تب سچ مچ اُس میں مچھلی کا ذائقہ بھی آموجود ہوتا۔

خشخاش کا سالن اور چٹ پٹی چٹنی جسے خالی خالی بھی کھایا جائے تو پیٹ بھر جائے۔ جانے وہ اتنی مشکل مشکل چیزیں کیوں پکاتی تھیں۔ وہ پکاتی جاتیں ہم کھاتے جاتے۔ کبھی سیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بھلا یہ ذہن میں کب آیا تھا کہ ایک دن وہ چپکے سے کہیں گم ہو جائیں گی اور ہم آنسو بہاتے رہ جائیں گے۔

گرمی کی اُن چلچلاتی دوپہروں کو ہم کیسے بھول جائیں۔ ہم تو اپنے کمرے میں بستر میں دھنسے ہوتے۔ امّاں دھوپ میں چارپائی پر چادر بچھا کر آم کی پھانکوں کو ہلدی لگا کر سکھا رہی ہوتیں۔ جب وہ کام سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں جاتیں، ہم کتاب سے فارغ ہو کر اپنے کمرے سے نکل پڑتے۔ صحن میں جا کر چوری چوری ڈھیروں پھانکیں چٹ کر جاتے۔ اس پر چپکی ہلدی بھی بری نہیں لگتی تھی۔ جانے اُن دنوں ہر کچی چیز اچھی کیوں لگتی تھی اور چوری میں بھی کتنا مزہ تھا۔

وہ دھیرے سے کہتیں، ''ہمیں معلوم تھا اتنی پھانکیں تو کم ہو ہی جائیں گی۔ مسالہ ہم نے اسی حساب سے بنایا ہے۔''

مرتبان میں تیل ڈالتیں اور سوکھا آم اُس میں ڈال کر ململ کا شفاف کپڑا اُس پر باندھ کر دالان کے کونے میں رکھ دیتیں۔

''گندے انسان کی پرچھائیں بھی اچار پر پڑتی ہے تو اچار خراب ہو جاتے ہیں۔'' وہ ہمیں سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

ہم گندے تھوڑی ہیں۔ تیار ہونے سے قبل اچار آدھا رہ جاتا۔ ہم اکیلے تھوڑی کھا جاتے۔ اُن دنوں ہماری درجنوں سہیلیاں بو سونگھتی بلا وجہ ہمارے گھر کے چکر لگاتی رہتیں۔ امّاں بے خبر تھوڑی ہوتیں۔ یوں ہر روز غائب ہوتا اچار انھیں ذرا تکلیف نہیں دیتا تھا۔

ہمارا چپکے چپکے کھانا انھیں اچھا لگتا تھا۔ یہ بات ہم اُن دنوں بھی جانتے تھے، اور ہماری سہیلیاں اس سالانہ فیسٹیول کے لیے ہر دم اپنے کو تیار رکھتی تھیں۔

جب وہ لمبے بینگن کو اچار کے انداز میں پکاتیں تب ہم سوچتے حیدرآبادی گول بینگن لاکھ مشہور سہی، مگر امّاں کے لمبے بینگن کا سالن اس سے کہیں اچھا ہے۔ امّاں ہمیشہ خود ٹھنڈا کھانا کھاتیں، مگر کوشش کرتیں کہ ہم کو گرما گرم کھانا ملے۔ یہ راز ہم اُن دنوں تک نہیں جان پائے جب تک ہم خود امّاں نہیں بن گئے۔

امّاں کو کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ مولانا مودودی، مولانا روم کی اور دیگر مذہبی کتابیں ان کے سرھانے ہوتیں۔ اخبار، ریڈیو اور ٹی وی کے الگ الگ اوقات تھے اور اُن کے پروگرام خانوں میں بٹے تھے۔ ریڈیو پر خبریں سنا کرتیں۔ کہتیں، خبر سننے کی چیز ہے دیکھنے کی نہیں۔ ٹی وی پہ نعتیہ مشاعروں میں اُن کی جان اٹکی ہوتی۔ ہر نعت پر واہ واہ اور آنسوؤں کی برسات جاری رہتی۔ اخبار کی ساری سیاست وہ صبح ہی ختم کرلیتیں۔ دنیا بھر کے ملکوں کے بارے میں انھیں بہت کچھ معلوم تھا۔

وہ عجیب تھیں۔ ہندوستان چھوڑ آئی تھیں۔ اب انھیں وہ اچھا نہیں لگتا تھا بالخصوص اس وقت جب کرکٹ میچ ہورہا ہوتا۔ پاکستان جیت جاتا تب دو رکعت شکرانہ اُن پر واجب ہوجاتا۔ انھیں ہاکی کا میچ بھی اُسی وقت اچھا لگتا جب پاکستان جیت رہا ہوتا۔ وہ میچ دیکھتی نہیں تھیں۔ صرف یہ پوچھ لیتیں پاکستان جیت رہا ہے نا؟

ہم اُس وقت بھی سوچتے، اُنھیں ہندوستان کیوں اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہاں اُن کے ابّا اور امّاں دفن ہیں۔ ہمارے ابّا بھی وہیں رہ گئے۔ وہاں اُن کے نام کی متعدد حویلیاں، باغ، کھیت کھلیان موجود تھے۔ وہ خالی ہاتھ بھرے ذہن کے ساتھ چلی آئی تھیں۔ اُن کی ساری اچھی یادیں ایک پاکستان پر قربان ہوگئیں، مگر جب انھیں کوئی سرپھرا مہاجر کہتا، ''ننگا بھوکا'' کہتا، اُن کی آنکھوں میں ستارے اُتر آتے۔ وہ کروٹ بدل کر منہ اُدھر کرلیتیں جدھر دیوار ہوتی۔ بس وہی چند لمحے ہوتے جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہوتی تھیں۔

ہم اُن کے دکھ کو کیوں محسوس نہیں کرتے تھے۔ اُن کا منہ دیوار سے موڑ کر دوسری طرف کیوں نہیں کر دیتے تھے جدھر ہم بیٹھے ہوتے۔ ہم باتیں کرتے، جی بہلاتے اُن کی آنکھوں کے ستاروں کو رومال میں جذب کر لیتے۔ اپنے وجود کا احساس دلاتے ہوئے کہتے، ''امّاں آپ تو بہت بہادر ہیں۔ آپ نے تو اپنا شجرۂ نسب تک لٹا کر ہمیں اپنا ایک آزاد ملک دے دیا ہے۔ آپ تو انمول ہیں۔ آپ تو بے غرض ہیں۔ آپ کی نسل پر ہمارا سلام واجب ہے۔''

مگر ہم نے تو اُن سے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ وہ اکیلی تھیں اس کا احساس ہمیں آج اتنے برسوں بعد ہو رہا ہے جب ہماری ساری اولادیں آزاد پاکستان کو چھوڑ کر، اپنی شہریت کو مٹا کر دوسرے ملکوں میں آباد ہو گئی ہیں۔ ہمارا بھی منہ اب اُسی دیوار کی طرف ہے جدھر امّاں کروٹ لے لیا کرتی تھیں۔ وہ جو کچھ سوچا کرتی تھیں آج ہم وہی کچھ سوچ رہے ہیں۔ آج ہم بھی تو اکیلے ہیں۔

وہ صبح سویرے سورۂ بقرہ کا ورد کرتیں۔ ڈھائی سپاروں پر پھیلی ہوئی یہ سورہ وہ روز صبح پڑھ لیتیں۔ ہماری آنکھ اُن کی تلاوت سے کھلتی۔ پھر وہ دیر تک ہاتھ اٹھا کر دعا مانگا کرتیں۔ اس کے بعد وہ نعتیں پڑھتیں اشک بار آنکھوں سے۔ پھر دھیرے دھیرے ہم بچوں تک آتیں۔ ہمارے لحاف کے کونے ہٹاتیں۔ ہم جاگ رہے ہوتے، مضبوطی سے کونے پکڑ لیتے۔ امّاں اب اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی پھونکیں ہمارے چہروں پر چھوڑ دیتیں۔ یہ عمل جب انھوں نے ہمارے بچوں پر بھی دہرایا۔ تب بچے کہتے، نانی امّاں ٹھنڈی ٹھنڈی نماز پھونکتی ہیں۔ ہمیں سردی لگتی ہے۔ وہ بچوں کی توتلی زبان سے ادا ہوتا یہ جملہ سن کر بہت محظوظ ہوتیں۔

کہتیں جو کچھ پڑھو اُسی وقت اپنے پیاروں کو بخش دو۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ قرآن ختم کرنے کا انتظار کیا جائے۔ جو دینا ہے فوراً دو۔ کل کی کسے خبر؟ وہ بتاتیں میں جب تک زندہ ہوں اپنے امّاں ابا اور بزرگوں کو روزانہ دعاؤں کا تحفہ بھیجتی ہوں۔ ان کی بخشش کے لیے اللہ سے ضد کرتی رہتی ہوں۔ جب میں مر جاؤں گی بخشش کی رسد رک جائے گی۔ ہم اور وہ کتنے الگ الگ ہیں۔ ہماری بخشش اور دعائیں ایدھی اور سیلانی فنڈ کے ذریعے اُن تک پہنچتی ہیں۔

صبح اٹھنا، تلاوت کرنا اور جو کچھ پڑھا ہے اسے ان پیاروں کے حضور خود ہی پیش کر دینا اب ہمارے لیے کتنا مشکل ہے۔ میری آنکھوں میں ان کی یاد کے ستارے اٹکے رہتے ہیں۔ میں بہانہ بناتی ہوں چشمہ اتارتی ہوں۔ ٹشو سے آنسو خشک کرتی ہوں۔ شاید آنکھیں کم زور ہیں، ڈاکٹر کو دکھاؤں گی۔ میں اپنے آپ سے بھی اور دوسروں سے بھی جھوٹ بولتی ہوں۔ شرمندگی کے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں ڈاکٹر کو نہیں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ تو رسوا ہو جانے والی نشانیاں ہیں۔ اب سوچ سوچ کر اماں کی بے چینی مجھے جینے نہیں دیتی۔ اُن کی اُس تنہائی، اُس اکیلے پن کو میں نے کیوں نہیں بانٹا؟

مگر وہ پھر بھی مجھ سے خفا نہیں تھیں۔ تب ہی تو جب انھوں نے سفرِ آخرت کا ارادہ کیا تو پورے ایک سال میرے ساتھ آ کر رہنے لگیں۔ میری بخشش کے دن رات کی لگام انھوں نے میرے ہاتھوں میں پکڑا دی تھی۔ پھر انھیں چپ لگ گئی۔ وہ اندر سے بے حد اکیلی ہو گئی تھیں۔ اُن کا جسم روز بہ روز سکڑتا جا رہا تھا اور ہلکا ہو رہا تھا۔ انھوں نے چلنا پھرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا بھی نہیں کھا پاتی تھیں۔ وہ سورۂ بقرہ بھی نہیں پڑھ پاتی تھیں۔ میں صبح سویرے کیسٹ لگا دیتی کبھی تلاوت کا کبھی نعتوں کا۔ جانے اُن کے کان سنتے تھے بھی یا نہیں، مگر اُن کی آنکھوں کی حرکت میں بے بسی کے ساتھ ساتھ دعاؤں کا اشارہ موجود ہوتا۔

میں انھیں نہلاتی، بال بناتی، اُن کے خشک کھردرے جسم پر ویسلین کی مالش کرتی۔ ان کے کپڑے بدل کر سامنے بٹن والا کرتا پہنا دیتی۔ اُن کی آنکھوں کی پتلیوں میں تیزی سے حرکت ہونے لگتی جیسے وہ کہہ رہی ہوں یہ کام صرف بیٹیاں ہی کر سکتی ہیں۔ پھر وہ خاموش آواز میں ہمیشہ کی طرح ایک بات اور دہراتیں، میں نے تمھارے لیے ہمیشہ ایک بیٹی کی دعا مانگی تھی، مگر وہ پوری نہیں ہوئی۔ دعائیں رد نہیں ہوتیں۔ کچھ ہوا میں معلق رہتی ہیں اور کچھ آسمان کی حفاظت میں چلی جاتی ہیں، مگر روزِ حشر پوری کر دی جائیں گی۔

جانے بیٹی پانے کی دعا کو اللہ نے روزِ حشر پوری کرنے کے لیے کیوں رکھا ہوا ہے؟ اللہ کی مصلحت اللہ ہی جانے۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں، مگر ہاں میرے دل کی بہت

سی باتیں میرے دل ہی میں دفن ہیں۔ انھیں کسی سے کہنے کے لیے میں نے خوب صورت اور موثر الفاظ کا خزانہ بھی اپنے دل میں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ دیکھیں یہ الفاظ کب ادا ہوتے ہیں اور کسے مخاطب کر کے۔ میں نے جب اپنی امّاں کو زمین پر رکھے ایک تختے پر لٹا کر آخری بار نہلایا تھا تب میری آنکھیں خشک تھیں، میرا دل البتہ جل تھل تھا۔ جہاں میرے احساس کے تمام الفاظ پگھل کر تیر رہے تھے۔ میں امّاں سے مخاطب تھی، امّاں میں اپنے دل کی بہت سی باتیں آپ سے یوں نہیں کہہ پائی کہ میرے پاس وقت کی کمی تھی۔ میں اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرنے میں لگی تھی۔

آج میرے پاس وقت ہے تو آپ جا چکی ہیں۔ ہمیشہ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے؟ میرے بچوں کے پاس بھی وقت کی کمی ہے۔ جب ان کے پاس وقت ہوگا تب میں بھی نہیں ہوں گی، لیکن شاید انھیں اس بات کا افسوس بھی نہیں ہوگا۔ دنیا بدلنے کے ساتھ احساس کی شدت بھی مٹ چکی ہے۔

لتاں آپ نے جہاں زندگی میں بہت سے کمال کیے ہیں، مرنے کے بعد ایک کمال اور کر دیں۔ میرے دل کی یہ بات سن لیں کہ آپ کے لیے سننا اور میرے لیے یہ کہنا بہت ضروری ہے۔

امّاں آپ سے زیادہ میں نے دنیا میں کسی کو بھی نہیں چاہا کہ آپ ہی تو میرے وجود کا باعث ہیں اور آپ نے، ہاں آپ نے اکیلے مجھے مدتوں بیٹی بنائے رکھا۔ ورنہ میں تو کسی کی بیٹی بھی نہ ہوتی کہ ابّا نے دیوار کی طرف منہ موڑ کر اپنے آپ کو ہم سے مدتوں پہلے دور کر دیا تھا۔

امّاں ایک سوال میں آپ سے اور کرنا چاہ رہی ہوں۔

جب میں زمین پر رکھے کسی تختے پر لیٹی ہوں گی۔ میرے اوپر سفید چادر ڈال دی گئی ہوگی اور مجھے آخری بار نہلائے جانے کی حاجت ہوگی۔ تب یہ فریضہ کون انجام دے گا؟ ثواب اور بخشش کے لیے رقم ایدھی اور سیلانی ٹرسٹ کو پہنچا دی جاتی ہے۔ قربانی کا بکرا گھر لانے کے بجائے عالمگیر ٹرسٹ کو دے دیا جاتا ہے۔ قربانی ہو جاتی ہے۔ مجھے نہلانے کے

لیے کون کہاں سے آئے گا؟ کہا جاتا ہے جو بوگے وہی کاٹو گے۔ آپ کی بیٹی نے آپ کو پاک صاف کیا۔ آپ کی بیٹی کو پاک صاف کرنے کے لیے بیٹی کہاں سے آئے گی؟ تو پھر یہ کہاوت غلط نہیں کیا؟

امّاں میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آخری عمر میں آس، احساس اور تنہائی کا شکار آپ یقیناً تھیں، مگر میں جس بے کلی اور نا امیدی کا شکار ہوں اس کا احساس صرف آپ ہی کرسکتی ہیں۔ کیا آپ آج بھی میری باتیں سن رہی ہیں ہمیشہ کی طرح؟ میرے لیے آج بھی دعا گو ہیں؟ میں جانتی ہوں دنیا کی کوئی بھی ماں مر کر بھی اپنے احساس کو نہیں مار سکتی۔ اجل یہاں امّاں سے مات کھاجاتی ہے۔ امّاں آپ میری باتیں سن رہی ہیں نا۔ یا کروٹ بدل کر آپ نے منہ دوسری طرف کرلیا ہے اُدھر جدھر دیوار ہے۔ کیا آپ کے موجودہ گھر میں بھی ایسی کوئی دیوار ہے؟

لمحے جو گرد بن کر فضاؤں میں تحلیل ہوگئے ہیں اور یادیں بن کر دل میں جاں گزیں ہوگئے ہیں، انھیں اپنی زندگی سے کیوں کر گھٹایا جاسکتا ہے؟ اُس دیوار پر یہی تحریر تھا جدھر میری ماں کروٹ بدل کر بظاہر دنیا سے رابطہ منقطع کرلیا کرتی تھی۔ میں اُس دیوار پر لکھی یہ تحریر صاف پڑھنے لگی ہوں۔ اُس دیوار پر صاف صاف لکھا ہے ''میری پہلی محبت 'حسن منزل' تھی جہاں میری ڈولی اتری تھی''۔ ڈولی روانہ کرنے سے پہلے امّاں کی امّاں نے کہا تھا، جہاں جارہی ہو اب وہی تمھارا گھر ہے۔ ہمیں بھول جانا۔ ہم نے تمھیں پیدا ضرور کیا تھا، مگر دوسرے گھر بھیجنے کے لیے۔ درمیان کا یہ عرصہ صرف اسی تربیت کے لیے دیا جاتا ہے کہ بیٹیاں ماں باپ کی تربیت کی آزمائش ہوتی ہیں۔

ہم یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ہماری امّاں اُس تربیت پر پوری اتری تھیں۔ ہاں ڈولی میں بٹھاتے ہوئے انھوں نے جو دوسرا جملہ کہا تھا وہ کچھ یوں تھا، ''بیٹی جہاں ڈولی جاتی ہے وہیں سے جنازہ اٹھنا چاہیے۔''

امّاں ہر روز وقفے وقفے سے کروٹ بدل کر اپنا منہ دیوار کی طرف کرلیا کرتی تھیں۔

اُنھیں دیوار پر ''حسن منزل'' کا عکس نظر آتا۔ وہ کھلی بند آنکھوں سے وہ نقشہ دیکھتی رہتیں۔ جی بھر کر آنسو بہاتیں اور ڈولی والے گھر کو خدا حافظ کہہ کے پھر سیدھی لیٹ جاتیں۔ چھت پر لٹکے گھومتے پنکھے کو زمانے کی گردش سے تشبیہہ دیتیں۔ خاموش آواز میں اپنی امّاں سے مخاطب ہوتیں۔ مجھے آپ کی نصیحت یاد ہے امّاں۔

''کاش میرا جنازہ بھی 'حسن منزل' سے ہی اٹھایا جاتا۔''

عاشقین سے جمال بھائی تک

صبح صبح آنے والے فون کی گھنٹی گئے دنوں کے تار کی آمد کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ تار والے کی آمد ہمیشہ خدشات سے دو چار کر دیا کرتی تھی۔ ضرور کوئی بری خبر ہے۔ فون اسی خدشے کے تحت اٹھایا۔

میڈم ابا کا انتقال ہو گیا۔

میڈم کے تخاطب سے یہ تو اندازہ ہو گیا کہ فون کالج سے متعلق کسی شخص کا ہے، مگر آواز آشنا نہیں تھی۔

میں نے اپنے آپ پر قابو پا کر پوچھا، ''تم کون ہو؟''

''میں عاشقین کا بیٹا ہوں۔''

جواب نے میرا ذہن میرا دل اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ میں دیر تک خاموش رہی تفصیل جان کر کیا کرتی۔ بس یہی کافی تھا کہ عاشقین اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ عاشقین میرا کون تھا۔ وہ طالب علم بھی نہیں تھا۔ ساتھی استاد بھی نہیں۔ غیر تدریس کوئی ملازم بھی نہیں۔ وہ ہمارے کالج کی کینٹین چلاتا تھا۔

کسی پرنسپل یا استاد کا کالج کینٹین والے سے دل کا بھلا کیا رشتہ ہو سکتا تھا، مگر نہیں میرا اور عاشقین کا دل کا رشتہ تھا۔

عاشقین کا بیٹا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر بولا، "میڈم آپ تک میری آواز آرہی ہے؟"
"آرہی ہے۔" میں نے بہت ہمت کے بعد اپنی آواز نکالی، کاش یہ آواز آئی ہی نہیں ہوتی اپنے اس مفہوم کے ساتھ۔
"ابا کا انتقال دو روز قبل ہوا تھا۔ آپ کو خبر نہیں کر سکا۔ ابا کی ڈائری بھی نہیں مل رہی تھی۔ آج ملی ہے تب اطلاع دے رہا ہوں۔"
"تم نے مجھ پر ظلم کیا۔ مجھے اس کا آخری دیدار کرنا تھا۔" میری آواز بہت دھیمی تھی، یقین تھا کہ اس تک نہیں پہنچی ہوگی، مگر نہیں۔ اس نے میری کم زور آواز سن لی تھی۔
"میڈم شاید میں آج بھی نہیں کر پاتا۔ فرصت سے ڈائری ڈھونڈتا تب اطلاع دیتا۔ اطلاع تو دینی ہی تھی۔ بیماری میں بھی ابا آپ کو یاد کیا کرتے تھے۔ حلق سے آواز نہیں نکل پاتی تھی۔ اس لیے فون نہیں کر پاتے تھے۔ آج رات میں نے انھیں خواب میں دیکھا۔ میں نے ان سے شکوہ کیا۔ ابا آپ کہاں چلے گئے ہیں گھر کیوں نہیں آتے؟ انھوں نے میری طرف سے منہ موڑ لیا۔ کہنے لگے، میں تم سے خفا ہوں، تم نے میڈم کو میرے انتقال کی خبر کیوں نہیں دی؟ میڈم یہ رات تین بجے کا خواب ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں اس وقت سے رو رہا ہوں۔ ابا مجھ سے ناراض ہیں۔ میں نے ان کی ڈائری ڈھونڈی جو بیماری کے دوران اِدھر اُدھر ہوگئی تھی۔ شکر ہے مل گئی۔ صبح ہونے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے معاف کر دیجیے گا۔ شاید پھر ابا بھی مجھے معاف کر دیں۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔
"جو ہوا سو ہوا۔ تم بھی صبر کرو۔ میرے لیے بھی صبر کے سوا کیا چارہ ہے۔" میں اسے اور کیا جواب دیتی۔ فون بند کرنے کے بعد آنسو میری آنکھوں سے یوں جاری ہوئے کہ جیسے نل کھل گیا ہو۔ ذہن اور دل کی ہلچل ذرا کم ہوئی تب میرے سامنے پچیس یا چھبیس سال کا دبلا پتلا صاف ستھرے کپڑے پہنے، منہ میں پان دبائے، ہونٹوں پر پان کی لالی سجائے وہ نوجوان آ کھڑا ہوا جس کے ہاتھ میں درخواست تھی۔ جسے اس نے پرنسپل کی میز پر رکھ دی۔ پرنسپل صاحب نے نظریں اٹھا کر اسے اوپر سے نیچے تک بغور دیکھا۔
"تم تو خود طالب علموں کے برابر ہو بھلا کینٹین کیسے سنبھال پاؤ گے۔" ان کے اس

جملے میں وہ خدشہ بھی چھپا ہوا تھا جس کا وہ اظہار نہیں کر رہے تھے کہ برابر کی طالبات بھی تو ہوں گی۔ کہیں کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو جائے۔

میں نے نوجوان کو بھرپور انداز سے دوبارہ دیکھا۔ خود میری عمر بھی لگ بھگ اتنی ہی تھی۔ چند ماہ پہلے ہی اس کالج کا قیام عمل میں آیا تھا اور میرا تقرر بطور استاد ہوا تھا۔ پرنسپل صاحب میرے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے خدشے والی طبیعت کا مجھے بھرپور علم تھا۔ جانے کیوں مجھے یہ نوجوان اچھا لگا۔ شاید یہ سوچ بھی میرے اندر جیسے در آئی تھی کہ وہ جانے کتنی امید لے کر یہاں آیا ہوگا۔ غیر ارادی طور پر میں نے ان دونوں کے درمیان مداخلت کی۔

''سر آپ اسے رکھ لیجیے۔'' میرے پاس اپنے حق میں کوئی دلیل نہیں تھی۔

پرنسپل صاحب نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں کیوں اس کی سفارش کر رہی ہوں۔

''تم جانتی ہو اسے۔'' انھوں نے پوچھا۔

''نہیں میں نہیں جانتی، مگر شاید یہ بہتر رہے گا۔'' پچھلی تین چار درخواستیں اور درخواست گزاروں کو میں دیکھ چکی تھی۔ تقابل ہی میری دلیل تھی۔ پرنسپل صاحب نے میری سفارش مان لی۔

اس نوجوان نے مجھے ممنون بھری نظروں سے دیکھا۔

وہ دوسرے دن میرے پاس آیا۔ کل کے مقابلے میں کپڑے زیادہ بہتر تھے اور چہرے پر اطمینان صاف جھلک رہا تھا۔ ''میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔'' اس نے آنے کی وجہ بتائی۔

''یہ میرا پہلا کام ہے اور مجھے کام کی ازحد ضرورت تھی۔ میں نے بہت ساری ناکامیاں دیکھ لی تھیں۔ میری نوعمری اور ناتجربہ کاری شاید مجھے یہاں بھی مایوس کرتی، میں آپ کو کبھی شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

میں نے خاموشی سے اس کی بات سنی۔ چپ رہی۔ اس نے اپنا کام شروع کر دیا اور چالیس برس تک کرتا رہا۔ میں کبھی شرمندہ نہیں ہوئی۔ اس نے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔

چالیس سال کی تدریسی زندگی گزارنے کے بعد جس دن میں ریٹائر ہوئی وہ آنکھوں

میں آنسو بھرے میرے سامنے آفس میں کھڑا تھا۔

''میڈم مجھے اجازت دیجیے کہ آج کے بعد میں بھی اس کالج سے رخصت ہو جاؤں۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''کیوں؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''میں آپ کی سفارش پر آیا تھا۔ میں نے آپ کی سرپرستی میں کام کی ابتدا کی تھی۔ آپ کی حوصلہ افزائی سے میں نے اتنی ترقی کی کہ اب کراچی کے پانچ کالجوں اور یونی ورسٹی میں بھی میری کینٹین چل رہی ہے۔ آپ کے بغیر میں کالج میں قدم ہی نہیں رکھ پاؤں گا۔'' وہ بہت کم گو تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ پان منہ میں دبائے رکھتا، مگر آج اس نے اتنی لمبی گفتگو کی۔ اس نے اتنے لمبے عرصے میں بھی مجموعی طور پر اتنے جملے نہیں ادا کیے تھے۔

''نہیں بھئی ایسا نہیں ہوتا۔ ہماری تو سرکاری ملازمت ہے۔ ایک عمر پر آ کر یہ ختم ہو جاتی ہے۔ تم کون سا سرکاری ملازم ہو۔ ہر سال تمھارا کنٹریکٹ بڑھ جاتا ہے۔ جب تک کام کر سکتے ہو کرتے رہو۔ ادارے میں تو لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ دیکھو کتنے پرنسپل اور کتنے اساتذہ تم نے یہاں بھی آتے جاتے دیکھے ہیں۔'' پہلی بار اس نے میری کسی بات پر ''نہیں'' کہا۔

''نہیں میڈم، آپ کے بعد میرے لیے یہاں آنا بہت مشکل ہوگا۔'' اور پھر وہ چپ چاپ پیچھے پیچھے قدم رکھتا آفس سے باہر چلا گیا۔ وہ کبھی مڑ کر نہیں جاتا تھا۔ یہ ادب آداب میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔

مجھے محسوس ہوا میں پرنسپل آفس میں بیٹھی ہوں اور وہ مجھ سے مل کر آج ہی گیا ہے۔ ہمیشہ ''جی میڈم'' کہنے والا آج ''نہیں میڈم'' کہہ کر چلا گیا۔

آنسو تو رک چکے تھے، مگر ماضی سارے کا سارا میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں کلاس لے کر آ رہی تھی کہ گراؤنڈ میں طالبات کا جمگھٹا دیکھ کر رک گئی۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں۔ دھوپ ہے تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟'' میری آواز سن کر ایک لیڈر نما لڑکی تڑخ کر بولی، ''ہم لوگ عقیقہ کرنے یہاں جمع ہیں۔''

میرے لیے یہ جواب حیران کن تھا، ''عقیقہ کیسا؟''

''ہم عاشقین بھائی کا عقیقہ کررہے ہیں۔'' چند طالبات ایک ساتھ بولیں۔

میری حیرت بڑھتی جارہی تھی کہ ہجوم میں مجھے عاشقین ہاتھ میں چھری لیے زمین پر بیٹھے نظر آئے۔

''کیا بات ہے بھئی۔'' اب کے میں عاشقین سے مخاطب تھی۔

''دیکھ نہیں رہی ہیں مس۔ عاشقین بھائی مرغی ذبح کررہے ہیں۔'' عاشقین کے بجائے ایک طالبہ نے جواب دیا۔ اس وقت تک میں میڈم نہیں مس تھی۔

سامنے مرغی ذبح کی ہوئی پڑی تھی۔ اب جو بات مجھے طالبات سے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ طالبات کو عاشقین کا نام قطعی پسند نہیں تھا۔

بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا۔ لینے سے پہلے اور لینے کے بعد دو بار شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کا نام بدل دیا جائے۔ اور اس کے لیے عقیقہ کرنا ضروری ہے۔ اب بکرا— وہ بھی دو بکرے کہاں سے لاتے۔ سوچا وہ بڑے ہوگئے ہیں انھیں ایک مرغی پر راضی کرلیں گے۔ ہم لڑکیاں چوں کہ خود ذبح نہیں کرسکتے کہ مسئلہ شرع کا ہے، اس لیے عاشقین بھائی ہی کی خدمات حاصل کی ہیں۔ یہ معلومات کئی طالبات نے مختلف جملوں میں ہم تک پہنچائیں۔

''اب کیا نام تجویز ہوا ہے؟'' میرے لیے یہ جاننا ضروری ہوگیا۔

''اب آج سے یہ جمال بھائی ہیں۔ اسی نام سے پکارے جائیں گے۔''

طالبات نے نام صرف جمال نہیں جمال بھائی رکھا تھا لہٰذا اس دن سے وہ ہم سب کے جمال بھائی بن گئے۔

ابھی ابھی میں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تھی اور میری آنکھوں سے آنسو بھی خشک نہیں ہو پایا تھا کہ یہ قصہ ذہن میں آتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔

جمال بھائی نے خوش دلی سے یہ نام قبول کرلیا تھا۔ مرغی کی چھوٹی چھوٹی ڈھیر ساری بوٹیاں خود جمال بھائی نے بنائیں اور پھر وہ ''مستحق'' لوگوں میں تقسیم بھی کردی گئیں۔ اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی دو بوٹیاں ایک آفس کے لیے اور ایک اسٹاف روم کے لیے

میرے ہاتھوں میں تھما دی گئی۔

کالج کے بہت سارے یادگار واقعات میں سے یہ ایک واقعہ سب سے انوکھا اور یاد رہ جانے والا واقعہ تھا، اور مجھے نہیں یاد اس کے بعد کسی نے بھی عاشقین کو ان کے اماں ابا کے رکھے نام سے پکارا ہو، بلکہ بعد کے سالوں میں آنے والی طالبات اور اساتذہ تو ان کا پرانا نام جانتے ہی نہیں تھے۔

یوں عاشقین جمال بھائی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

جمال بھائی نے کینٹین کا انتظام اس خلوص کے ساتھ سنبھالا کہ کیا کسی آتے جاتے پرنسپل نے آفس کا انتظام سنبھالا ہوگا۔

میرے حافظے میں کالج کے پورے چالیس سال تھے اور عاشقین کی موجودگی کے بھی چالیس سال تھے۔

میں انجمن اتحاد طالبات کی نگراں بھی تھی اور اسی لیے طالبات کی تقریبات میرے ہی توسط سے منعقد ہوتیں۔ اور تقاریب کا اختتام چائے اور کھانے پر ہی ہوا کرتا۔ جس کی ذمے داری بلاشرکتِ غیرے جمال بھائی کے سپرد تھی۔

میں نے جو اصول انھیں پہلی بار سمجھائے اسے دوبارہ سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ طالبات کے معاملے میں وہ اس قدر نرم دل واقع ہوئے تھے کہ ان کے پاس ایسی طالبات کی فہرست سال کے سال مرتب ہو جاتی جو غریب تر تھیں اور کینٹین کے قریب پھٹکنے کی بھی سکت ان میں نہیں تھی، مگر جمال بھائی موقع بہ موقع ان طالبات کے ہاتھوں میں چپ چاپ سموسہ پکڑا کر خود غائب ہو جاتے یا کولڈ ڈرنک کی بوتل یوں تھماتے جیسے کہ انھوں نے اس کے پیسے ادا کر دیے ہیں۔ دوسرے تو کیا خود ان طالبات کی سمجھ میں بھی یہ نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہے؟

کینٹین میں اشیا کی قیمت ہمیشہ مناسب رہتی، بلکہ طالبات اگر پچیس پیسے کی چاٹ کی پلیٹ کی قیمت میں بیس پیسے بھی پکڑا دیتیں تو وہ چپ چاپ رکھ لیتے۔ کھانے کے بعد اگر طالبات کہتیں پیسے بعد میں دیں گے تب وہ نہ طالبات سے ان کا نام پوچھتے نہ کلاس۔ بس اعتماد کر لیتے۔ اب یہ بات طالبات کی تھی کہ وہ ایمان داری کے کس درجے پر فائز ہیں۔

اسٹاف روم میں جب اساتذہ کوئی آرڈر دیتے تب ان کی ٹرے تو استعمال کے بعد اٹھ جاتی، مگر پیسوں کی طلب ان کے منہ سے ادا نہیں ہو پاتی۔

طالبات جمال بھائی، جمال بھائی کی رٹ لگاتیں، لیکن جمال بھائی کو جواب دیتے شاید ہی کسی نے سنا ہو۔ اگر وہ سامنے موجود نہ ہوں تو ان کی آواز ہر ایک کو اجنبی محسوس ہوگی کہ کسی نے انھیں بولتے سنا ہی کب تھا؟

کسی بھی تقریب کے اختتام پر میں کلرک سے کہتی، جمال بھائی کا بل اب تک نہیں آیا ہے مجھے پیسے دینے ہیں۔ کئی بار تاکید کرنے پر تکلفاً ان کا جو بل آجاتا جس کی رقم ہمیشہ ناقابلِ یقین ہی ہوتی۔ اتنے کم پیسوں میں وہ ہر تقریب نبٹا دیتے۔ کئی بار میں نے اسے بلایا بھی، تم کولڈ ڈرنک کے بوتل کتنے میں دیتے ہو؟ ان سالوں میں اس کی قیمت جتنی ہوتی وہ اس کا آدھا بتاتے۔

''کیسے؟'' میں تعجب سے پوچھتی۔

اب ان پر وضاحت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔ وہ ایسے وکالت کرتے جیسے وہ مجرم ہوں۔

''میڈم میں نے کمپنی سے کہہ رکھا ہے کہ ہمارے کالج کی طالبات غریب ہیں آپ ان کے لیے خصوصی ڈسکاؤنٹ کیا کریں۔ وہ اس کی قیمت آدھی کر دیتے ہیں۔'' گویا سارا کریڈٹ وہ کمپنی کی گود میں ڈال کر خود کو بری کر لیتے۔

عجب بے لوث جذبے والے تھے جمال بھائی۔

میں لیکچرر سے پرنسپل بن گئی، ان کی عادتیں ویسی کی ویسی ہی رہیں۔ مجھ سے تو خیر اس نے وعدہ کیا تھا کہ کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا، لیکن اس نے تو کالج میں کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔

طالبات تو خیر کبھی پیسے دیتیں کبھی نہیں دیتیں، لیکن لڑکوں نے تو اسے لوٹنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ جب طالب علموں کی یونین کالج سے ختم ہوئی تب لسانی تنظیموں نے درس گاہوں پر راج کرنا شروع کر دیا تھا۔ کینٹین کا دروازہ توڑ کر اس کا سامان آئے دن لوٹ لیتے تھے۔ کولڈ ڈرنک کے کریٹ کے کریٹ غائب کر دیتے۔ حتیٰ کہ اس کا فریزر تک اٹھا کر لے گئے۔

مجھے کلرکوں سے اس کے نقصان کا پتا چلتا، مگر وہ میرے پاس کبھی اپنے نقصان کا رونا رونے نہیں آیا، مگر جانے اس کام میں کیسے اتنی برکت تھی کہ اس نے دوسرے کالجوں میں بھی کینٹین کھول لی۔ یوں اس کے بقول وہ دوسرے کالجوں سے کماتا اور ہمارے کالج میں لٹاتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اس کا کاروبار چمک اٹھا۔ اس کے پاس ڈھیروں ملازم تھے، مگر وہ ہمارے کالج میں اپنے ہاتھوں سے کام کرتا۔ میں نے کئی بار اسے ٹوکا بھی، مگر وہ سر کی جنبش سے مجھے سمجھا دیتا کہ اسے ایسا کرنا اچھا لگتا ہے۔

ہر سال اسپورٹس ہمارے کالج کی پہچان تھی جسے دو دن لگاتار ہم نیشنل کوچنگ سینٹر میں منعقد کرتے۔ طالبات کو دورانِ کھیل کھانے پینے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اس کا انتظام جمال بھائی کے ہی سپرد ہوتا۔ وہ اسے اس خوش اسلوبی سے انجام دیتے کہ ہمیں بھی حیرت ہوتی۔

اسپورٹس کے بعد میں بل کی ہمیشہ منتظر ہی رہتی۔ یہ سال کا آخری پروگرام ہوتا اور آڈٹ کی تیاری بھی کرنی ہوتی تھی، مگر سب سے آخر میں بل جمال بھائی کا ہی آتا اور آتا بھی ایسے جیسے بل پیش کرنا کوئی جرم ہے۔ ان سے اصرار کیا جاتا اور وہ شرمندہ شرمندہ سے رہتے۔ میرے سامنے آنے سے گریز کرتے۔ میں کلرک سے پوچھتی بھی کہ کیا جمال بھائی کالج نہیں آتے۔

جواب ملتا آتے ہیں روز۔ پھر میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ بار بار کی تاکید کے بعد جمال بھائی دھیمے قدموں آفس میں یوں داخل ہوتے جیسے میں نے انھیں میمو دے کر بلایا ہو۔ میری میز کے سامنے دونوں بازو آگے کرکے سر جھکائے کھڑے ہوجاتے۔ آفس میں آنے سے پہلے وہ منہ سے پان غائب کردیتے، مگر بولنے سے پھر بھی گریز کرتے۔

''بھئی جمال بھائی تمھارا بل تو بہت زیادہ ہے۔ پچھلے سال سے بھی زیادہ۔'' وہ ہرگز یہ جواب نہیں دیتے کہ چیزوں کی قیمتیں پچھلے سال سے بڑھ بھی تو گئی ہیں سر اور جھکا لیتے جیسے گرانی کے وہی تو ذمے دار ہیں۔

''میں اتنے پیسے نہیں دوں گی۔'' میں فیصلہ سنا دیتی۔ وہ پھر بھی چپ رہتے۔ میں جھنجھلا جاتی، ''کچھ تو بولو جمال بھائی۔''

بہ مشکل ان کی آواز نکلتی، ''جتنا چاہیں دے دیں، آپ کی مرضی۔''

اور پھر جتنا میں چاہتی ان کی رقم کاٹ لیتی۔ نیا بل بنا کر لانے کا کہتی۔

وہ جس طرح آگے چل کر آتے اسی طرح پیچھے ہوتے ہوتے دروازے سے نکل جاتے۔ مجال ہے میں نے جاتے ہوئے ان کی پیٹھ دیکھی ہو۔

یہ ادب آداب پورے چالیس سال یوں ہی برقرار رہا، حیرت کی بات تو یہ تھی۔

کالج کی نئی بلڈنگ بنی ہم سب وہاں شفٹ ہوگئے۔ سب ہی خوش تھے، اتنے ہی وہ بھی خوش تھے۔ ایک دن صاف ستھری ٹرے میں نئی کراکری کے ساتھ دہی بڑے، پکوڑے، سموسے اور ٹھنڈی بوتلوں سے بجی ٹرے میرے کمرے میں آئی۔ کینٹین ملازم سے پوچھا، یہ کیوں ہے، کس نے منگائی ہے۔

''جمال بھائی نے بھیجی ہے۔'' اس دن جمال بھائی خود نہیں آئے تھے۔

''انھیں بھیجو۔'' میں نے قدرے غصے سے کہا۔

دوسرے لمحے جمال بھائی اسی طرح سہمے سہمے کمرے میں تھے۔

''یہ سب کیوں؟''

بڑی ہمت جٹا کر بولے، ''نیا کالج ہے میڈم آج تو آپ اسے میری طرف سے قبول کرلیں۔ آج تک آپ نے کینٹین سے کبھی کچھ بھی نہیں لیا۔''

''میں نے کئی بار منگایا ہے جب جب مہمان آئے۔''

''نہیں میڈم میرا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کالجوں میں تو میڈم کا صبح کا ناشتا بھی کالج کینٹین سے ہی جاتا ہے۔ اگر اس میں کمی ہوجائے تو دھمکی ملتی ہے کینٹین کا ٹھیکا ختم کرادیں گے۔'' اس نے دو تین کالجوں کا نام بھی لے لیا۔ میں ان لوگوں کے بارے میں جانتی تھی۔

''مگر میں دوسرے کالج کی میڈم نہیں ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں کرنا یوں تم میری توہین کے مرتکب ہورہے ہو۔ اور یقین رکھو میں تمھاری کینٹین کا ٹھیکا اس بنیاد پر کبھی نہیں منسوخ کروں گی۔ کوئی دوسری معقول خطا ہوئی تو معاف بھی نہیں کروں گی۔ ہاں بس طالبات کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔''

میں نے اس دن جمال بھائی کو بے اختیار روتے ہوئے دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، ''میں بھلا آپ کی توہین کرسکتا ہوں میڈم۔'' ان کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں سے یہی کچھ تحریر تھا اگر وہ یہ بات جملوں میں نہیں ادا کرتے تب بھی میں لکھی یہ تحریر پڑھ چکی تھی۔

وہ دیر تک اپنے آنسو پونچھتے رہے اور میں دیر تک اپنے جملے کی سختی پر کڑھتی رہی۔

جب اسے اپنے آنسوؤں پر قابو ہوا تو کہنے لگا، ''میڈم مجھے کمپنی سے مہینے میں دو بار کولڈ ڈرنک کے کریٹ مفت ملتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ کے گھر پہنچادوں، مگر آپ مجھے خدمت کا موقع ہی نہیں دیتیں۔'' یہ بات کہتے کہتے وہ کمرے سے نکل گیا۔ انھیں شاید اس کا جواب بھی معلوم تھا۔

یہ سب لکھنے کا میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اپنی نیکی اور اچھائی کو اچھالوں بہ خدا ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ اس لیے لکھا کہ وہ میرے حق میں کتنا مخلص تھا وہ مفت کا کریٹ طالبات کے حصے میں ڈال دیتا تھا۔

اگر میں کراکری کو معیار سے گری قرار دے دوں تو دوسرے ہی دن وہ بدل جاتی تھی۔ اگر کھانے کی اشیا میں کوئی عیب نکالوں تو وہ اس میں بہتری لانے کی کوشش میں لگ جاتا۔

ایک بار کالج گراؤنڈ میں چپس کے ریپر اڑتے دیکھے۔

''آج کے بعد کالج میں چپس لانے پر پابندی لگادوں گی اگر ایک بھی ریپر مجھے گراؤنڈ میں ملا تو۔'' حالاں کہ یہ طالبات کا قصور تھا، مگر دوسرے ہی روز بڑے بڑے کوڑے دان کالج کے مختلف کونوں میں رکھے نظر آئے۔ وہ طالبات کو ہدایت دیتا کہ وہ اسے استعمال کریں۔

سونف چھالیا طالبات کی پسندیدہ چیز تھی، اس پر منافع بھی بہت تھا۔ میں نے اس کی فروخت پر پابندی لگادی۔ سوائے نقصان کے اس میں رکھا بھی کیا ہے۔ بلاوجہ طالبات اس پر اپنا پیسا ضائع کرتی ہیں۔ پھر کینٹین میں چھالیا سونف اس نے کبھی فروخت نہیں کی۔ کاش میں نے کبھی جمال بھائی کو پان کھانے سے بھی منع کیا ہوتا۔ یہ پچھتاوا مجھے ہمیشہ رہے گا۔ جمال بھائی منہ کے کینسر میں مبتلا نہ ہوتے۔ ہاں مجھے یقین ہے کہ وہ میرا یہ کہنا بھی مان جاتے۔

اساتذہ میں سے جو بھی حج و عمرے پر گیا جمال بھائی کا ہار اور گل دستہ ان تک ضرور

پہنچتا۔ میری میز تو پھولوں سے بھر جایا کرتی تھی۔ اسے قبول کرنے میں بھلا کیا عار ہو سکتا تھا۔

کالج میں میری ملازمت کا آخری ہفتہ تھا۔ جمال بھائی کی پریشانی عروج پر تھی، اور آخری دن پہلی بار بغیر بلائے وہ میرے آفس میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک کاغذ تھا۔

''یہ کیا ہے؟''

انھوں نے کاغذ میرے آگے رکھ دیا بولے، ''مجھے کالج سے ہمیشہ کے لیے چھٹی چاہیے۔''

اب ہم دونوں کی آنکھیں ایک ساتھ برس پڑیں۔ میں بھی دیر تک چپ رہی وہ تو ہمیشہ ہی چپ رہتے تھے۔

میں نے ہی ہمت کی، ''نہیں جمال بھائی لوگ آتے رہتے ہیں اور ادارے چلتے رہتے ہیں۔ لوگ جاتے بھی رہتے ہیں اداروں پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کینٹین ہوئی۔ بک شاپ ہوئی یہ تو ہمیشہ کے لیے ہیں۔ یہ کوئی سرکاری ملازمت کے زمرے میں تو نہیں آتی نا۔ تمھاری درخواست پر آج میں دستخط نہیں کروں گی۔ تمھیں یہاں رہنا ہے۔ آتے جاتے تمام لوگوں کے ساتھ کام کرنا ہے۔ ہر سال طالبات بھی تو بدل جاتی ہیں نا۔ ان کے جانے سے ہم تو نہیں چلے جاتے۔ انھیں زندگی میں آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ ہم تو انھیں خوش خوش رخصت کرتے ہیں۔ تم مجھے بھی خوشی خوشی رخصت کرو۔ یہ ماحول، یہ کالج، یہ طالبات سب کچھ ایسا ہی رہے گا۔ بس ہمارے دن پورے ہوئے ہیں۔ اور بھئی ہم کون سا دنیا سے جا رہے ہیں۔ ہم تو اس شہر سے بھی نہیں جا رہے ہیں۔ جب جی چاہے گھر آ جانا۔''

اب وہ باقاعدہ رو رہے تھے۔ انسان کے جذبات بھی کیسے ہوتے ہیں، ہم غم پر بھی روتے ہیں خوشی پا کر بھی آنسو ہی آ جاتے ہیں۔

''آپ کے بغیر میڈم میرے لیے یہاں رہنا ممکن نہیں۔'' یہ کہتے کہتے وہ اسی طرح بغیر پیٹھ کیے کمرے سے نکل گئے۔ باہر جا کر وہ کس کونے میں اپنے آپ کو چھپا کر روئے۔ ہاں میں نے میز پر سر رکھ دیا۔ میں باقاعدہ رو رہی تھی۔ ہمیں زندگی میں کیسے کیسے لوگ مفت مل جاتے ہیں جو ہم سے اس قدر قریب آ جاتے ہیں، ہمارے شجرۂ نسب میں ان کا کہیں نام بھی نہیں ہوتا، لیکن وہ ہمارے وجود سے الگ نہیں ہو پاتے۔ ان کی باتیں، ان کا سلوک، ان

کی موجودگی، ان کی غیر حاضری زندگی میں کتنی اہمیت اختیار کرلیتی ہے۔ یہ زندوں کا معاشرہ ہوتا ہے۔ یہ انسانوں کا معاشرہ ہوتا ہے۔ کیا یہ قانون جنگل میں بھی نافذ ہے۔ جنگل کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے زبان کب دی ہے؟

چار بجے شام میں جب اس کمرے سے رخصت ہورہی تھی تو چالیس سال کی چالیس ہزار یادیں میرا پیچھا کررہی تھیں۔ تمام طالب علم، ساتھی اساتذہ، آتے جاتے پرنسپل صاحبان، غیر تدریسی عملہ، ہزارہا واقعات، درودیوار، پھول پودے، اڑتی مٹی، چلتی ہوائیں اور پان کھاتے ہوئے جمال بھائی۔ جو میرے آنے کے چند ماہ بعد ہی اس کالج میں آئے تھے، اور بقول ان کے کہ میری ہی سفارش سے انھوں نے اپنی زندگی کے معاش کا آغاز کیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی اپنی گاڑی کی طرف جارہی تھی، ایک درخت کی آڑ میں چھپے جمال بھائی مجھے جاتا دیکھ رہے تھے۔ پتوں کی سرسراہٹ نے مجھے بتادیا تھا۔

ہاں جاتے جاتے انھوں نے کہا تھا، مجھے اجازت دیجیے کہ کبھی کبھی فون کرکے میں آپ کی آواز سن لیا کروں۔

میری گاڑی میں سب کی طرف سے دیے گئے گل دستوں کے ساتھ جمال بھائی کا خوب صورت گل دستہ سب سے نمایاں تھا جو انھوں نے چپ چاپ گاڑی میں رکھوادیا تھا۔

کچھ دن تک انھوں نے میری اور میں نے ان کی آواز سنی۔ پھر انھیں حلق کا کینسر ہوگیا۔ ان کی آواز بند ہوگئی۔ ساتھ ہی ساتھ کینٹین بھی بند ہوگئی، حالاں کہ میں نے ان کی چھٹی کی درخواست پر دستخط کرنے کے بجائے ان کی کینٹین کے ٹھیکے کی میعاد از خود بڑھادی تھی اور گورنمنٹ کے خزانے میں قاعدے کے مطابق اپنی طرف سے فیس بھی جمع کرادی تھی۔ مدت دس سال تک آگے کی تھی۔ یہ بات ان کے علم میں نہیں تھی۔ انھوں نے بھی تو گل دستہ بغیر مجھے بتائے گاڑی میں چپ چاپ رکھ دیا تھا۔ یہ ہمارا آخری لین دین تھا۔

پھر کچھ مدت بعد ان کا فون آنا بند ہوگیا۔ میں نے جانا وقت نے ماضی پر گرد جمادی چلو اچھا ہُوا۔

مگر ایک دن میں نے خود انھیں فون کرلیا۔ وہ بول نہیں سکتے تھے انھوں نے میری

آواز سنی، مگر میں ان کی آواز سننے سے محروم رہی۔ پان کی لالی نے انھیں ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا تھا، مگر سسکیاں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔

اور آج ان کا بیٹا فون پر مجھے اطلاع دے رہا تھا۔

لبا اپنے بیٹے سے مر کر بھی ناراض ہے اس لیے کہ اُس نے اُس کی میڈم کو مرنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟ کیا جسم سے جان نکل جانے کے بعد بھی احساس باقی رہتا ہے؟ یہ کون بتائے۔

O

جو معافی کے قابل نہیں... حسین امیر

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم نے ہجرت کی تھی اور مجھے نہ ہجرت کے معنی معلوم تھے نہ میں صحیح تلفظ کے ساتھ اس لفظ کو ادا کر پاتی تھی۔ ہمارا کنبہ بڑے بھائی جن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ نئی نویلی بھابی، امّاں اور ہم چار بہن بھائیوں پر مشتمل تھا۔ ایک بہن مجھ سے بڑی، دو بھائی مجھ سے چھوٹے تھے۔ گھر کا آنگن بڑا، دالان لمبا اور تین چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔

ایک چھوٹا کمرہ بھائی اور بھابی کا تھا۔ درمیان کے قدرے بڑے کمرے میں گھر بھر کے لوگوں کے مختصر سے سامان کے ساتھ کونے میں امّاں کی چارپائی تھی اور تیسرے کمرے میں ہم چار بہن بھائی تین چارپائیوں پر مل کر سوتے تھے۔ صبح ایک چارپائی کھڑی کردی جاتی اور بستر لپیٹ کر کونے میں رکھی کرسی پر رکھ دیا جاتا یوں چلنے پھرنے کی جگہ بن جاتی۔

رات میں لالٹین جلانے کا پورا اہتمام ہوتا جب اس میں تیل ڈالا جاتا اور اس کے گول دونوں طرف سے کھلے شیشے چمکائے جاتے اور یہ کام گھر کے بڑے لوگ کرتے تب میں سوچتی اس مختصر سے گھر، معمولی بستر اور ضروریات کی بیشتر چیزوں سے محروم ہو کر ہم یہاں کیوں رہ رہے ہیں؟ ہم اپنا پرانا گھر یاد کرتے۔ درجنوں کمروں والا گھر، جس کا بڑا سا پھاٹک تھا۔ جہاں کئی ملازمین دن بھر بیٹھے حقہ پیتے، بازار سے سودا لاتے۔ گھر کے اندر کئی

عورتیں اور بچے کام کرتے۔ ہمارے گدے تکیے بڑے آرام دہ ہوتے۔ بہت سارے کپڑے اور جوتے ہماری ملکیت تھی۔ اچانک پانی کے جہاز پر بیٹھ کر آٹھ دنوں کے سفر کے بعد ہم اس گھر میں کیوں آ گئے؟ دو تین بکس اور ایک بستے میں چند کتابیں پنسل اور غلط لکھے گئے حروف مٹانے کے لیے ربڑ ڈال کر۔ لوگ اسے ہجرت کہتے تھے۔ ہم نے بھی اسے ہجرت مان لیا تھا، مگر ہجرت کی ضرورت کیا تھی؟ اور اس میں ہمارا کیا فائدہ تھا؟ یہ سوال میرے ذہن میں ہر وقت گردش کرتا رہتا۔

اُن دنوں میں ایک ہندسے کی جمع تفریق کے سوال حل کرنے میں بھی غلطی کر جاتی۔ ضرب تقسیم کے سوالات ابھی میرا انتظار ہی کر رہے تھے۔ انگریزی کچھ کچھ اور اردو زیادہ اچھی پڑھ لیتی تھی رسالہ کھلونا اور تعلیم و تربیت اٹک اٹک کر پڑھتی اور عزم یہ تھا کہ ایک دن اس میں میری بھی کہانیاں ضرور چھپیں گی۔

میری عمر کے بچے یقیناً نہ یہ رسالہ پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھنے کا ایسا عزم رکھتے تھے۔ سو، مجھ پر خاصی توجہ دی جاتی یہ جان کر کہ میں ایک دن ضرور ''قابل'' لڑکی ثابت ہوں گی۔ مجھے لوگوں کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت کرنے کی نہ جلدی تھی نہ ضرورت کہ ابھی تو میرے ذہن میں بہت سارے سوال تھے جو مجھے ہر وقت الجھائے رکھتے اور میں جلد از جلد اور ہر قیمت پر ان کے جواب جاننا چاہتی تھی۔ بھائی بھابی اس کا جواب کیوں دیتے کہ وہ تو مجھے ہجرت کر کے خود ہی مجرم نظر آتے۔ بڑی بہن کے اپنے کچھ سوالات تھے وہ ان ہی میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ چھوٹے بھائیوں پر مجھے رشک آتا کہ وہ سوچنے سمجھنے اور کسی سوال کو ذہن میں پالنے کے ابھی قابل ہی نہیں ہوئے تھے۔ رہ گئیں لمّاں اُن کی دو جلتی بجھتی آنکھوں میں بھرے آنسو وہ لاکھ چھپائیں، مگر مجھے نظر آ جاتے اور پھر میں اُن سے اتنے کڑے سوال کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اُن ہی دنوں بھری دھوپ میں اچانک حسین (حسین امیر فرہاد) ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور یوں گھل مل گئے جیسے ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں۔ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ وہ کون ہیں، اب تک کہاں تھے اور اب کیوں آ گئے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ گھر کے ٹھہرے ہوئے ماحول میں ہل جل پیدا ہو گئی۔ بڑے بھائی گھر کی بہت ساری

ذمے داریوں سے سبک دوش ہوگئے۔ بھابی ضرورت کی چیزیں بازار سے اُن ہی کے ذریعے منگوانے لگیں۔ باجی اپنے کپڑوں پر استری بھی اُن ہی سے کرالیتیں اور اپنی بکھری ہوئی کتابوں کی ترتیب بھی اُن ہی سے کرانے لگیں۔ دونوں چھوٹے بھائیوں نے اُن کے دونوں کندھوں کو اپنے لیے مخصوص کرلیا، اور اُن کے ساتھ پوری کالونی کا چکر کاٹ کر گھر آجایا کرتے۔ ہاں میں نے جمع تفریق کے بڑے بڑے سوال بھی جلد ہی سیکھ لیے اور اب ضرب تقسیم پر آ گئی تھی، کیوں کہ انھوں نے میرے ہر وقت کے لکھنے پڑھنے کی عادت کے سبب مجھ پر توجہ دینی شروع کردی تھی۔

امّاں جب ظہر کی نماز سے فارغ ہوکر بستر پر آجاتیں تب وہ اُن کے پاس پلنگ پر بیٹھ جاتے۔ امّاں جھوم جھوم کر نعتیں پڑھتیں اور وہ سبحان اللہ کے ورد کے ساتھ اُن کے شریک بن جاتے۔ پھر جب امّاں کروٹ بدل لیتیں تب وہ سمجھ جاتے کہ امّاں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی ہیں اور اب وہ انھیں چھپانا چاہتی ہیں۔ تب وہ پائنتی بیٹھ کر اُن کی ٹانگیں دبانے لگتے۔ امّاں سوجاتیں یا سوتی بن جاتیں تب وہ اُن پُرزوں کو جمع کرتے جن میں نمک، ہلدی، مرچ اور دیگر چیزیں آتی تھیں۔ انھیں شیشی میں ڈال کر وہ ان پُرزوں کو پڑھنے کے لیے جمع کر لیتے تھے کہ اُن دنوں پرانی کتاب یا اخبار پھاڑ کر پُڑیا میں چیزیں آیا کرتیں۔ اُن کی یہ حرکت ظاہر کرتی کہ وہ پڑھنے کے بے حد شوقین تھے وہ دل میں اُنھیں پڑھتے اپنے ذہن کی جلا کے ساتھ ساتھ اپنی فرضی کہانیوں میں ڈھال کر رات میں مجھے سناتے۔ کہانی سننے کا مجھے بہت شوق تھا اور جانے کیسے اُنھوں نے میرا یہ شوق جان بھی لیا تھا۔ غرض حسین ہم سب گھر والوں کی ضرورت بن چکے تھے۔ جلد ہی انھوں نے گھر میں اپنا ایک مقام بنالیا تھا۔

ہم یہ تو جانتے تھے کہ وہ دالان میں بچھی چارپائی پر سوتے ہیں، لیکن کب سوتے اور کب اٹھتے؟ ہمیں اس کا پتا ہی نہیں چلتا۔ ہم کہانی سنتے سنتے اور اکثر پڑھتے پڑھتے سو جاتے شاید تب وہ چپکے سے ہمارے کمرے سے باہر چلے جاتے اور ساتھ ہی لالٹین کی روشنی بھی دھیمی کرجاتے۔ صبح ہمارے اٹھنے سے پہلے لالٹین بجھی ہوتی اور دالان کے کونے میں رکھی

جا چکی ہوتی اور حسین کا بستر تہ ہو کر کھڑی کی گئی چارپائی کے پائے پر لٹکا ہوتا اور حسین نہا دھو کر آنے والے دن کے استقبال کے لیے تیار ملتے۔ بھائیوں کے منہ دھلانے میں مدد کرتے، بڑی بہن کے بستر کو تہ کر دیتے۔ میری چیزیں انھیں چھونے کی اجازت نہیں تھی کہ میرا بستر دن بھر بچھا رہتا اور رسالے، کتابیں ربڑ، پینسل تکیے کے نیچے بہ حفاظت رکھی رہتیں۔

امّاں اور بھابی کے ساتھ ناشتا کھانا بنانے اور سب کو کھلانے میں پیش پیش ہوتے۔ ہمیں یاد نہیں کہ ان سے کبھی کوئی کام کہا گیا ہو۔ انھوں نے از خود اپنے کاموں کا تعین کر لیا تھا۔ چائے بنا کر ہر ایک کو پلانا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہم نے انھیں خود بھی شوق سے چائے پیتے دیکھا تھا، لیکن کھانا وہ کب کھاتے اور کتنا کھاتے ہم جان ہی نہیں پائے اور شاید اُن دنوں ہم یہی سمجھتے تھے کہ انھیں کھانا کھانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ انھیں تو بس لکھے ہوئے اور چھپے ہوئے ہر صفحے سے عشق تھا۔ وہ بڑی توجہ سے پڑھتے۔ امّاں کے دینی رسالے جس کا نام ''آستانہ'' تھا اور دہلی سے آتا تھا اس کا ایک ایک صفحہ پڑھ جاتے۔ امّاں سے مذہبی مسائل پر سیر حاصل گفتگو بھی کرتے۔ امّاں بس اُس دم تازہ ہو جاتیں اور بے تکان بولتیں۔ حسین باقاعدگی سے اُن کا ساتھ دیتے اور پھر اُن کی شرارت کی عادت زور پکڑتی۔ وہ کوئی نہ کوئی اختلافی بات کر جاتے امّاں پہلے تو انھیں گھور کر دیکھتیں۔ وہ آگے بڑھتے جاتے تب گناہ اور بے ادبی کا احساس امّاں کو بدلہ لینے پر اُکساتا۔ وہ ہاتھ سے جھلنے والا پنکھا سنبھال کر اس کی ڈنڈی ان کی طرف کر کے پیچھا کرتیں وہ کمرے سے دالان اور پھر صحن میں پھلانگ جاتے امّاں تھک ہار کر پلنگ پر بیٹھ جاتیں۔ تب وہ اُن کے پائنتی بیٹھ کر پیٹھ حاضر کر دیتے اور پنکھے کی مار کے آرزومند ہو جاتے۔

میں یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوتی۔ مجھے بس اُس ایک لمحے حسین بہت اچھے، بہت قیمتی اور گھر کے لیے بہت ضروری محسوس ہوتے کہ اُن کی بدولت امّاں میں زندگی کی توانائی آجاتی۔ اُن کے مرجھائے چہرے پر زندہ رہنے کی رمق نظر آجاتی۔ حسین کی شرارت کے بدلے امّاں کی آنکھوں کی چمک اور چہرے پر پھیلی سرزنش مجھے ہر چیز سے زیادہ اچھی لگتی اور بس اس ایک لمحے میں اپنی چھوڑی ہوئی گڑیا، ڈھیر سارے کھلونے، وسیع و عریض آنگن، اپنی

پالتو بکری اور مرغی تک کو بھلا دیتی جسے میں دور کسی شہر میں بلاوجہ چھوڑ آئی تھی صرف پانی کے جہاز پر بیٹھ کر سفر کرنے کے مزے کی خاطر جس کی میں نے تمنا بھی نہیں کی تھی۔

حسین مجھے اس لیے بھی اچھے لگتے کہ وہ علی الصبح دودھ والے سے جب پتیلی میں دودھ لیتے تب میری سفید بلی کے لیے اس کے مخصوص برتن میں دودھ لینا نہیں بھولتے۔ بلی کا یہ حصہ اس طرح مفت ملتا جیسے گوشت کے ساتھ چھیچھڑے اور سبزی ترکاری لینے پر دھنیا، پودینہ اور مرچیں مفت تھیلی میں یا ٹوکری میں ڈال دی جاتی تھیں۔ اب تو چھیچھڑے بھی پیسوں سے آتے ہیں۔

حسین جب ہمارے گھر کی ضرورت بن گئے تب ایک رات کے بعد جو صبح طلوع ہوئی وہ ہمیں انتہائی پریشان اور غم زدہ کر گئی۔ حسین کا بستر اُسی طرح تہ تھا اور چارپائی کے پائے پر رکھا ہوا تھا۔ ہم سب اُٹھ چکے تھے، مگر حسین گھر میں موجود نہیں تھے۔ امّاں کو سودا منگوانا تھا۔ باجی کو اپنا بستر خود تہ کرنا پڑا تھا۔ دونوں بھائی حسین کے ساتھ کالونی گھومنے کے منتظر تھے۔ بڑے بھائی پریشان تھے اور دفتر جا چکے تھے اور سب کو ہدایت کر چلے تھے کہ گھر کی تمام چیزوں کو دیکھا جائے کہ کون سی چیز کم ہے۔ انھوں نے یہ جملہ اٹک اٹک کر ادا کیا تھا کہ یہ اُن کا بھروسا ٹوٹنے کا بھی تو سوال تھا۔ بھابی ابھی تک چائے کی منتظر تھیں۔ امّاں اپنا اکلوتا ہتھیار پنکھا ہاتھ میں لیے اُس کی ڈنڈی کو بغور تک رہی تھیں کہ اب وہ کسے دوڑا کر ماریں گی اور کون اپنا نام حضرت حسین بتا کر امّاں کے غضب کے دائرے میں آئے گا۔ حضرت حسین تو اس گھر سے جا چکے تھے۔

دن گزرا اب تو دوسری رات بھی گزر گئی۔ حضرت حسین واپس نہیں آئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سب نے اپنی اپنی چیزیں کھنگالیں۔ سب کچھ موجود تھا، بلکہ میرے سرہانے رکھے ہوئے رسالوں میں ایک رسالے کا اضافہ بھی تھا جس پر لکھا تھا ''مُنی باجی کے لیے حسین کی طرف سے''۔ وہ گھر میں اپنے سے ہر چھوٹے کو بھائی اور باجی کہا کرتے۔ امّاں تو امّاں ہی تھیں۔ بھابی اور بھائی جان اُن کے بھی ویسے ہی تھے جیسے کہ ہمارے۔

معما تھا کہ حل ہو ہی نہیں پا رہا تھا۔ حسین کیوں چلے گئے اور کہاں چلے گئے، میں کچھ

یوں سوچ رہی تھی کہ وہ آئے ہی کیوں تھے؟ شاید اس لیے کہ میرے جمع تفریق کے سوالوں کو مضبوط بنا دیں۔ ساتھ میں ضرب تقسیم بھی سکھا دیں کہ دنیا میں جینے کے لیے یہ چاروں سوال ضروری ہیں۔ یا شاید اس لیے آئے تھے کہ کہانیاں پڑھنے میں اصلاح کر دیں۔ بلی کے دودھ کی ذمے داری نبھالیں یا شاید امّاں کے چہرے پر اپنے اختلافی نوٹ کے ذریعے زندہ رہنے کی رمق دوڑا دیں؟ سوال سوال ہی رہا۔

دن رات تو گزر ہی جاتے ہیں سو، گزرنے لگے۔ ایک صبح ڈاکیا ایک لفافہ لے کر آیا۔ یہ کسی دوسرے ملک کا لفافہ تھا۔ اس میں رکھا خط حسین کا تھا۔ مضمون کچھ یوں تھا:

> میں آپ سب سے معافی کا خواست گار ہوں بغیر بتائے گھر چھوڑ آیا۔ بتانے کی ہمت کی، مگر ہار گیا۔ مجھے یہاں ایک اچھی ملازمت مل گئی ہے شاید زندگی گزارنے کا سامان ہو جائے۔ آپ سب نے مجھے اپنا پن دیا میں آپ لوگوں کو زندگی بھر نہیں بھول پاؤں گا۔ ہر ایک کے لیے ایک ایک جملہ تھا۔ امّاں آپ کا پنکھا یاد آئے گا، میرے دونوں کندھوں پر دونوں منے بھائیوں کا وجود محسوس ہوتا ہے۔ بڑی باجی کی کتابیں درست کرتے ہوئے اور کپڑوں پر استری کرتے وقت بڑی خوشی محسوس ہوتی تھی، بھابی کو ستانے اور چائے پلانے کا لطف ہی کچھ اور تھا، بھائی جان سے پہلے بھی ڈرتا تھا آج بھی ڈرتا ہوں۔ ڈرنے سے زیادہ اُن کی عزت کرتا ہوں اور مشکور بھی ہوں کہ انھوں نے اپنا گھر اور اپنے رشتے مجھ سے بانٹ لیے تھے۔ اور کتابوں کے شیلف تک پہنچنے سے مجھے منع نہیں کیا۔ منی باجی سے بھی ڈر لگتا ہے وہ میرے چلے جانے سے بہت ناراض ہوں گی۔ اب بلی کا دودھ کون لے گا اور انھیں کہانیاں کون سنائے گا؟

آخر میں ایک جملہ چونکا دینے والا تھا:

> میں آپ کے گھر سے آتے ہوئے ایک چیز چُرا کر لے آیا ہوں۔

اس چوری پر آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ منی باجی کے البم سے ایک
گروپ فوٹو نکال لی ہے جس میں گھر کے سب ہی لوگ ہیں کہ مجھے
ان کے چہرے کے نقش و نگار بہت یاد آئیں گے۔

سب لوگ خط پڑھ کر خوب روئے۔ پھر سب نے حسین کو اس کی اس "جذباتی چوری پر معاف بھی کر دیا جو چوری ہم پکڑ بھی نہیں پائے تھے۔

آج اس بات کو آدھی صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ حسین اب حسین امیر فرہاد بن کر اپنے وطن واپس آ گئے ہیں۔ اپنا رسالہ جاری کیے ہوئے ہیں۔ لکھنے لکھانے میں بہت آگے جا چکے ہیں۔ مذہبی بحث چھیڑا کرتے ہیں۔ بات ہمیشہ اختلافی کرتے ہیں۔ اماں کا پنکھا گم ہو چکا ہے اور وہ اپنی چارپائی پر بھی موجود نہیں ہیں۔ حسین کو اب اماں کی مار کا بھی ڈر نہیں ہم سب سے انھوں نے رشتہ بحال کر لیا ہے۔ سب نے انھیں معاف کر دیا ہے، لیکن میں آج تک انھیں معاف نہیں کر پائی۔ اپنے البم سے ایک تصویر کی چوری پر نہیں، بلکہ اس رات ذہن میں شدت سے ابھرتے ہوئے اس سوال کے باعث کہ جب میں آدھی رات کو بے چینی سے بیدار ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی حسین نے مدھم کر دی تھی اور وہ دالان میں اپنے بستر پر اطمینان سے سو بھی رہے تھے۔ میں نے ذہن میں کلبلاتے اس سوال سے وعدہ کیا تھا کہ صبح ہوتے ہی میں اس سوال کا جواب حسین سے حل کرا لوں گی اور ہمیشہ کے لیے اس سوال کے جبر سے آزاد ہو جاؤں گی۔ مگر اس صبح حسین غائب تھے اور وہ سوال جسے میں نے حل کرانے کا وعدہ کیا تھا، آج تک اسی طرح موجود ہے۔ میں نے کسی حسین سے اس کا جواب نہیں مانگا۔

وہ صبح میری زندگی کی بہت کڑوی صبح تھی جسے حسین نے اور بھی کڑوا بنا دیا تھا۔ اسی لیے میں نے حسین کو آج تک معاف نہیں کیا ہے۔ میں اس کا بھیجا رسالہ پڑھتی رہتی ہوں۔ اس سے فون پر بات بھی کر لیتی ہوں۔ اب اس کا مسودہ میرے پاس آیا ہے، میں اس پر انتقاماً کچھ نہیں لکھوں گی۔ وہ جائے کہیں اور جا کر اپنی تحریر پر کسی سے بھی کچھ لکھوا لے اس کے لیے یہی سزا ہے۔ ہے بھی یا نہیں مجھے اس سے غرض نہیں کہ میرا وہ سوال جو اس صبح اس

سے کرنا تھا، آج بھی حل طلب ہے۔

کیا ہجرت ہم پر فرض تھی؟

مجھے غلط نہ سمجھا جائے کہ ہجرت کے عوض اپنا گھر، عیش و آسائش چھوڑنے کا مجھے دکھ ہے۔ مجھے تو ابا کا وہ دو گز کا کچا مکان چھوڑ آنے کا دکھ ہے جس پر اُن کا سالِ پیدائش اور سالِ وفات درج ہے اور جہاں کھڑے ہو کر آج تک میں نے فاتحہ بھی نہیں پڑھی ہے۔ ہجرت کے عوض مجھے یہ کرب قبول نہیں تھا۔ نہیں ہے۔ اگر حسین برسوں پہلے مجھے ہجرت کا کوئی اور آسان سا اپنی عادت کے مطابق کوئی شگفتہ سا جواب دے دیتے تب میرے بچپن کا کچا ذہن اسے قبول کر چکا ہوتا اور وہی ذہن آج تک میرے ساتھ ساتھ ہوتا، اور کرب کب کا میرا پیچھا چھوڑ چکا ہوتا۔ وہ کرب تو آج بھی موجود ہے۔ شکایت آج بھی اپنی جگہ ہے۔ میں حسین کو کیسے معاف کر سکتی ہوں۔

کہانی سات دنوں کی... صغیرافراہیم کے ساتھ

چودہ دسمبر دو ہزار پندرہ کا دن اس لیے اہم تھا کہ اس روز ہندوستان سے ایک ایسی شخصیت میرے گھر آنے والی تھی جن سے تعارف صرف ڈیڑھ سال قبل ہندوستان ہی میں ہوا تھا۔

۲۱، مئی دو ہزار چودہ کا دن بھی میری زندگی کا بہت اہم دن تھا جب پہلی بار میں نے علی گڑھ کی زمین پر اپنے پاؤں رکھے تھے۔ جہاں تک پہنچنے کی تمنا میرے دل میں چھ دہائیوں سے تھی۔ جہاں میں نے زندگی کے ابتدائی دو ڈھائی سال گزارے تھے۔ انگلی پکڑ کر ڈیڑھ ٹانگوں سے چلنا سیکھا تھا۔ میری آنکھوں میں وہاں کا کوئی منظر بھی موجود نہیں تھا۔ بس اپنے گھر کے آنگن میں جامن کا اونچا سا درخت کبھی کبھی حافظے میں آجاتا۔ بہت زور دوں تب گھر کے باہر دور تک پھیلی سُرخ دیوار بھی ذہن میں کوند جایا کرتی۔ اپنی جان سے پیاری گڑیا کا چولھے میں گر کر جل جانا بھی کبھی یاد آجاتا۔ ہاں ایک اَن دیکھا قبرستان واضح طور پر نظروں میں محفوظ تھا کہ سب قبرستان ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔

بے ترتیب قبریں، اُداس ماحول اور پھیلا ہوا سناٹا۔ بس ایک ایسے ہی قبرستان میں ایک شکستہ سی قبر جو انگلی پکڑ کر چلنا سکھانے والے میرے ابا کی تھی۔ علی گڑھ بس یوں مجھے بہت پیارا تھا۔ عمر بھر سوچتی رہی اس شہر گئی بھی تو کون مجھے پہچانے گا۔ میں کس سے کیا کہہ کر ملوں گی۔ قبرستان بھی جاؤں گی تو کون سا ابا مجھ سے بات کریں گے۔

پھر میں کیوں جانا چاہتی تھی اور کیوں چلی گئی؟

ابا سے رو رو کر معافی مانگی دیر سے آنے کی۔ میں نے انھیں بتایا بھی کہ مجھے پانچ بچوں کی انگلی پکڑ کر چلنا سکھانا تھا، اور جب وہ دوڑنے بھاگنے کے قابل ہوئے، تب دوڑتے بھاگتے، دور بہت دور چلے گئے۔ اب ویزا پاسپورٹ ہمارے درمیان حائل ہے۔ ایسے ہی جیسے ہمارے آپ کے درمیان ہے۔

اس شہر میں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے جس شخصیت سے میرا تعارف ہوا وہ صغیر افراہیم تھے جن کی تحریریں میری نظر سے گزر چکی تھیں، مگر آشنائی بالکل بھی نہیں تھی۔ ابھی ہم نے گیسٹ ہاؤس پہنچ کر سامان بھی نہیں ٹھیک سے رکھا تھا۔ دہلی سے دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ہاتھ منہ بھی نہیں دھویا تھا کہ صغیر افراہیم صاحب گیسٹ ہاؤس نمبر ایک کے کمرہ نمبر سات کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔

ہوا دراصل یوں تھا کہ دہلی میں ایک روز قیام کے دوران میری ارتضٰی کریم صاحب سے گفتگو ہوئی تھی۔ اُن سے بھی بس ایک سال قبل کراچی آرٹس کونسل کی سالانہ اردو کانفرنس کے اختتام پر چند منٹ کی ملاقات تھی۔ میرے ہاتھ میں ابا کا مجموعۂ کلام ''افکارِ حسن'' تھا جسے میں نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس کی کہانی بھی الگ ہے اور دیباچے میں درج ہے۔ تب سے بس یہ خواہش تھی کہ اُن کی یہ کتاب اُن کے وطن، اُن کے شہر اور اُن کی درس گاہ تک پہنچ جائے۔ میں نے ارتضٰی کریم صاحب سے نہ جانے کس لہجے اور الفاظ میں گفتگو کی کہ وہ شک بھری نظروں سے مجھے دیکھتے رہے۔ شک میرے ذہنی توازن کے بارے میں ہوسکتا تھا۔ بس اسی شک نے میری یاد اُن کے ذہن کے کسی کونے میں محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ فوراً پہچان گئے صغیر صاحب کو اطلاع کردی۔ میرا تعارف کرادیا۔

دہلی سے علی گڑھ تک گاڑی سے کیا ہوا سفر میری زندگی کا سب سے کڑا اور جذباتی سفر تھا۔ جس کی روداد میں ''چشمِ نم'' سفرنامہ ہندوستان میں تحریر کرچکی ہوں۔

میں اس سفر میں ذہنی اور جسمانی دونوں طور پر ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ آنسوؤں کا سمندر تو نہ جانے کیسے اُمڈ پڑا تھا۔ روانی روکے نہیں رُک رہی تھی۔ میرا جسم باقاعدہ کانپ رہا

تھا۔ چہرہ اُجاڑ، کپڑے ملگجے اور ذہن منتشر۔ بس اسی وقت دستک ہوئی اور صغیر افراہیم صاحب اپنے تعارف کے ساتھ اندر آگئے۔ ناقابلِ یقین بات تھی۔ اس شہر میں اپنی آمد کی اطلاع میں نے کب کس کو دی تھی۔ کون میرا منتظر تھا۔ کون میرا ماضی جانتا تھا، کون میری ولدیت سے واقف تھا۔ رشید احمد صدیقی کے عزیز ترین شاگرد کی بیٹی۔ جس شاگرد کے مرنے پر انھوں نے رو روکر اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں خاکہ تحریر کرکے اُنھیں امر کردیا تھا۔

ہاں اُس بیٹی سے ملنے اُسی کے باپ کی شعبۂ اردو کے پروفیسر صغیر افراہیم سامنے کھڑے تھے۔ یہ پہلی ملاقات تھی اور اب وہ زندگی میں یوں داخل ہوگئے ہیں کہ شاید نسیان کے مرض میں مبتلا ہوجانے کے بعد بھی اگر خدانخواستہ میں اس میں مبتلا ہوئی بھی تو اُن کو پہچاننے میں دیر نہیں لگاؤں گی۔

وہی صغیر افراہیم آج پی آئی اے کی فلائٹ PK273 سے کراچی آنے والے تھے۔ اور میں اُن کے استقبال کی تیاری ایک ہفتے سے کررہی تھی۔ عصمت چغتائی کی صد سالہ سال گرہ کی تقریب میں شرکت کے بعد خود بھی اسی فلائٹ سے گزرے پیر کے دن کراچی واپس پہنچی تھی۔

اُن کے لیے کمرہ تیار تھا۔ کاغذ قلم کے علاوہ، ٹوپی، جائے نماز، تازہ پھول، ڈرائی فروٹ، مختلف قسم کی چاکلیٹ، ایک موبائل اور پرفیوم کے علاوہ ایئر فریشنر خاص طور سے ڈریسنگ ٹیبل پر سجادیا تھا۔ شیلف ہی میں نہیں الماریاں کتابوں سے بھری تھیں۔ ناقدانہ نظروں سے کمرے کا جائزہ بھی لیا تھا اور مطمئن تھی کہ انھیں یہاں قیام کے دنوں میں کوئی تکلیف ہرگز نہیں ہوگی۔ ہاں بس سیما کی کمی اُنھیں ضرور محسوس ہوگی، مگر میں اُنھیں یہاں لانے سے مجبور تھی کہ اس کے خطاوار وہ خود ہیں۔

جہاز کی آمد سے قبل ہم ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ نثار نے اُن کے بارے میں اتنا کچھ سن رکھا تھا کہ اب وہ اُن کے لیے کوئی اجنبی نہیں رہ گئے تھے۔ میری نشان دہی کے بغیر پہچان سکتے تھے۔

قائداعظم کراچی ایئرپورٹ کے لاؤنج میں کبھی کھڑے اور کبھی بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ حسبِ روایت فلائٹ دیر سے پہنچی، منٹوں کی نہیں گھنٹوں کی دیر تھی، مگر بچ جایئے ہم پر

انتظار کی کوفت کے بجائے آمد کی خوشی حاوی تھی۔

ایک چھوٹا سا سوٹ کیس سنبھالے وہ باہر نکلے۔ کوٹ پینٹ سر پر ٹوپی ہمارے یہاں یہ ٹوپی جناح کیپ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔

اس کی تاریخ یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پچیس واں اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا جس کی صدارت قائد اعظم کر رہے تھے۔ یہ اجلاس اس لیے بھی اہم تھا کہ اس اجلاس میں مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ اس خوشی کے موقعے پر نواب محمد اسمٰعیل خاں نے اپنی سیمور کی ٹوپی قائد اعظم کو پیش کی جو انھوں نے بخوشی قبول کر کے پہن بھی لی، جو اُن کی شخصیت پر سج بھی رہی تھی۔ قائد اعظم اسی ٹوپی کو پہن کر جب ڈائس پر آئے تو پچاس ہزار کا مجمع اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ قائد اعظم نے بعد میں بھی بارہا اس ٹوپی کا استعمال کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ ٹوپی جناح کیپ کہلائی اور اب یہ پاکستانیوں کی پہچان بن چکی ہے۔ مجھے نہیں معلوم ہندوستان میں یہ کیا کہلاتی ہے۔

تاخیر پی آئی اے نے کی تھی، مگر تاخیر کی معذرت ہم نے کی۔ صغیر صاحب کی عادت یہ ہے کہ اگر کوئی مشکل بات یا موقع ہو تب بھی وہ پہلے مسکراتے ہیں پھر چہرے پر پریشانی کے آثار لاتے ہیں۔ مسکراتے رہے اور بتاتے رہے کہ ایک مشکوک مسافر سے طویل پوچھ گچھ کے باعث ہمیں دو گھنٹے انتظار کی کوفت اٹھانی پڑی۔ پھر بھی تاخیر اُن کے لیے زیادہ پریشانی کا سبب نہیں تھی وہ تو شکوہ کر رہے تھے کہ پی آئی نے اُن کے سوٹ کیس میں سوراخ کر دیا ہے۔

میں نے کہا، آپ نے سامان بھرنے میں کنجوسی دکھائی ہوگی۔ ہوائی سفر میں اگر سوٹ کیس ذرا بھی خالی ہو تو نتیجہ یہی نکلتا ہے جو نکلا ہے۔

''جی ہاں جب میں نے حکام سے شکایت کی تب انھوں نے بھی یہی وجہ بتائی۔'' وہ بولے۔

''کوئی بات نہیں آپ کے سوٹ کیس کی مرمت ہو جائے گی آپ فکر نہ کریں۔'' پھر وہ بالکل مطمئن ہو گئے۔

نثار ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ آگے اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ایئر پورٹ

سے نکلتے ہی وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس دن حکومت اور رینجرز کے درمیان جو مذاکرات ہوئے تھے، اُس سے رینجرز صاحبان مطمئن نہیں تھے اور طویل سڑک بلاک کررکھی تھی۔ یوں شاہراہِ فیصل ٹریفک کے لیے مکمل بند تھی۔

یہ سڑک ایئرپورٹ سے بغیر دائیں بائیں مڑے سیدھے ہمارے گھر کے چوک تک پہنچا دیتی ہے۔اب ڈرائیور کو متبادل راستہ تلاش کرنا تھا جو کچی آبادی کے کچے راستوں سے ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

ڈرائیور سمیت ہمیں بھی نہیں معلوم تھا کہ ہم آگے جا کر کراچی کے کون سے محلے میں نکلیں گے۔ ایک تو پرواز کی تاخیر اب کار کی تاخیر، کھانے کا وقت گزرا جارہا تھا۔ یقیناً صفیر صاحب بھوک سے بھی دوچار ہوں گے، مگر جوشِ جذبات میں اُن کے چہرے پر بھوک کے آثار نہیں پائے جارہے تھے۔ ہم البتہ شرمندہ تھے کہ اُنھیں مناسب، بلکہ شہرِ کراچی کے خوب صورت ترین راستے کے بجائے گرد اُڑاتے ہوئے راستے پر لیے چل رہے تھے۔

ہمیں تو شاہراہِ فیصل کے دائیں بائیں بہت سی عمارتیں دکھائی تھیں۔ سب سے اہم اپنا کالج جہاں چالیس سال ہم نے معاشیات کے لیکچرز دیے اور طالب علموں کو ہم نصاب سرگرمیوں سے آراستہ کیا۔ وہ تمام دن جو اُس درس گاہ میں گزرے، میری زندگی کے بڑے بامعنی اور خوش گوار ترین دن تھے۔

دوپہر کے بجائے سہ پہر ہم گھر پہنچے۔ ہم بتاتے چلیں کہ کراچی میں دو مقامات بہت مشہور ہیں اور اجنبی بھی آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔ ایک قائداعظم کا مزار اور دوسرا ہمارا گھر جو تین تلوار کے چوک پر واقع ہے اور ہم اپنے گھر کا پتا بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ بس ہم تو تیغوں کے سائے میں رہتے ہیں۔ ایک دو نہیں، بلکہ اکٹھا تین تیغوں کے جس کی ہر تیغ پر کسی قدرداں نے قائداعظم کے تین اقوال درج کردیے ہیں: اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم۔

ٹھنڈا کھانا میز پر انتظار کررہا تھا۔ وقت ضائع کیے بغیر گھر سے فوری نکل پڑنے کا پروگرام بنایا کہ کراچی میں قیام کے صرف سات دن واپسی کے ٹکٹ پر درج تھے۔

کراچی شہر میں تفریح کے کئی مراکز ہیں۔ کچھ دور، بہت دور اور چند ایک قریب اور

ہمارے گھر سے بہت قریب۔ ساحلِ سمندر کی سیر کا تو کیا کہنا۔ اس کے علاوہ کئی ایک شاپنگ مال جہاں مقامی اور دیگر ممالک کی اشیا بآسانی دستیاب ہیں۔ خریداری نہ بھی مقصود ہو تو شوکیس میں بجی سجائی خوب صورت چیزیں دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ شاپنگ مال صبح سویرے کھل جاتے ہیں اور تقریباً آدھی رات تک آنے والوں کو متاثر بھی کرتے ہیں اور فوڈ کورٹ میں گھسیٹ کر لاتے ہیں جہاں دنیا بھر کے مشہور کھانے بغیر اُن ممالک میں جائے مل جاتے ہیں۔

ہم جس جگہ رہتے ہیں وہ شاپنگ مال، فوڈ کورٹ اور کچھ ہی دور جا کر سمندر سے مل لیتے ہیں۔ منٹوں میں سب سے بڑے ڈالمن مال میں جا پہنچے۔ یہ چکاچوند کر دینے والا مال ہے جو دنیا بھر سے آئی ہوئی چیزوں سے بھرا پڑا ہے۔ اسی میں ایک ہائپر اسٹار ہے۔ یہ ایک اسٹور ہے جہاں ڈبل روٹی مکھن جام سے لے کر دالیں سبزیاں فروزن اشیا، پھل، کپڑے، پرفیوم، میک اپ کی انواع و اقسام، کراکری، کھلونے، بچوں کے سامان، فریج، ٹی وی اور موبائل سمیت کیا نہیں ہے؟

صغیر افراہیم صاحب باربار جیب میں ہاتھ ڈالتے اور نکالتے رہے۔ ہم نے کہا بھی پاکستانی روپے حاضر ہیں۔ روپیا تبدیل کرا کے واپس کر دیجیے گا، مگر وہ انکار کرتے رہے۔ بھلا صرف بیس کلو وزن میں کیا کیا لے جا سکتا ہوں۔ کتابوں کا بطورِ خاص خیال رکھنا ہے۔ بات اُن کی درست تھی۔ دوسرے ملکوں میں جا کر مطلوبہ وزن دماغ پر ہمہ وقت سوار رہتا ہے۔

شام تک ہم ایک مال سے دوسرے مال پر آتے جاتے رہے۔ ہم نے پوچھا بھی کیسا لگ رہا ہے ہمارا شہر کراچی۔ انھوں نے شاید ہمارا دل رکھنے کے لیے کہا، اچھا ہے، بہت اچھا، کراچی کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ترقی یافتہ شہر ہے۔ بارونق ہے۔ خوش حال ہے۔ بس ویسا ہی ہے، مگر ابھی ہم نے پورا دیکھا کب ہے، مگر ہاں چاول کے ایک دانے سے دیگ کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

ہم نے بھی کہا، سلام مچھلی شہری نے ایک موقعے پر آنکھوں میں آنسو بھر کر دردناک لہجے میں کہا تھا، سارا ہندوستان اجڑا ہے تب ایک کراچی آباد ہوا ہے۔ اُن کی آواز میں ہندوستان اُجڑنے کا دکھ بھی تھا اور کراچی شہر بسنے کی خوشی بھی۔ یہ موقع بھی بڑا عجیب ہوتا ہے

جہاں غم اور خوشی ایک ساتھ آ ملتے ہیں، مگر ہجرت زدہ لوگوں کے دل میں دکھ کی ہمیشہ ایک جگہ موجود ہوتی ہے۔ خوشی کم زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ اُن سے سوال کریں کہ کیا کبھی آپ نے یہ سوچا کہ ہمارے آباو اجداد نے ہجرت کیوں نہیں کی۔ اگر وہ کرتے تو اچھا ہوتا یا نہیں کی تو اچھا کیا۔

لیکن ہم نے اپنا یہ سوال اپنے اندر ہی دبا لیا۔ شاید اس ڈر سے بھی کہ اگر وہ پلٹ کر ہم سے یہی سوال کر دیں کہ آپ کے آباو اجداد نے ہجرت نہ کی ہوتی تب — تب ہم کیا جواب دیتے۔ بعض سوالوں کے جواب ہوتے ہی نہیں۔ شاید اس سوال کا بھی جواب نہ اُن کے پاس تھا نہ ہمارے پاس ہے، جو ہو گیا سو ہو گیا۔ رشتے بٹ گئے۔ دور ہو گئے۔ آبائی گھر، اجداد کی قبریں سب چھوڑ آئے، آئے، آ کر بہت محنت کی یہاں والوں کے سوال کے جواب دیے۔ ''تمھارے پاس جتنا ہے ہم اتنا چھوڑ آئے ہیں'' مجھے ایسے موقع پر سرشار صدیقی کا یہ شعر بہت سہارا دیتا ہے۔ سرشار صاحب نے نوجوانی میں کان پور چھوڑا تھا۔ اپنا گھر، اپنی درس گاہ، اپنے عزیز، اپنے دوست، اپنے ماں باپ حتیٰ کہ بہن بھائی بھی بس اکیلے آ گئے۔ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے کہا:

ترکِ وطن تو سنت بھی ہے اور ہماری قسمت بھی
ہجرت پر مجبور نہیں تھے ہجرت پر مامور تھے ہم

ذہن میں دو ملکوں کی تاریخ پھر سے پڑھ رہے تھے۔ فوڈ کورٹ میں کھانا کھایا، رات دیر تک گھومتے رہے، گھر آئے، صغیر صاحب کی اس شہر میں پہلی رات تھی۔ تھکن سے بھرپور بھی۔ وہ بھی جلد ہی سو گئے۔ اُن کے سونے سے پہلے ہم نے ہدایت کر دی تھی جب بھی ضرورت محسوس کریں آواز دے لیجیے گا ہم جاگتے ملیں گے، مگر انھوں نے آواز نہیں دی۔ اگر آواز دیتے تب ہم انھیں جاگتے ہی ملتے کہ رات نثار کی طبیعت خراب ہو گئی۔ نزلہ زکام پہلے سے تھا۔ جسم ٹوٹنے لگا، سر درد شدید تھا۔ گلا بیٹھا ہوا، سانس میں دشواری، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انھیں کیسے ٹھیک کر دوں۔ صبح ہو گی تب کیا ہو گا کہ ہم تو آلو بھی خریدنے ساتھ ہی جاتے ہیں۔ بغیر نثار کے میں کیا کر پاؤں گی۔

اور پھر پندرہ دسمبر شام چار بجے اردو یونی ورسٹی کی تقریب میں بھی تو جانا تھا جو صغیر صاحب کے اعزاز میں خاص طور سے منعقد ہو رہی تھی۔

ہم دونوں ساری رات جاگتے رہے، دوا ڈھیٹ ثابت ہوئی۔ ذرّہ بھر بھی افاقہ نہیں ہوا۔ پریشانی اور بے چینی میں اضافہ الگ۔

پتا چلا میرا سر بھی بھاری اور زکام سے دوستی ہو چکی ہے۔ بہرکیف صبح کمرے سے نکلی ناشتا تیار کرنا تھا سو کیا، مگر ویسا نہیں جیسا کرنا تھا۔

صغیر صاحب نہا دھو کر پورے آب و تاب کے ساتھ بیٹھے روز نامہ ''جنگ'' اور ''ڈان'' پڑھ رہے تھے۔ ہم نے شکر ادا کیا کہ وائرس نے غیر ملکی کو بخش دیا ہے۔ مزید دعا مانگی کہ وہ محفوظ رہیں اگرچہ زکام کا شربت وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور پہلی فرصت میں سامان سے نکال کر انھوں نے نمایاں جگہ پر رکھ دیا تھا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد کہنے لگے، گھر تو دکھائیں۔ پانچ کمروں اور پانچ بچوں والا یہ گھر اب اُداس رہتا ہے کہ بچے بڑے ہو گئے۔ چلنا ہی نہیں دوڑنا بھاگنا بھی آ گیا اور وہ دوڑ بھاگ کر دوسرے ملک میں تیسرے درجے کے شہری بن چکے ہیں۔ ہم سے واسطہ فون، وائبر اور فیس ٹائم پر رہتا ہے۔ بچوں کے بچوں کو کھلانے کا ارمان دل میں دبا رہ گیا ہے۔ عید، بقرعید ملاقات کا اہتمام ہوتا ہے اور کبھی ہم اُن کے غیر ملکی گھر کے مہمان بن جاتے ہیں۔ سارے خالی کمرے دکھائے۔ اُن کی کتابیں، اُن کی تصویریں اپنی جگہ پر ہیں۔ ہمارا ملک اب سینئر سٹیزن کا ملک ہے۔ ہماری اُداسی صغیر صاحب بھانپ گئے اور دل رکھنے کے لیے گھر کی سجاوٹ، صفائی اور کتابوں کے ڈھیر اور اُن کی ترتیب کی تعریف کر کے ہمیں خوش کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔

ہم نے بھی جلد ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور بتایا کہ ہمارے گھر میں تین کاف رہتے ہیں۔ کتابیں، کپڑے اور کراکری۔

کتابیں بیڈ کے اوپر، اردگرد اور شیلف پر اتنی تعداد میں ہیں کہ اگر زلزلہ آیا تو کتابوں کے وزن سے دب کر مریں گے، مگر کیا شان دار موت ہوگی۔ صغیر صاحب میری بہکی باتیں بغور سن رہے تھے۔

گھر کے تعارف سے فارغ ہوئے تو انھوں نے نثار کے بارے میں پوچھا، ''کیا نثار صاحب دیر تک سونے کے عادی ہیں۔''

''جی نہیں۔ وہ تو فجر سے بھی پہلے اُٹھ جاتے ہیں۔ دن بھر کی کوئی نماز بے شک قضا ہوسکتی ہے۔ فجر کبھی قضا نہیں ہوسکتی، مگر آج کی بات اور ہے۔ وہ تو ساری رات ہی جاگتے رہے۔ اب کہیں جا کر نیند آئی ہے۔'' میں یہ کہہ رہی تھی کہ نثار ڈھیلے ڈھالے انداز میں کمرے سے برآمد ہوئے۔ ہم نے پوچھا، کیا ارادہ ہے، ساتھ چل پائیں گے۔

انھوں نے ہمت سے کہا، چلیں گے۔ چائے پی اور گفتگو میں شریک ہوگئے۔ مجھے خوشی تھی کہ نثار کی طبیعت میں بہتری آرہی ہے۔

ہم اردو یونی ورسٹی کی تقریب پذیرائی میں شرکت کے لیے روانہ ہوگئے جہاں ہمیں صغیر صاحب کو حاضرین سے متعارف کرانے کی ڈیوٹی سونپی گئی تھی۔ اردو یونی ورسٹی بابائے اردو مولوی عبدالحق کا خواب تھا جسے وہ زندگی بھر دیکھتے رہے۔ اردو کالج کی قدیم عمارت کے ایک تنگ سے کمرے کو انھوں نے اپنا مسکن بنایا ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں اسکول میں پڑھتی تھی اور میرے دادا اپنی لاٹھی بنا کر مجھے ساتھ لے کر بابائے اردو سے ملنے نکلتے۔ وہ دونوں دوست محو ہو کر ڈھیر ساری باتیں کرتے اور میں بابائے اردو کو تکتی رہتی اور سوچتی وہ اتنی ڈھیر ساری کتابوں میں گھرے یکسانی سے تھک نہیں جاتے۔ کیا انھوں نے یہ ساری کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ ان میں کتنی کتابیں خود ان کی تحریر کردہ ہیں۔ وہ اتنی ڈھیر ساری کتابیں لے کر ہندوستان سے یہاں تک کیسے آئے ہوں گے۔ ۱۹۰۳ء میں محسن الملک کی قائم کردہ انجمن ترقیِ اردو اُن کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ لگتا تھا وہ بس یہی مشن لے کر پیدا ہوئے ہیں، اور اُن کے دل میں اردو کے علاوہ کسی اور رشتے کا کوئی گزر نہیں۔ نہ بیوی، نہ بچے، نہ بھائی بہن۔ تمام رشتوں سے بے نیاز بس انھوں نے اردو سے رشتہ جوڑ رکھا تھا۔ یہی وہ انجمن ترقیِ اردو کی لائبریری تھی جہاں سے مجھے اپنے پردادا کی کلیاتِ قاری مل گئی تھی جو ۱۹۳۱ء میں مقتدا خاں شروانی کے زیرِ اہتمام علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پریس سے شائع ہوئی تھی اور اب جس کی کوئی کاپی ہمارے خاندان میں کسی کے پاس موجود نہیں ہے۔ ہجرت کے ہنگاموں اور بے سروسامانی

نے ایسی قیمتی کتاب کی دید سے ہمیں محروم کر رکھا تھا۔

پاکستان آکر بابائے اردو نے اردو یونی ورسٹی کا خواب دیکھا اور ہم ''بزمِ امروز'' کے بچوں نے پہلا چندہ دو سو ساٹھ روپے کا ایک بٹوے میں رکھ کر ۱۹۶۰ء میں اُن کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ یہ ''بزمِ امروز'' کراچی سے نکلنے والے ایک بڑے اخبار روزنامہ ''امروز'' کی بچوں کی انجمن تھی۔ جس کے روحِ رواں افضل صدیقی تھے۔ جنھوں نے بابائے اردو کو بزم کا سربراہ بھی بنایا تھا۔

مجھے وہ دن اب بھی اچھی طرح یاد ہے جب اردو کالج کے اسٹیج پر بابائے اردو تشریف فرما تھے اور ہم بچے چندے کی تھیلی لے کر اسٹیج پر اُن تک پہنچے تھے۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں کا کٹورا بنا کر تھیلی تھامی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے اور کٹورا بنے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر انھوں نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے ہمارا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ کہا تھا بڑوں نے میری التجا نہیں سنی، مگر بزمِ امروز کے بچوں نے پہل کردی۔ اب مجھے یقین ہے اردو یونی ورسٹی ضرور بنے گی تب میں ایک پتھر دیوار پر چنوا کر تم بچوں کے نام اُس پر لکھواؤں گا۔ اردو یونی ورسٹی کے لیے یہ پہلا چندہ ہے۔ بڑا قیمتی ہے اس کا ایک ایک روپیا کہ یہ بچوں کا جیب خرچ ہے جو انھوں نے جمع کر کے کارِ خیر کیا ہے۔

پھر وہ بے بسی سے بولے، مجھے سرسیّد جیسا چندہ جمع کرنے کا ہنر نہیں آتا، مگر مجھے امید ہے کہ ایک دن اردو یونی ورسٹی بن کر رہے گی۔ چاہے میرے دنیا سے چلے جانے کے بعد ہی بنے، اور شاید اُن کے دنیا سے جانے کا ہی انتظار تھا۔ ایسے ہی جیسے پیڑ کوئی لگاتا ہے چھاؤں کوئی پاتا ہے۔ چھاؤں کے لیے سرتوڑ کر کوشش تو کی۔ ایسے ہی جیسے علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لیے ایک نئے ملک کا خواب دیکھا اور اُن کے دنیا سے چلے جانے کے بعد دنیا کے نقشے پر مسلمانوں کا ایک ملک معرضِ وجود میں آگیا۔

آج بابائے اردو کے خواب کی تعبیر اردو یونی ورسٹی کے ڈاکٹر عبدالقدیر آڈیٹوریم میں صغیر افراہیم صاحب کو خوش آمدید کہا جارہا تھا۔ صغیر صاحب کے خطاب کا موضوع تھا ''عہدِ حاضر میں سرسیّد اور رفقائے سرسیّد کی معنویت''۔

صغیر صاحب پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے، مکمل اعتماد کے ساتھ انھوں نے خطاب کیا اور خوب کیا۔ حاضرین پوری دل چسپی اور دل جمعی سے اُن کے خطاب کو سن رہے تھے اور محظوظ ہو رہے تھے۔ صدارت کے فرائض شیخ الجامعہ سلیمان ڈی محمد کر رہے تھے۔ میں نے صغیر افراہیم صاحب کا حاضرین سے تعارف کرایا۔ تعارف نامکمل تھا کہ اگر میں اُن کی خصوصیات، کارکردگی، تصانیف کی تفصیل اور اُن کی چستی پھرتی کی کُل روداد بتاتی تب ایک گھنٹے سے کم کا میرا بھی لیکچر نہ ہوتا۔ سو، تھوڑا سا تعارف کرا کے کہا، تھوڑے کو بہت جانیے۔

فاطمہ حسن آج کل انجمن ترقیِ اردو کی اعزازی سکریٹری ہیں۔ یہ جگہ جمیل الدین عالی صاحب کے انتقال کے باعث خالی ہوئی ہے۔ جنھوں نے بابائے اردو کے انتقال کے بعد آدھی صدی تک اُن کی جانشینی کی اور دل سے کی اور اُن کی ہی ہمت، محنت اور اعلیٰ حکام تک پہنچ کے باعث اردو یونی ورسٹی کا قیام ممکن ہوا۔

صغیر صاحب کے خطاب کے بعد سوال جواب کا دور شروع ہوا۔ حاضرین کے سوال دل چسپ اور صغیر صاحب کے جواب بے حد معلوماتی اور مطمئن کر دینے والے تھے۔

اردو یونی ورسٹی کی طرف سے اُن کی خدمت میں شیلڈ پیش کی گئی۔ چائے کی تواضع کے بعد ہمیں اپنے گھر کی طرف روانہ ہونا تھا۔

اس روانگی میں ہمیں خفت کا سامنا کرنا پڑا کہ اُسی دن وہاں پانی کی پائپ لائن پھٹ گئی تھی جس کے باعث سڑک ڈوبی ہوئی تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ کھسکتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ بہ مشکل ہم نے وہ تمام راستہ طے کیا۔

تمام وقت ہمیں میرؔ صاحب یاد آتے رہے:

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

شاید صغیر صاحب کچھ یوں سوچ رہے ہوں کہ ہمارے یہاں سڑک بند ہونا اور سڑک ڈوب جانا معمول کی بات ہو، مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ تو بس اُن کے استقبال کا ایک انداز تھا۔ اُس کے بعد سے آج تک نہ شارع فیصل بلاک ہوئی ہے اور نہ اردو یونی ورسٹی جانے والی سڑک پر کوئی پائپ لائن پھٹی ہے۔

واپسی میں نثار کی طبیعت مزید خراب ہوئی۔ میں نے بھی ہمت باندھی ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے لگتا سر گھوم رہا ہے اور بدن ٹوٹ رہا ہے۔ نفسیاتی حربہ آزماتی رہی کہ میں ٹھیک ہوں، میں ٹھیک ہوں، مگر میں ٹھیک نہیں تھی۔

گھر پہنچ کر جی چاہ رہا تھا کہ اپنے محترم مہمان کے ساتھ بیٹھ کر خوب باتیں کی جائیں۔ اُس ملک اور اُس شہر کی جو کبھی ہمارا بھی تھا۔ جہاں آج بھی ہمارا گھر ہے، مگر دوسرے رہ رہے ہیں۔ ہمارے ابا وہیں سوئے ہوئے ہیں اور جہاں کے لیے آج بھی ہمارا دل دھڑکتا ہے، لیکن بخار نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ نثار کو دوا دی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ جانے کی ہدایت کی۔ صغیر صاحب بھی جوشِ خطابت اور تابڑ توڑ سوالات سے تھک چکے تھے یا کلب کا ڈنر زیادہ بھاری محسوس ہورہا تھا۔ کمرے سے نکلے ہی نہیں۔ مجھے یاد نہیں میں نے اپنے ساتھ کیا سلوک کیا، مگر صبح اپنے وقت پر اٹھ گئی اور ناشتے کی میز پر چاق چوبند صغیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ خوش تھے۔ شاید کل کا پروگرام انھیں زیادہ پسند آیا تھا۔

یہ صبح ۱۶/ دسمبر کی تھی۔ ہماری ملکی تاریخ کا خوف ناک اور الم ناک دن۔ گزشتہ سال اسی دن خیبر پختون خواہ صوبے کے آرمی پبلک اسکول کے معصوم بچے دہشت گردی کا نشانہ بنے تھے۔ یہ دن سرکاری سطح پر یومِ سوگ کی صورت منایا جارہا تھا۔ ہر ایک کا دل غمگین اُداس اور آنکھیں لب ریز تھیں۔ تمام دن شہید بچوں کی تصویریں ٹی وی پر دکھائی جاتی رہیں۔ اخبار کے صفحات کالے حاشیے کے ساتھ چھپے تھے۔ بچے جو بن کھلے مرجھا گئے، اُنھیں دیکھنا آسان نہ تھا۔ سارے ملک میں دعائیہ جلسے ہورہے تھے۔ اُن بہادر اساتذہ کے تذکرے تھے جنھوں نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر کتنے ہی بچوں کو بچالیا اور خود کو شعلوں کی نذر کردیا۔

دیر تک ہم اسی دہشت گردی پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ وہی صبح تھی، گزشتہ سال بھی آئی تھی جب ننھے منے بچے بستہ دبائے اپنے اسکول کی جانب خوشی خوشی رواں دواں تھے۔ مائیں نہیں جانتی تھیں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کو جو یونی فارم پہنا رہی ہیں وہ خون میں ڈوبنے والا ہے۔ نوالہ بنا بنا کر ناشتا اُن کے منہ میں ڈالنے والی مائیں نہیں جانتی تھیں کہ یہ اُن کا آخری ناشتا ہے، اب وہ اپنے گھر کا کھانا کھانے نہیں آپائیں گے۔ یہ صبح ان بچوں

کی آخری صبح ہے۔ مائیں پھر زندگی بھر اپنے بچوں کی آمد کی منتظر ہوں گی۔ گھر کا دروازہ کھلا رہے گا، مگر اُن کا بچہ اُس میں کبھی داخل نہیں ہوگا۔ ۱۶ر دسمبر کی صبح جواب صدیوں تک سوگوار صبح کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔

پتھر دل انسانوں نے جو دہشت گردی کا لقب از خود اختیار کر کے ان بچوں پر عذاب بن کر نازل ہوئے۔ پل بھر میں اُن کے بچپن کو بھسم کر دیا۔ وہ اپنی کتابوں کو سینے سے چمٹائے دنیا سے چلے گئے۔ یہ حادثہ پاکستان کی تاریخ کا بدترین حادثہ تھا، مگر بچے آج کے دن پھر اسکول جارہے تھے کہہ رہے تھے، ہم تم سے ڈرتے نہیں ہم روز اسکول جائیں گے۔ مائیں نئے عزم کے ساتھ اپنے بچوں کو تیار کریں گی۔ بستہ اُن کے بازوؤں پر سجائیں گی اور ماتھا چوم کر اُنھیں گھر سے رخصت کریں گی۔ اساتذہ اسکول میں اُنھیں خوش آمدید کہیں گے۔ زندہ قوم کے بچے حادثے کے بعد اور بھی مضبوط ہوجاتے ہیں۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر میں کچن میں اور صغیر صاحب اپنے کمرے میں تأثرات قلم بند کرتے رہے اور اُن مہمانوں کا بھی انتظار کرتے رہے جو آج کے دن اُن سے ملاقات کے لیے آنے والے تھے۔ فون کال بھی آرہی تھی۔ اسلام آباد سے پروفیسر رشید امجد صاحب کا بھی فون آیا جنھوں نے بذریعہ ہوائی ڈاک اپنی دو کتابیں ''عاشق صبر طلب'' اور ''گملے میں اُگا ہوا شہر'' بھی اُن کے نام ارسال کردی تھیں جو اگلے دن اُنھیں مل بھی گئیں۔ دن کے تین بجے پروفیسر ظفر اقبال صاحب تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ تحقیق و تدوین کے تعلق سے گفتگو کرتے رہے۔

ہم نے اُن سے کہہ رکھا تھا کہ آج کے دن کوئی ادبی تقریب تو ممکن نہیں، مگر ہم آپ کو جمیل جالبی کے گھر ضرور لے چلیں گے۔

ہمارے اس اعلان پر صغیر صاحب کا چہرہ گل نار ہوگیا۔ انھیں ۱۹۸۱ء کا وہ دن یاد آگیا جب ڈاکٹر صاحب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں جلوہ افروز تھے۔ طلبہ و طالبات کے ساتھ اساتذہ بھی اُنھیں گھیرے ہوئے تھے۔ تاریخِ ادب اردو موضوعِ بحث تھا۔ اُن دنوں صغیر صاحب ریسرچ میں داخل ہوچکے تھے۔

آج چھتیس سال بعد پھر اُن سے ملاقات ہونی تھی، مگر آج کے جالبی صاحب اُس دن کے جالبی صاحب سے بہت مختلف تھے۔ وہ اپنی عمر کی اُس حد تک آ چکے ہیں جہاں دل و دماغ جسم سے کم زور سا رشتہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ اب تاریخِ ادب اردو پر گفتگو کرنے کے قابل نہیں رہے، مگر ہاں انھوں نے وہ معرکۃ الآرا کتاب لکھ دی ہے جو اردو تاریخ کی گواہ بن چکی ہے۔ ۷۶۰ صفحات کی ضخیم کتاب لکھنے میں انھوں نے اپنی زندگی کے بیش قیمت لمحات صرف کیے ہیں۔

ہمارے گھر سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر اُن کا گھر ہے اور اُن کے بیٹے خاور جمیل سے میرا بڑا پرانا دوستی کا رشتہ ہے۔ ہم دونوں نے مل کر پچیس سال ایک ادبی انجمن پاکستان نیشنل اکیڈمی کے نام سے چلائی جس میں منعقد کردہ تقاریب ادبی تقریبات کا شان دار ماضی ہیں۔ یہی وہ تقاریب ہیں جہاں جمیل جالبی صاحب نے نوجوانی میں میرا تلفظ، معلومات اور نظامت میں بہتری لانے کے مفید مشورے دیے۔ اتنی حوصلہ افزائی کہ کہہ گئے اگر میں نظامت نہ کروں تو تقریب ملتوی یا منسوخ کردی جائے۔ اُن کی یہ حوصلہ افزائی میرے بہت کام آئی۔ ہم رات اُن کے گھر پہنچ گئے۔

خاور نے ہمیشہ کی طرح گرم جوشی سے استقبال کیا۔ صغیر افراہیم نے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔ جالبی صاحب کو وھیل چیئر پر لا کر اُن سے ملاقات کرائی۔ جالبی صاحب کی دن بہ دن گرتی صحت دیکھ کر دل کو بہت صدمہ پہنچتا ہے، مگر یہ تو قدرت کا دستور ہے۔ انھوں نے بہت شان دار اور کارآمد زندگی گزاری ہے۔ لمحہ لمحہ استعمال کیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ جسم ناتواں ضرور ہوا ہے، مگر دماغ اب بھی حاضر ہے۔ دھیمی آواز میں اب بھی گفتگو کر لیتے ہیں۔ اب بھی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ صغیر صاحب اُن کے پہلو میں بیٹھ گئے اور ایک ایک لمحہ اپنے لیے کارآمد بناتے گئے۔ جالبی صاحب کی مسکراہٹ اب بھی دل کش ہے اور میں ماضی کے وہ سارے لمحے جمع کرتی رہی جو اُن کے ساتھ گزرے ہیں۔

خاور کا گھر ہو، کھانے کا وقت ہو اور میز پر بلاوا نہ ہو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ شبانہ نے دیگر کھانوں کے ساتھ سرسوں کا ساگ، مکئی کی روٹی کا اعلان کر کے بھوک اور بڑھادی۔ صغیر صاحب کے لیے یہ ملاقات بہت اہم تھی۔ وہ جالبی صاحب سے مل کر خوش خوش گھر آئے

اور دیر تک یادداشت قلم بند کرتے رہے۔ میں اور نثار اپنے اپنے بخار کی آؤ بھگت دواؤں سے کرتے سو گئے۔

صبح ۷؍ دسمبر تھی اور یہ صبح سرسیّد یونی ورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے لیے مخصوص تھی۔ ایک زمانے تک یہ یونی ورسٹی مجھے صرف ذاکر علی خاں صاحب کے حوالے سے عزیز تھی کہ اس کے کیمپس میں ذاکر صاحب کی کئی کتابوں کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی تھی اور ہر تقریب کی نظامت میرے حصے میں آئی تھی، لیکن اب میں خود یہاں کا حصہ بن گئی ہوں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی نہ صرف رکن ہوں، بلکہ یہاں سے جاری رسالے ''تہذیب'' کی مدیر بھی ہوں۔ اس ناتے یہاں آنا اب معمول بن گیا ہے۔

موجودہ چانسلر جاوید انوار صاحب ہیں جن سے قربت زندگی میں بہترین لوگوں سے ملنے کا ایک اور اضافہ ہے۔ یہاں آج صغیر صاحب کی پذیرائی کا زبردست اہتمام تھا۔ حاضر علیگ کا سابق علیگیوں سے ملنے کا موقع تھا۔

یونی ورسٹی میں داخل ہوتے ہی یونی ورسٹی کے مونوگرام پر "**علم الانسان مالم یعلم**'' پڑھ کر سبحان اللہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

صغیر صاحب کو بتایا گیا کہ ۱۹۸۷ء میں صرف تیرہ سو طالب علموں سے باقاعدہ شروع ہونے والا یہ ادارہ آج ایک تناور درخت بن چکا ہے اور شہر کراچی کا ایک نمایاں تعلیمی ادارہ ہے جسے ذاکر علی خاں اور زیڈ اے نظامی نے اپنے ڈھیر سارے نامی گرامی علیگ ساتھیوں کے ساتھ ''سیّدی مشن'' کو سامنے رکھ کر قائم کیا تھا۔ یہ وہ ادارہ ہے جس کی اپنی کوئی قدیم طلبہ کی انجمن نہیں ہے، بلکہ اس نے خود قدیم طلبہ علی گڑھ سے جنم لیا ہے اور اس کے فارغ التحصیل طالب علم از خود اموبا (AMUOBA) میں شامل ہو جاتے ہیں۔ آج یہاں ایک علیگ مدعو تھے اور ڈھیر سارے علیگ منتظر۔

چانسلر جاوید انوار صاحب نے خیر مقدم کیا۔ ذاکر علی خاں مرحوم بار بار یاد آئے کہ یہ روایت اُن ہی کی بدولت رواج پائی ہے۔

صغیر افراہیم صاحب سے خطاب کے لیے کہا گیا تب وہ چہرہ گل نار کیے کھڑے

ہوئے کہہ رہے تھے کہ اس یونی ورسٹی کا چپہ چپہ مجھے علی گڑھ کی یاد دلا رہا ہے۔ ہر طرف اپنائیت ہے، محبت ہے، اُنسیت ہے۔ آپ لوگوں کا خلوص میرا دل گرما رہا ہے اور مجھے پہلی مرتبہ پاکستان آکر وہ کچھ ملا جس کی توقع بھی میں نہیں کر رہا تھا۔ وہ دیر تک علی گڑھ کی باتیں کرتے رہے۔ باتوں باتوں میں وہاں کی روایات کا تذکرہ آیا۔ ہمیں ذاکر صاحب کی ''روایاتِ علی گڑھ'' یاد آ گئی خصوصاً خطابات دینے کی روایت جس کی ابتدا خود سرسیّد نے کی تھی، انھوں نے اپنے منشی نجم الدین کو ''ٹٹو'' کہہ کر پکارا۔ پھر تو ''مولانا'' تین بھائی جعفر طیار، حیدر کرار اور احمد مختار کے بعد از خود چوتھے بھائی کا نام پاک پروردگار رکھ دیا گیا۔ پنڈا، مختار گھوڑا، سعید انڈا، استاد چھوارہ، پنڈلی، لاحول ولاقوۃ، بھنڈی اور چری جیسے القابات دیے جاتے رہے ہیں۔

درس گاہوں کی قدیم طلبہ انجمن بھی عجیب ہوتی ہے۔ زندگی بھر جوان بنائے رکھتی ہے۔ جب بھی ایک درس گاہ کے مختلف عمر کے لوگ اکٹھا ہوتے ہیں تب سب ہی نوجوان بن جاتے ہیں۔ لگتا ہے سب کی تاریخِ پیدائش ایک اور ایک کلاس روم سے پڑھ کر ابھی ابھی فارغ ہوئے ہیں۔ یا سامنے بلیک بورڈ ہے اور استاد محترم اپنے قیمتی الفاظ سے طالب علموں کا مستقبل سنوارنے میں مصروف ہیں۔

چانسلر جاوید انوار علیگ نے صغیر افراہیم علیگ کو خوش آمدید بھی کہا۔ اُن سے گفتگو بھی کی اور اُنھیں یونی ورسٹی کی طرف سے تحفے سے بھی نوازا۔ دوپہر کا کھانا سارے علیگیوں نے ساتھ کھایا اور صغیر صاحب سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر خدا حافظ کہا۔

گلشنِ اقبال کے علاقے میں واقع سرسیّد یونی ورسٹی کراچی کی چند اہم درس گاہوں میں سے ایک اہم درس گاہ ہے۔ ہر آن سڑک سے گزرتے لوگ محسنِ قوم سرسیّد احمد خاں کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ اُن کے حوالے سے شہر علی گڑھ کی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے۔ ہم نے صغیر افراہیم صاحب کو یہ بتانا ضروری سمجھا کہ کراچی شہر میں سرسیّد کالج بھی ہے۔ ٹیوشن سینٹر بھی ہے، سڑک بھی اُن کے نام سے موسوم ہے۔ مدرسہ بھی ہے، کئی ایک اسکول بھی ہیں۔ اس کے علاوہ علی گڑھ سوسائٹی بھی ہے۔ ہم ایک علی گڑھ تو بے شک چھوڑ آئے ہیں، لیکن یہاں آکر اس نام سے کئی ادارے قائم کر لیے ہیں۔

گلشنِ اقبال سے کلفٹن ہمارے گھر کا راستہ پینتالیس منٹ کا ہے، لیکن اگر یہ راستہ دفتری اوقات میں طے کیا جائے تب گھنٹوں سڑک پر ہی رہنا پڑتا ہے۔

راستے بھر تقریب کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی رہی۔ نثار حسبِ عادت خاموش تھے، مگر مجھے معلوم تھا کہ اس وقت عادت سے زیادہ طبیعت کی خرابی گفتگو سے باز رکھے ہوئے تھی۔ خواتین مردوں سے زیادہ باہمت ہوتی ہیں، ثبوت کے طور پر میں یقیناً ۱۰۲ر ڈگری بخار اپنے اندر چھپائے بیٹھی تھی اور گفتگو میں بھی شریک تھی۔

شام ہمیں پھر نکلنا تھا۔ پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں مبین مرزا میزبان تھے۔ ہائی ٹی پر مظہر جمیل، صبا اکرام، عنبرین حسیب اور حسیب احمد بھی موجود تھے۔ روایت کے مطابق ہلکے سُروں میں غزل سرائی جاری تھی، مگر ادب کے دیوانے فکشن کی موجودہ صورتِ حال پر دو ٹوک گفتگو میں مصروف تھے۔ ادب وصحافت بھی زیرِ بحث آئے۔ بار بار اٹھ کر پلیٹ میں کچھ نہ کچھ اپنی پسند کی چیز لائی جاتی رہیں۔ پی سی کی یہ ہائی ٹی شام کو بہت خوب صورت بنادیتی ہے، لیکن یہاں میری ہمت مکمل طور پر جواب دے چکی تھی۔ بخار کی شدت میں نہ صرف اضافہ ہوچکا تھا، بلکہ سردی کی شدت نے مجھے کانپنے پر مجبور کردیا تھا۔ نثار گھر پر تھے اور آنے کے قابل نہیں تھے۔ اُن کا بھی بار بار خیال آرہا تھا۔ جی چاہتا تھا بس گھر پہنچ جاؤ اور بستر سے اچھی کوئی جگہ ایسے میں نہیں ہوسکتی تھی، مگر سب اپنی گفتگو میں مصروف تھے اور خوش تھے۔ میں اپنی طبیعت کی خرابی کو حتی المقدور چھپانے کی کوشش کررہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ جب یہاں سے اٹھنا ہوگا تب کیا میری ٹانگیں چلنے کا بار اُٹھا پائیں گی، مگر ٹانگوں نے لاج رکھ لی۔ کانپی ڈگمگائیں، مگر جسم کو گرنے نہیں دیا۔ واپسی میں صغیر صاحب نے نثار کی عدم شرکت پر افسوس کا اظہار کیا، مگر وہ یہ نہ جان پائے کہ شرکت کے باوجود میں وہاں شریک نہیں تھی۔ بہرحال یہ رات بھی گزشتہ دونوں راتوں کی طرح بے چینی سے گزری۔ صبح ہوتے ہوئے دعاؤں میں شدت ہوجاتی کہ اللہ ہمیں میزبانی کے قابل رکھنا اور شرمسار نہ ہونے دینا۔

اگلی صبح جمعہ کی صبح تھی۔ جمعے کے دن نماز کے بعد شہر کھلنا شروع ہوتا ہے۔ سو، ہم نے سوچا صغیر صاحب کو سمندر کی سیر کرائی جائے جو ہمارے گھر سے بس دس منٹ کے فاصلے پر

ہے۔ میلوں پھیلا سمندری ویو کے نام سے مشہور ہے۔ صاف شفاف، خوب صورت اور چوڑی دوطرفہ شاہراہ ہے جو ساحل کے ایک طرف سے میلوں دور دوسرے سرے تک جاتی ہے۔ یہاں ڈرائیونگ کا لطف لینے بھی لوگ جاتے ہیں، اور جنھیں سمندر میں گھٹنوں تک بھیگنے کا جی چاہتا ہے وہ جوتے اتار کر دوڑ پڑتے ہیں۔ کچھ لوگ منڈیر پر بیٹھ کر دور تک پھیلے سمندر کو تکتے رہتے ہیں۔ کبھی مدوجزر اتنا بڑھتا ہے کہ منڈیر تک کو چھونے لگتا ہے۔ ہاں چودھویں کی رات جب لہریں اچھل اچھل کر چاند کو چھونا چاہتی ہیں وہ منظر دیکھے جانا اچھا لگتا ہے، مگر یہ صبح تھی۔ دسمبر کی خوش گوار صبح، ہلکی ہلکی سردی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، سوئیٹر اور شال کا استعمال بھلا لگ رہا تھا۔ ابھی ہم یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ سمندر میں اتریں یا منڈیر پر بیٹھیں صغیر صاحب نے اچانک فیصلہ سنا دیا کہ وہ اونٹ کی سواری کریں گے۔ اب وہ پروفیسر سے بچہ بن چکے تھے۔ ساربان نے پہلے اونٹ کو بٹھایا وہ بیٹھ گیا۔ پھر صغیر صاحب کو سوار کرایا وہ اُچک کر سوار ہو گئے۔ پھر اونٹ سے درخواست کی کہ وہ اٹھ کھڑا ہو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ صغیر صاحب از خود اونچے ہو گئے اور ہمیں گردن اٹھا کر قدرے پیچھے ہٹ کے انھیں دیکھنا پڑا۔ صغیر صاحب کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ پھر اونٹ سے کہا گیا، چل بھئی چل ہمیں دور تک ساحل کی سیر کرا۔ بے چارہ اونٹ حکم کا غلام انھیں لے کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ واپسی پر وہ انھیں ہنستا مسکراتا دوبارہ اُسی مقام پر لے آیا جہاں ہم اُن کے منتظر تھے۔ ہم نے کئی عدد تصاویر بنائیں۔ جی چاہا فوری سیما کو پوسٹ کردی جائے، مگر یہاں ابھی ایسی سہولت موبائل پر میسر نہیں تھی۔ فیصلہ کیا بعد میں سہی۔ عبارت بھی لکھنے کے لیے سوچ رکھی تھی۔ ''مدیر تہذیب الاخلاق اونٹ کی سواری کرتے ہوئے''۔ صغیر صاحب نے اونٹ سے اترتے ہوئے شکریہ ادا کیا جانے اونٹ کا یا اونٹ والے کا۔ پھر وہ سیپیوں اور سمندری سوغات کی اس چھوٹی سی دکان کی جانب راغب ہوئے جہاں بیٹھا دکان دار انھیں مسلسل تک رہا تھا۔ ہار، بُندے اور بریسلٹ خریدی۔ کہتے رہے ثنا کے لیے ہے، مگر ہمیں لگا سیما کے لیے بھی ہے، مگر یہ بات بتاتے ہوئے شاید وہ شرماجاتے۔

گاڑی میں دیر تک ڈرائیونگ کے مزے لیتے رہے۔ یہاں صغیر صاحب بہت خوش

تھے۔ اُن کی گفتگو میں کھنک تھی اور ہم دونوں کی طبیعت بھی آج کئی روز بعد بہتر ہوئی تھی۔ ہم بھی مزے لیتے رہے۔ دوپہر کا کھانا گھر پر کھایا۔ آج طبیعت نے ساتھ دیا تھا لہٰذا کچھ بہتر ڈشیں میز پر موجود تھیں۔

جمعے کی اذان کے ساتھ ہی نثار اور صغیر صاحب نماز کی ادائی کے لیے مسجد روانہ ہو گئے اور دوپہر کچھ دیر آرام کے بعد شام سندھ میلے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ میلہ ہر سال ان ہی دنوں کلفٹن کے وسیع پارک میں لگایا جاتا ہے۔ سندھ کی تہذیب و ثقافت تاریخ کی بہت پرانی ثقافت ہے۔ سندھی ٹوپی، سندھی اجرک، یہاں کی مشہور کڑھائی سلائی نہ صرف بہت مشہور ہے، بلکہ بہت خوب صورت ہے۔ ٹوپیوں اور کرتوں پر شیشے کا کام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مختلف قسم کے ظروف ان پر نقش و نگار کا عملی مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اندرونِ سندھ سے سندھی بولنے والے اور اہلِ کراچی اس میلے میں جوق در جوق شریک ہوتے ہیں۔ اس میلے میں تاریخ کے عروج و زوال سے تہذیب و تمدن کے آج تک کی جھلک موجود ہوتی ہے۔

گھر واپسی کے بعد آج دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ سمندر، اونٹ اور میلے نے صغیر صاحب کو خاصا ہشاش بشاش کر دیا تھا۔ ہم دونوں پر بھی اس کا مثبت اثر تھا۔

ہفتے کا دن انجمن ترقیِ اردو میں اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس دن گیارہ بجے ادبی محفل سجتی ہے۔ شہر، ملک اور بیرونِ ملک سے آئے ہوئے مہمان بطورِ خاص شریک ہوتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے۔ یادِ رفتگاں بھی رُلاتی ہے۔ ادب، صحافت اور تاریخ پر کھل کر اظہارِ خیال ہوتا ہے۔ لنچ کے نام پر ایک ایک ڈبا حصے میں آتا ہے جس میں لنچ نہیں لنچ نما خُورونوش کی اشیا موجود ہوتی ہیں۔ کچھ بھوکے فوراً ہی اسے چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ کچھ میں صبر ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہمراہ گھر لے جانا پسند کرتے ہیں۔ فاطمہ حسن کے کمرے میں دال چاول اچار چٹنی کا اہتمام ہوتا ہے جو انجمن کے ملازمین اور خصوصی مہمانوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ ہم اکثر ان میں خصوصی مہمان کے طور پر شریک ہوتے ہیں۔

۱۹ر دسمبر بھی ہفتے کے دن آیا تھا اور اس دن صغیر صاحب یہاں مدعو تھے، بلکہ یہاں ہی سے انھیں ہندوستان سے آنے کا دعوت نامہ ارسال کیا گیا تھا۔ فاطمہ حسن کے ساتھ

انجمن کے تمام افراد نے اُن کا استقبال کیا۔ صدارت زاہدہ حنا کی تھی۔ ٹی وی اور اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔ حاضرین نے ان کی گفتگو ذوق وشوق سے سنی بعدازاں سوالات بھی کیے۔ سوالات ویسے ہی دل چسپ تھے جیسے جواب دل چسپ تھے۔ صغیر صاحب نے علی گڑھ شہر کی مخصوص زندگی، یونی ورسٹی کی علمی اور درسی روداد، ''تہذیب الاخلاق'' کے مدیر کی حیثیت سے اپنی مصروفیات اور کردار پر بخوبی روشنی ڈالی۔ مکمل طور پر علی گڑھ کی فضا بن چکی تھی کہ اسی لحاظ سے جملہ بازی ہوتی رہی۔ سننے والوں میں بزرگ اور نوجوان دونوں کی تعداد تھی۔ بزرگوں میں سے بہت سے ہندوستان اور علی گڑھ سے واقف تھے۔ نوجوان دل چسپی یوں لے رہے تھے کہ اُن کے لیے یہ اُن کے ابا اماں کا زمانہ تھا جو گھروں میں اکثر دہرایا جاتا ہے۔

یہاں بھی اُن کی خدمت میں کتابوں کا تحفہ پیش کیا گیا۔ صغیر صاحب نے فرداً فرداً ہر ایک سے ملاقات کی۔ ہر ایک نے انفرادی طور پر اُن کا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ ہندوستان کی درس گاہ سے آئے ہوئے لوگوں سے مل کر وہ کتنا خوش ہوتے ہیں۔ وہاں کے ادیب شاعر اور دانش ور ہمارے لیے اتنے ہی محترم ہیں جتنے کے اپنے ملک کے۔ یقیناً یہ پذیرائی دل سے تھی اور دل تک پہنچی۔ صغیر صاحب نے بار بار اس بات کا اظہار کیا کہ انھوں نے یہاں آکر بہت اچھا محسوس کیا ہے اور افسوس کا اظہار بھی کیا کہ انھیں اور پہلے بھی آنا چاہیے تھا۔ ہم نے کہا چلیے ماضی کی غلطی معاف کرتے ہیں، آئندہ یہ غلطی سرزد نہ ہونے پائے۔ آتے جاتے رہیے گا۔ انھوں نے فرماں برداری سے اقرار میں گردن ہلادی، حالاں کہ ہم اُن کی اس تشویش سے واقف تھے کہ آنا جانا مشکل ہے، دونوں ملکوں کے نیتا کی طبیعت اور موڈ پر منحصر ہے۔ سرحدوں پر ہل جُل ہوجاتی ہے۔ اِدھر اُدھر کے آنے جانے والے سہم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کاش نیتاؤں کی سمجھ میں آجائے۔ مل جل کر رہنے میں برکت بھی ہے اور معاشی، سماجی، تہذیبی، علمی وادبی ترقی بھی اسی صورت ممکن ہے۔

دوپہر کے کھانے کے لیے فاطمہ حسن نے کھچڑے کا اہتمام اپنے گھر پر کیا ہوا تھا۔ چوں کہ نثار ہمارے ساتھ نہیں آپائے تھے اور باری کے بخار میں دوبارہ مبتلا ہو چکے تھے لہٰذا ہم نے اُنھیں گھر پر اکیلا چھوڑا ہوا تھا۔ ہم نے صغیر افراہیم صاحب کو صبا اکرام کے حوالے کیا

جہاں انھوں نے شام کی دعوت کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ خاصی تعداد میں ادیب شاعر دوست مدعو تھے۔ میرے لیے گھر لوٹنا ضروری تھا کہ نثارا کیلے تھے۔ دل دل میں مجھے ندامت بھی ہورہی تھی۔ سو، پکی رسید لے کر میں گھر لوٹ آئی اور مطمئن تھی کہ صغیر صاحب ذمے داروں کے بیچ ہیں۔ صحیح سالم واپس مل جائیں گے۔ آدھی رات کی گھنٹی نے اطلاع دی کہ وہ آگئے ہیں اور ایک ساتھ درجنوں ادیبوں شاعروں سے ملاقات ہوگئی ہے۔ اندھیرے میں بھی اُن کے چہرے کی دمک کی جھلک نظر آگئی۔ میں مطمئن ہوگئی، مگر میرا یہ فیصلہ درست تھا کہ میں واپس آجاؤں۔ آج کی رات نثار نے بڑی بے چینی میں گزاری۔ اکیلے دن گزارنا بھی اُن پر بھاری تھا۔

۳۰ر دسمبر کی صبح اتوار تھا۔ کراچی کا وہ دن جس دن آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی کا سالانہ انتخاب ہونا تھا۔ کراچی شہر میں رہنے والے تمام اہلِ ذوق، شاعر، ادیب، معلم، دانش ور، فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے افراد سارا دن یہاں رہتے ہیں کہ یہ سالانہ ملاقات اور سالانہ میلہ ہمیں پھر سال بھر یاد رہتا ہے، لہوگرما دیتا ہے۔ آنے والے سال کا انتظار دے کر رخصت ہوجاتا ہے۔ اس انتخاب کی گہما گہمی دکھانی ضروری تھی۔ نثار نے تھوڑی دیر کے لیے ہمت کی پھر گھر آگئے ہم دونوں دن بھر یہاں کے ہجوم میں پھنسے مطلب کے لوگوں سے ملتے رہے۔ یہاں صغیر صاحب کی ملاقات بہت سے ایسے لوگوں سے ہوئی جن سے انفرادی طور پر ملنا ممکن نہیں تھا اور ملنا بھی ضروری تھا۔ میں تعارف کراتی جارہی تھی اور صغیر صاحب ہاتھ ملا ملا کر اور ہلا ہلا کر محظوظ ہورہے تھے۔ کئی ایک علیگ ساتھی بھی ملے جس میں ایک طارق بدایونی بھی تھے۔

راشد الخیری کی پوتی صفورا خیری سے بھی ملے جو آج بھی رسالہ ''عصمت'' نکال رہی ہیں۔ شہر کے کمشنر کو دیکھا، ان تمام اراکین سے بھی ملے جو انتخاب میں حصہ لے رہے تھے۔

زیڈ اے بخاری کے نام سے موسوم آڈیٹوریم میں منعقد سالانہ جنرل باڈی کے اجلاس میں بھی شرکت کی اور دیکھا کہ اراکین کس زور شور سے حمایت اور مخالفت پر آمادہ ہیں۔ یہ رنگ برنگا دن سال میں ایک بار آتا ہے اور سال بھر سرشار رکھتا ہے۔ یقیناً یہ دن صغیر افراہیم کے لیے بھی یادگار بنا ہوگا۔ اگر ایک دن کی اور گنجائش ہوتی تب ہم اُنھیں وہ دن بھی دکھاتے

جس دن جیت کا جشن منایا جاتا ہے۔ وہ دن بھی یادرکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

مگر اگلی صبح پیر کے دن کی تھی اور پیر کے دن ہماری قومی ایئر لائن ہندوستان سے آنے والے مسافروں کو دہلی سے لے کر کراچی آتی ہے اور پاکستان سے دہلی لے کر بھی جاتی ہے۔ اگر یہ پیر نکل جائے تب اگلے پیر تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ صغیر صاحب کی چھٹی اور ویزا بس اسی ایک پیر تک محدود تھا۔ سو، یہ پاکستان میں اُن کا آخری دن تھا۔

سات دن تک کے لیے پاکستان کا یہ سفر ان کا پہلا سفر تھا جس نے اُن سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ آخری ہرگز نہیں ہے۔

مجھے اُس دن اپنا سفر یاد آرہا تھا جو ہندوستان کے لیے پہلا سفر تھا۔ ۱۹رمئی پیر کے دن، سال تھا ۲۰۱۴ء، دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لب ریز تھیں۔ ماضی صاف سلیٹ کے مانند تھا، مگر غیر محسوس طور پر اُس پہ لکھی تحریریں میں پڑھ رہی تھی جو میرے بچپن سے متعلق تھیں۔

کوئی زندہ شخص میرا منتظر نہیں تھا۔ ایک قبر بس میرے انتظار میں برسوں سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ جس کے پاس کوئی لفظ نہیں تھا کوئی آواز نہیں تھی، لیکن لفظ اور آواز دونوں میں سن رہی تھی، میری بیٹی آرہی ہے، بیٹی آ بھی گئی تھی۔ وہ سفر تمام ہوا، لیکن وہ سفر مجھے نئے دوست نئے حوالے دے گیا۔ صغیر افراہیم اُن میں سے ایک ہیں۔ زندہ اور مضبوط حوالہ جو اگرچہ میری ماضی میں کہیں بھی شریک نہیں تھے، لیکن میرے حال میں ہر وقت موجود ہیں، اور میرے مستقبل کے دنوں میں بھی ہمیشہ موجود رہیں گے۔

رشتے کبھی بھی بن جاتے ہیں بس انھیں ٹوٹنے نہیں دینا چاہیے۔ ''انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو'' دل کشادہ، بانہیں وا، آنکھیں انتظار میں ہوں تو رشتے نبھ جاتے ہیں۔

صغیر صاحب کو ایئر پورٹ چھوڑنے میں اور نثار دونوں گئے، مگر ہم تینوں کم کم باتیں کررہے تھے۔ تینوں اداس تھے۔ مل کر بھی رخصت ہو کر بھی۔ ہم لوگ ایک خطے کے بٹوارے کے لوگ تھے۔ دو سرحدوں کے لوگ تھے۔ دل میں محبت کے باوجود بھی بندشوں میں جکڑے ہوئے۔ اب نہ جانے کب ملاقات ہو، اگرچہ مواصلاتی نظام بڑا ترقی کرگیا ہے،

مگر باہم مل بیٹھنے کا مزہ کچھ اور ہوتا ہے، اور فون کال اور فیس بک پر ملنا اور۔

ہم تینوں کی آنکھیں نم تھیں، دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ میں نے دھیرے سے ہوا میں لہرادیا۔ جس کے معنی خدا حافظ تھا۔ وہ آگے ہم پیچھے مڑے۔

کاش سرحدیں نہ ہوتیں، کاش ملک تقسیم کے المیے سے نہ گزرا ہوتا، بٹوارے کا وہ سانحہ نہ ہوا ہوتا اور اگر ہو بھی گیا تو کاش ہم امن، آشتی، انسانیت، شرافت، محبت، مروت اور تہذیب و ثقافت کو تھامے اپنے اپنے گھر میں رہ رہے ہوتے۔ جب چاہتے آتے جاتے ملتے ملاتے گھر لوٹ جاتے۔

ہم گھر لوٹ رہے تھے اب ہمیں شاہراہِ فیصل خالی اور اُداس ملی۔

○

ایک خط سر سیّد احمد خان کے نام☆

(دوسو سالہ جشنِ پیدائش پر)

محترم سیّد صاحب!

آپ کی خدمت میں آداب عرض ہے۔ کیا میں آپ کو سیّد صاحب کہہ کر مخاطب کرسکتی ہوں؟ یہ سوال اگر میں کروں بھی تو آپ بھلا کیا جواب دیں گے، کیوں کہ آپ تو دو سو سال پہلے کے انسان ہیں اور میں آپ سے دوسو سال بعد کی ایک فرد۔ میری ملاقات آپ سے کبھی نہیں ہوئی۔ ہو بھی کیسے سکتی تھی زمان و مکان آڑے آرہے تھے، لیکن سیّد صاحب بچپن ہی میں جب میں نے تعلیم کی ابتدا کی تھی اور پڑھنا سیکھا تھا تب آپ کی تحریر کردہ کسی کہانی سے ہی آغاز کیا تھا۔ غالباً بحث وتکرار کے موضوع پر ہی کوئی کہانی تھی۔ اب زیادہ یاد نہیں، لیکن ہماری ٹیچر نے آپ کی ایک تصویر دکھائی تھی۔ وہی تصویر دیکھتے دیکھتے میں بڑی ہوگئی۔ پتا نہیں آپ نے دوسری کوئی تصویر کیوں نہیں کھنچوائی۔ لال ٹوپی، سفید ڈاڑھی جس کا ایک بال بھی نہ لمبا تھا نہ چھوٹا۔ کس خوب صورتی سے بنائی گئی تھی یہ آپ کی ڈاڑھی۔ ٹوپی کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ یہ تُرکی ٹوپی کہلاتی ہے، اور یہ بس لال رنگ ہی کی ہوتی ہے۔ ہاں میں نے تو اب بھی یہ ٹوپی دیکھی ہے۔ لال رنگ ہی کی ہے۔ بس اس تصویر کو دیکھتے دیکھتے جب میں بڑی ہوئی تب آپ کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ کچھ سمجھ میں آئیں کچھ نہیں

☆۔ دوسو سالہ جشنِ پیدائش پر ''تہذیب الاخلاق'' علی گڑھ میں چھپا۔

بھی۔ جو سمجھ میں نہیں آئیں ان کے مضامین بہت دقیق تھے، کچھ فارسی کا رنگ بھی نمایاں تھا۔اس سے زیادہ میری کم عقلی کا بھی اس میں دخل تھا۔

سیّد صاحب میں چاہتی ہوں کہ اپنا تعارف آپ سے کرادوں۔آپ جب غازی پور گئے تھے ۱۸۶۲ء میں، تب میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے تقریباً پچاسی برس بعد میں اسی غازی پور کی ''حسن منزل'' اور ''صمد منزل'' کی وارث بنی۔ آپ کے اوّلین دوست قاری محمد علی اور مولوی عبدالصمد میرے پردادا تھے جن کے گھر آپ کا آنا جانا تھا اور جن کے گھر بیٹھ کر آپ نے سب سے پہلے سائنٹفک سوسائٹی کا نقشہ پیش کیا تھا۔ یاد آیا نا آپ کو جہاں بیٹھ کر چائے پیتے، دھیمے دھیمے مسکراتے، شعر پڑھتے اور شعر سنتے۔ شام ''صمد منزل'' میں گزرتی۔ پھر آپ نے وہاں دو سال قیام کیا۔ کئی کتابیں تحریر کیں۔ پریس قائم کیا۔ دو عدد مقدمات کی پیروی بھی کی جسے آج تک تاریخ کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ ہاں کتابوں کا تو ذکر ہے، مگر اب پریس کے کھنڈرات سے وہ اخبار بھی برآمد کر لیے گئے ہیں جو آپ کے علی گڑھ سے رخصت پر چھپے تھے اور آپ کو الوداعی پارٹی بھی دی گئی تھی۔ ان دو مقدموں کی کاپیاں بھی برآمد ہوگئی ہیں جن کی پیروی آپ نے کی تھی، اور ان اخباروں کی کاپیاں بھی ڈھونڈ نکالی گئی ہیں جو علی گڑھ سے آپ کے انتقال کی خبر آنے پر چھپے تھے جس میں قاری محمد علی نے رو رو کر بیان دیا تھا۔ آہ! میرا یار بچھڑ گیا۔ وہ شامیں اُداس ہوگئیں۔ وہ محفلیں سونی ہوگئیں اور پھر ان کا فارسی کلام بھی تحریر ہے۔ مولوی عبدالصمد کہنے لگے، میرا یار جو مجھے علی گڑھ بلاتا تھا، کہتا تھا آجاؤ۔ تم میرے ذاتی مہمان ہوگے۔ تمھیں میں شبلی کے کمرے میں ٹھہراؤں گا۔ غالبؔ سے ملنے دہلی آتے ہو۔ علی گڑھ کتنا دور ہے۔ آہ! اب کون بلائے گا۔

سیّد صاحب یہ عبدالصمد صاحب وہی ہیں جو ڈاکٹر مختار انصاری کے ساتھ ترکی میں طبی وفد میں شریک تھے جن کی تصویر اب آپ کی درس گاہ کی ایک دیوار کی زینت ہے اور جس کا نام آپ نے اپنی درس گاہ میں یوں لکھا ہوا ہے ''رئیس پٹیہا مولوی عبدالصمد'' جنھوں نے پہلے پہل مدرسۃ العلوم کے لیے چندہ دیا تھا اور شاہ فرید عالم کے ہاتھ کچھ پیسوں کی تھیلی بھی آپ کی خدمت میں اہلِ غازی پور سے جمع کر کے بھیجی تھی۔ آپ نے ان کے نام درجن

بھر خطوط بھی لکھے تھے جس کا ذکر تو تاریخ میں ملتا ہے، لیکن خطوط غالباً لندن کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ میں نے کتابوں میں یہی کچھ پڑھا ہے۔ یہ باتیں سنتے سنتے میں بڑی ہوگئی اور اب سے صرف دو برس قبل وہ تمام جگہیں دیکھنے گئی۔ میں نے آپ کی رہائش گاہ لال کوٹھی دیکھی جس کے ساتھ ایک خوب صورت مسجد بھی ہے۔ ''صمد منزل'' بھی گئی اور ''حسن منزل'' بھی جو شکستہ ضرور ہیں، مگر آپ کی آمد کے باعث تاریخ بنی غرور سے کھڑی ہیں۔

سیّد صاحب میں غازی پور اور علی گڑھ سے بہت دور سندھ کے ایک شہر کراچی میں رہتی ہوں۔ شاید آپ کبھی یہاں آئے ہوں۔ لاہور تو بہر حال آپ لیکچر کے سلسلے میں آئے تھے۔ یہاں نہ بھی آئے ہوں تو یہ شہر سراپا آپ کے نام پر فدا ہے۔ آپ جانئے تقسیم کے بعد آپ کی عظیم درس گاہ کے فارغ التحصیل عظیم شخصیات ہجرت کر کے یہاں آ گئی تھیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں انھیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، مگر میں کان پور کے ایک شاعر سرشار صدیقی کا ایک شعر سنانا چاہتی ہوں۔ شاید آپ پھر یہ نہ کہہ سکیں جو کچھ لوگ کہتے رہے ہیں، شعر یوں ہے:

ترکِ وطن تو سنت بھی ہے اور ہماری قسمت بھی
ہجرت پر مجبور نہیں تھے ہجرت پر مامور تھے ہم

یہاں آ کر آپ کے تعلیم یافتہ افراد نے آپ کے نام اور کام کو ایسا چمکایا کہ آنے والی نسلوں نے یوں محسوس کیا گویا کہ آپ سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد کے ہی رہنے والے تھے اور اسی جگہ بیٹھ کر کتابیں لکھتے تھے۔ مضامین تحریر کرتے تھے اور درس گاہوں سے قابل افراد نکالتے تھے۔ ہم نے ہر جگہ آپ کو اپنا رہنما بتایا۔ ہم نے بتایا کہ آپ نے برصغیر کے تمام مسلمانوں کی آنکھیں کھولیں۔ ہمیں اردو ہی نہیں فارسی، عربی، انگریزی اور ہر زبان پڑھنے پر آمادہ کیا۔ آپ نے ترجمے کی اہمیت بتائی کہ اس سے علم میں کس طرح وسعت پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے بتایا کہ آپ نے کہا تھا، فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ، بائیں میں نیچرل سائنس اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر ہے۔

میں صرف اپنے شہر کی بابت آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کے نام سے اس شہر میں اسکول بھی قائم ہے۔ کالج بھی ہے، یونی ورسٹی بھی جہاں فنون، سائنس، انجینئرنگ اور کمپیوٹر

تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان درس گاہوں میں آپ کے نام کا بورڈ آویزاں ہے۔ آپ کے نام کی لمبی چوڑی سڑک بھی ہے جس پر سے روزانہ سیکڑوں لوگ گزرتے ہیں۔ پتا سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں، سرسیّد روڈ سے دائیں جانب یا بائیں جانب مڑ جائیں۔ آپ کے نام کا اسپتال بھی قائم ہے۔ آپ کے نام کے ٹیوشن سینٹر بھی بنے ہوئے ہیں۔

جس کسی کو اپنے ادارے کی وقعت درکار ہوتی ہے وہ آپ کا نام اسے دے دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک حجام نے بھی اپنی دکان آپ کے نام سے چمکائی ہے۔ پورے ملک میں درجنوں ایسے ادارے ہیں جہاں تعلیم دی جارہی ہے اور جو آپ کے نام سے منسوب ہے۔

ہم برِصغیر کا وہ حصہ تو وہیں چھوڑ آئے ہیں کہ گلیاں، مکان اور سڑکیں حرکت نہیں کرتیں، لیکن ان کے قصے، کارنامے اور کام دور دور تک پھیل جاتے ہیں، اسے ساتھ لے آئے ہیں۔ سیّد صاحب آپ کو بتاؤں کہ آپ کی ہر کتاب کے کتنے ہی ایڈیشن یہاں چھپ چکے ہیں۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بھی یہاں قائم ہوئی۔ انجمن ترقیِ اردو بھی، اور انھوں نے آپ کی تعلیمات کو کس قدر فروغ دیا اس کی تفصیل ایک خط میں تو ممکن نہیں۔

سیّد صاحب ہم یہاں آپ کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کو بھی نہیں بھولے۔ یہاں سے ہم ''تہذیب'' نام کا رسالہ نکالتے ہیں اور لاہور والوں نے ''اخلاق'' نکال کر اسے آپ کا ہی نام دیا ہوا ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ان دونوں رسالوں پر آپ کا نام لوح پر لکھا ہوتا ہے۔ یہ بھی یقین کرلیں کہ ہر ماہ کے ہر شمارے میں آپ پر کوئی نہ کوئی مضمون ضرور شائع ہوتا ہے۔

سیّد صاحب ہمارے ملک کے بچے بچے کو معلوم ہے کہ لال ترکی ٹوپی اور سفید خوب صورت ڈاڑھی والا حسین انسان ہمارا رہنما ہمارا محسن ہے۔

ہماری ہر درسی کتب میں آپ کا تذکرہ موجود ہے۔ اردو زبان ہماری قومی زبان بھی ہے۔ سرکاری اور درسی زبان بھی۔ نصاب خواہ وہ پرائمری جماعت کا ہو، سیکنڈری ہو یا کالج، یونی ورسٹی کا آپ کو پڑھایا جاتا ہے۔ اردو زبان میں ایم اے کرنے والے آپ کے افکار پر مشتمل سونمبر کا پرچہ دیتے ہیں جس کے بغیر ان کی سند مکمل نہیں ہوتی۔ ہر سال درجنوں پی ایچ ڈی اسکالرز یہاں سے نکلتے ہیں۔ ہم ہر سال ۱۷ اکتوبر شان سے مناتے ہیں۔ ہمارے سارے رسالوں میں آپ کا ذکر

ہوتا ہے۔ ایسے ایسے تحقیقی مضامین لکھے گئے ہیں کہ اگر آج آپ آ کر دیکھیں تو یقیناً ہمیں ضرور داد دیں گے۔ ہمارے پاس درس گاہوں میں سرسیّد گولڈ میڈل بھی ہے اور سرسیّد ایوارڈ بھی۔ ہر سال ہم مضمون نگاری کے مقابلے بھی آپ کے نام اور کام پر کراتے ہیں۔

سیّد صاحب آپ کی سال گرہ ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک دھوم سے مناتے آئے ہیں جس میں ادبی تحریریں، تقریریں، مذاکرے، مکالمے، مشاعرے سب شامل ہیں۔

مگر سیّد صاحب آیئے ہم آپ کو آپ کی دو سو سویں سال گرہ کی تفصیل سے آگاہ کریں۔ ملک بھر میں جشن منایا گیا۔ ملک بھر میں تقریبات ہوئیں۔ میں جس شہر میں رہتی ہوں صرف اس شہر کی تین انجمنوں کی تقریبات آپ کے علم میں لاتی ہوں۔

ابھی ابھی ہم نے آپ کو بتایا کہ ہم نے اپنے شہر میں آپ کے نام سے ایک انجینئرنگ اور ایک آئی ٹی یونی ورسٹی قائم کی ہوئی ہے اور اب یہ بھی بتادوں کہ ہم نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن بھی قائم کی ہوئی ہے، بلکہ آپ کی درس گاہ قابل فرزندوں نے ہی اپنی اس ایسوسی ایشن کے ذریعے ایک عالی شان انجینئرنگ یونی ورسٹی قائم کی ہے جس میں چھ ہزار طالب علم پڑھتے ہیں۔ آئی ٹی میں اٹھارہ سو طالب علم ہیں۔ ایسوسی ایشن سے منسلک علیگ اب سب تقریباً نوے برس کی عمر سے تجاوز کر چکے ہیں۔ چناں چہ ایسوسی ایشن کو قائم رکھنے کے لیے اب ان جواں سال بچوں نے اس کا بوجھ اٹھالیا ہے جنھیں ''علیگ زادے'' کہا جاتا ہے، اور آپ کی دو سو سالہ سال گرہ کو جس طرح انھوں نے منایا ہے اس کی روداد سن کر آپ یقیناً خوش ہو جائیں گے۔ آیئے ہم آپ کو سنائیں۔

جشنِ سرسیّد کا آغاز تو اکتوبر کی یکم تاریخ سے ہی ہو گیا تھا جس کی نگرانی اموبا کے صدر جناب جاوید انوار اور سیکریٹری جناب محمد ارشد خان کر رہے تھے۔ آغاز سرسیّد احمد خان یادگاری ڈاک ٹکٹ سے ہوا۔ حکومتِ پاکستان سے ہم نے اس کی گزارش کی تھی، ''سرسیّد کا تصورِ ثقافت'' ایک کتاب پروفیسر ابوسفیان اصلاحی سے لکھوائی گئی اور اس کی رسم اجرا ۱۷ر اکتوبر کو ہوئی جس میں وہ علی گڑھ سے یہاں تشریف لائے تھے۔

سرسیّد یونی ورسٹی سے گزرنے والا فلائی اوور کو سرسیّد فلائی اوور کا نام دیا گیا جس کے

لیے میئر کراچی نے افتتاحی تقریب منعقد کی۔ اس سے قبل ہم نے سرسیّد یونی ورسٹی کی تاریخ بھی مرتب کی جس کی تعمیر میں بڑے بڑے علیگ محسنین نے حصہ لیا۔ اس کی ادارت اور معاونت میں ارشد کریم اور انوار عزمی شریک ہیں۔ ایک مخلص علیگ ممتاز اکبر کاظمی نے سرسیّد اور ان کے رفقا پر مشتمل انتہائی خوش نما تصویری مجلّہ اپنے پیسوں سے شائع کرایا۔ حاضرین میں تقسیم کیا۔ ممتاز اکبر کاظمی نے ان رفقا کی تصاویر انتہائی خوب صورت فریم میں جڑ کر ایک پکچر گیلری بھی بنائی جس کا باقاعدہ افتتاح بھی ہوا۔ طالب علموں نے سرسیّد کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے مختلف علمی و ادبی پروگرام ترتیب دیے۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے ۱۷ اکتوبر کو جو پروگرام ترتیب دیا گیا وہ مرکزی پروگرام تھا، جس میں نہ صرف ملکی، بلکہ بین الاقوامی اسکالرز کو مدعو کیا گیا تھا۔ علی گڑھ سے پروفیسر ابوسفیان اصلاحی صاحب آئے، سوئیڈن کی یونی ورسٹی سے شعبۂ اردو کے سرسیّد احمد خان چیئر سے وابستہ محقق استاد ڈاکٹر ہیز و ونر ویسلے نے شرکت کی۔ جامعہ ازہر سے آپ پر کی جانے والی تحقیقاتی شعبے سے وابستہ پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم تھے۔ ان دونوں نے اپنی اپنی زبان کے لہجے، مگر اردو میں تقریر کی اور بتایا کہ نئی نسل ان کے یہاں آپ کے کارناموں سے آگاہ ہو رہی ہے اور آپ کے افکار سے استفادہ بھی کر رہی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ آپ کی قائم کردہ درس گاہ سے تعلیم اور تربیت حاصل کرنے والوں کی تعداد ساری دنیا میں پھیل چکی ہے اور یہ عجب بات ہے کہ جہاں جس ملک میں جس شہر میں چار علیگ جمع ہو جاتے ہیں اولڈ بوائز قائم کر لیتے ہیں، وہی اولڈ بوائز جس کے لیے آپ نے اپنے حیدرآباد دکن کے دورے پر اولڈ بوائز کو دیکھ کر کہا تھا ''یہی پھول میری زندگی کی بہاریں ہیں، یہی میرے گل و لالہ ہیں اور یہی میری زندگی کی امیدیں ہیں۔''

ہمارے شہر میں بھی ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہی سے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم ہے۔ درس گاہ کے علیگ بہت زیادہ تعداد میں ہجرت کر کے یہاں آئے اور انھوں نے اپنی درس گاہ کی یاد کی خاطر انجمن بنالی۔ آپ کی سال گرہ کے موقعے پر ہم نے ان علیگ محسنوں کی یاد بھی منانے کے لیے بڑے پیمانے پر وقفے وقفے سے دو بڑے پروگرام ترتیب دیے جن میں

ان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی اس تعلیمی اور ہم نصابی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا جب وہ وہاں طالب علم تھے۔

اس کے علاوہ آپ کی درس گاہ کے تین ایسے بڑے ادیب جو اب دنیائے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، ہم نے انھیں ایوارڈ سے بھی نوازا۔ مختار مسعود، ذاکر علی خاں اور مشتاق احمد یوسفی اگرچہ اب یہ اس دنیا میں نہیں اور آپ سے ملاقات کرنے آپ تک پہنچ چکے ہیں۔

تعلیمی میدان میں خدمات ادا کرنے پر جناب شاہ جہاں سیّد کریم، بریگیڈیر اقبال محمد شفیع علیگ اور غلام معین الدین صابری کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ سرسیّد یونی ورسٹی کے سابق چانسلر جناب ظلِ احمد نظامی مرحوم کو طویل ترین خدمات انجام دینے پر اور جناب ذاکر علی خان مرحوم کو اموبا کی جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے طویل مدت تک خدمات انجام دینے پر گولڈ میڈل سے نوازا۔ ہم نے کئی ایک افراد کو بھی ایوارڈ دیے جنھوں نے زندگی کے کسی بھی شعبے میں نمایاں خدمت انجام دی۔ ایک بڑا اور سب سے بڑا ایوارڈ عبدالقدیر خان کی خدمت میں پیش کیا کہ آپ سائنس کی تعلیم اور اس شعبے میں کام کرنے والوں کی قدر کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ سو، اپنے ملک کو ایٹمی ملک کا درجہ دلانے میں قدیر خان صاحب نے جو کردار ادا کیا ہے، لہٰذا انھیں آپ کے نام سے منسوب ایوارڈ دینا ہم پر فرض تھا۔

آپ کے علم میں شاید نہ ہو تو بتاتی چلوں کہ میں پچھلے دو سال سے تہذیب رسالے کی ایڈیٹر ہوں جس کی لوح پر ہم لکھتے ہیں، ''علم و آگہی کا نشان، فکرِ سرسیّد کا ترجمان'' اکتوبر کا شمارہ خاص شمارے کے طور پر ترتیب دیا ہے۔

آج کل ہم ایک عمارت کی تعمیر میں مشغول ہیں جس کا نام ہم نے ''سرسیّد ٹاور'' رکھا ہے۔ اس کی دو منزلیں تعمیر ہو چکی ہیں۔ نیچے کے حصے میں ''تہذیب'' رسالے کا دفتر ہے جس میں ایک تہذیب ریسرچ لائبریری بھی قائم ہے۔ اس کے علاوہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا بھی دفتر ہے جہاں عملے کے علاوہ صدر اور سیکریٹری کے دفاتر کے علاوہ ایک وسیع کانفرنس ہال بھی ہے، جہاں آپ کی قدِ آدم تصویر دیوار پر آویزاں ہے۔ ہم نے لیاقت علی خان، قائداعظم اور علامہ اقبال کی بھی تصاویر لگا رکھی ہیں۔ اس کانفرنس ہال میں ہمارے سینئر علیگ ہر ہفتے سنیچر

کے دن بیٹھک کرتے ہیں۔ آپ کو یاد کرتے ہیں۔ اپنی طالب علمانہ زندگی یاد کرتے ہیں اور عمر رسیدگی بھول کر بس طالب علم بن جاتے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے ہم نے ہر ماہ کے پہلے سنیچر کو ایک شعری نشست کا اہتمام بھی کر رکھا ہے۔ ہر نشست کے صدر آپ ہوتے ہیں اور تین شعرا اپنا کلام سناتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا، اچھی قومیں وہ ہوتی ہیں جو اپنے محسنین کو یاد رکھتی ہیں اور ان کے کارناموں سے خود بھی بہت کچھ سیکھتی ہیں۔ ہم ایسا کچھ کر کے آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم نے صرف آپ کی تصویر دیکھی ہے، تحریریں پڑھی ہیں اور آپ کی آخری آرام گاہ بھی دیکھی ہے۔ جہاں بظاہر آنکھیں بند کر کے آپ سو گئے ہیں، مگر وہاں کھڑے ہو کر جب میں فاتحہ پڑھ رہی تھی تب جانے کیوں محسوس ہوا کہ آپ کی آنکھیں اب بھی کھلی ہیں اور آپ اپنے بنائے ہوئے چمن کو دیکھ رہے ہیں، بلکہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے سارے ''اولڈ بوائز'' کو دیکھ رہے ہیں۔

مجھے اس لمحے افسوس ہوا کہ میں بہت دیر میں کیوں پیدا ہوئی اور آپ کی درس گاہ سے کیوں نہیں مستفید ہوئی، لیکن پھر تقویت یوں ہوئی کہ ایک اولڈ بوائے کی بیٹی ہوں اور میرے آبا و اجداد نے آپ کی درس گاہ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

آج کل ''تہذیب الاخلاق'' کی ادارت جناب صغیر افراہیم کے ذمے ہے۔ جانے آپ نے کھلی آنکھوں سے انھیں دیکھا ہے یا نہیں، مگر میں نے انھیں دیکھا ہے۔ بڑے پھرتیلے ہیں۔ باتوں باتوں میں مخاطب کو موہ لیتے ہیں۔ اپنی مرضی کا کام کرا لیتے ہیں۔ موضوع دیتے ہیں۔ مضمون لکھوا لیتے ہیں۔ خود بھی بلا کا لکھتے ہیں۔ لگتا ہے انگلیوں میں ہر وقت قلم ہی دبا رہتا ہے۔ پچھلے سالوں میں ایک بار ہمارے ملک بھی آئے تھے۔ ہم نے جو کچھ آپ کو خط میں لکھا ہے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر گئے ہیں خوش بھی ہوئے تھے۔ ہم آپ کے شہر سے آئے ہوئے ہر شخص کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں کہ ہر آنے والا وہاں کی خوش بو ساتھ لے کر آتا ہے۔ آپ کے چمن کے ایک چھتنار پیڑ ظل الرحمٰن صاحب بھی میرے کہے کی تصدیق کریں گے۔

صغیر افراہیم صاحب آپ کی دوسو ایک سالہ سال گرہ پر بھی ''تہذیب الاخلاق'' کا نمبر نکالنے والے ہیں۔ ہمیں حکم دیا ہے کہ اپنے شہر کی سال گرہ والی تمام روداد لکھ کر بھیجوں۔ بتایئے ایک خط میں اتنی بہت ساری روداد کیسے سما سکتی ہے۔

سیّد صاحب! اپنے اس اوّلین خط میں تو میں نے آپ سے اپنا مختصر تعارف کرایا ہے، اور آپ کی دوسو سالہ ولادت کی صرف ان تقریبات کا ذکر کیا ہے جو سرسیّد یونی ورسٹی آف انجینئر نگ اینڈ ٹیکنالوجی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں منعقد ہوئیں۔ اس کے علاوہ ہمارے شہر کراچی میں دیگر انجمنوں نے بھی جو مذاکرے اور سیمینار کیے ہیں ان کی تفصیلات مجھے آپ تک پہنچانی ہیں۔ خط طویل ہوگیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ صغیر افراہیم صاحب گھبرا کراسے آپ تک پہنچنے سے نہ روک دیں۔ اس لیے فی الحال اس کی دوسری قسط دوسرے خط میں لکھوں گی۔ ابھی مختصراً یہ بتادوں کہ آپ کی شخصیت پر کم از کم پندرہ بیٹھک ہوئی ہیں اور اُن میں مختلف موضوعات بڑی محنت سے چنے گئے۔ ۱۰۰ر کے قریب مقالے پڑھے گئے ہیں۔ یقیناً آپ کی جانب سے ہمیں شاباش ملے گی۔

آپ کو یہ بتاتی چلوں کہ آپ کے جانے کے بعد دوسو سال میں خط لکھنے کا رواج کم، بلکہ ختم ہو چکا ہے۔ آج کے بچے ڈاکیا، خط اور لیٹر بکس کے نام سے نا آشنا ہیں۔ اب ''فیس بک وال'' ہے جہاں پر دل کی تمام وارداتیں لکھی جاتی ہیں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ آپ کی تصاویر، آپ کی تحریریں، آپ کی تقریریں، آپ کی تمام کتابیں سب کی سب ایک چھوٹی سی مشین جسے کمپیوٹر اور موبائل کہتے ہیں اس میں سما گئی ہیں۔ ایک دن کے لیے لوٹ آیئے، ہم آپ کو یہ مشین دکھا کر حیران کردیں گے۔

اگلے خط تک کی اجازت

آپ کی مداح

نوشابہ صدیقی بنتِ حسن عبداللہ (علیگ)

ساکن منٹو E علی گڑھ

○

سر سیّد احمد خان کے نام دوسرا خط☆

(دوسو سالہ جشنِ پیدائش کی روشنی میں)

محترم سیّد صاحب!

میں نے پہلا خط اکتوبر کے مہینے میں آپ کے نام لکھا تھا۔ صغیر افراہیم صاحب نے آپ سے بغیر پوچھے اسے ''تہذیب الاخلاق'' کے شمارے میں چھاپ دیا ہے۔ یہ بات پتا نہیں آپ کو اچھی لگی یا نہیں، مگر میرے بہت کام آئی کہ دنیا کے بہت سارے شہروں سے مجھے اطلاع موصول ہوئی کہ وہ خط وہاں کے لوگوں نے بھی پڑھ لیا ہے۔ سیّد صاحب! اچھی بات یہ ہے کہ انھوں نے ایک اچھے اور معلوماتی خط کے باعث اسے پسند بھی خوب کیا ہے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ انھیں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کراچی کی جانب سے آپ کی دوسوویں سال گرہ پر ہونے والی تقاریب سے آگاہی ہوئی۔ انھیں اس بات کا بھی علم ہوا کہ یہ شہر کراچی کی ہی ایسی انجمن ہے جس نے ایک نہیں دو ادارے آپ کے نام پر بنائے ہیں۔ ایک انجینئرنگ یونی ورسٹی اور دوسرا ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ۔ دونوں ادارے بڑی دل جمعی سے کام کررہے ہیں اور سیکڑوں طالب علموں کو درس دے رہے ہیں۔ یہ اقامتی ادارے تو نہیں ہیں جیسے کہ آپ نے بنائے تھے اور ساتھ ہی تربیت کا اعلیٰ انتظام کررکھا تھا،

☆۔ ''تہذیب الاخلاق'' علی گڑھ میں شائع ہوا۔

لیکن ہاں ہم نے نصابی سرگرمیوں کے ذریعے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا فریضہ بیشک سنبھال رکھا ہے۔

سیّد صاحب! پچھلے خط میں، میں نے اپنا تعارف اپنے آباو اجداد کے حوالے سے کرایا تھا۔ اس خط میں چاہوں گی کہ اپنی تعلیم اور اپنی کارکردگی سے بھی آپ کو آگاہ کردوں۔ یہ تعارف بہت مختصر ہوگا، کیوں کہ مجھے وعدے کے مطابق آپ کو ان تقاریب کا احوال بتانا ہے جو گزشتہ سال ہم نے ترتیب دی تھیں۔

میں نے کراچی یونی ورسٹی سے معاشیات میں بی اے آنرز، ایم اے کرنے کے بعد صحافت اور اردو میں بھی ایم اے کیا۔ اس یونی ورسٹی کے پہلے وائس چانسلر اے بی اے حلیم صاحب تھے جو علی گڑھ سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے، اور یہ وہی حلیم صاحب تھے جو مسلم یونی ورسٹی میں ''ابا حلیم'' کہلاتے تھے اور یہ ابا حلیم تھے جنھوں نے مسلم یونی ورسٹی میں قائد اعظم کی آمد پر کہا تھا، ''مسٹر جناح ہم تاریخ پڑھا رہے ہیں اور آپ تاریخ بنا رہے ہیں۔''

اسی یونی ورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے علامہ اقبال گورنمنٹ کالج میں معاشیات پڑھانا شروع کی۔ کہنا یہ چاہتی ہوں کہ وہاں میں چالیس سال طالب علموں کی یونین انچارج کی حیثیت سے طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کا اُجاگر کرنے کا فریضہ سنبھالتی رہی، اور ہر ہر دن مجھے آپ کی سربراہی حاصل رہی۔ آپ طالب علموں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اُنھیں اپنا پھول کہتے تھے۔ ان کی کامیابی پر خوش ہوتے تھے، انعام دیتے تھے۔

پہلے گریجویٹ طالب علم کو آپ نے میڈل سے بھی نوازنے کا کہا تھا، اسی لیے میرے پاس طالب علموں کے لیے تقاریب منعقد کرنے کا تجربہ تھا۔ اب جب کہ میں سرکاری نوکری سے فارغ ہو کر ''علیگ زادی'' کی بنیاد پر ''اولڈ بوائز'' اور سرسیّد یونی ورسٹی میں اعزازی خدمات انجام دے رہی ہوں تو آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے اس یونی ورسٹی میں بھی آرٹ اینڈ لٹریچر شعبے کا سربراہ بنادیا گیا ہے۔

سیّد صاحب! جی چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھوں اپنی چالیس سالہ خدمات کا تمغہ حاصل کروں کہ آپ کی ذات، آپ کی خدمات پر میں نے سو سے زیادہ تقاریب منعقد کی ہیں جس

میں ایک آخری اس سال کی آپ کی سال گرہ بھی شامل ہے، یعنی دو سو ایک ویں سال گرہ۔

لیکن میرا موضوع اور میرا وعدہ ابھی گزشتہ تقاریب کا احوال ہے۔

شعبۂ اردو جامعہ کراچی نے آپ کی دو صد سالہ سال گرہ کا جشن جس خوبی سے منایا وہ قابلِ دید تھا۔ کاش آپ آئے ہوتے اور خود دیکھتے۔ یہ بھی بتادوں کہ جس جامعہ سے میں نے تعلیم حاصل کی، اسی جامعہ کے شعبۂ اردو کی سربراہ میری یعنی علامہ اقبال کالج کی طالبہ اور میری تربیت یافتہ ہے، اس نے پندرہ نشستوں پر مشتمل آپ کی سال گرہ جس طرح منائی ہے وہ قابلِ دید وتعریف ہے۔

میں چاہتی ہوں کہ مختصراً آپ کو اس سے آگاہ کروں:

☆ پہلا افتتاحی اجلاس پیر ۱۶ ؍اکتوبر کو منعقد ہوا۔ شیخ الجامعہ کا صدارتی خطبہ تو تھا ہی، مگر اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ریڈیو پاکستان سے نشر کی گئی آپ سے متعلق ایک تقریر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی زبانی سنائی گئی۔

یہ تو دو آتشہ بات تھی۔ ایک تو بابائے اردو کی آواز، دوسرے آپ کی خدمات کا اعتراف۔ سارا مجمع دم بہ خود تھا۔

☆ پہلی نشست کا عنوان تھا ''سرسیّد احمد خان—احوال وآثار'' جس میں چھ عدد مقالے پڑھے گئے۔ ''تبیین الکلام'' کا تعارف، سرسیّد کی سیرتی تحریریں، ''آثار الصنادید'' کا ایک جائزہ، سرسیّد احمد خان بحیثیت سیرت نگار، سرسیّد کے خطوط ان کے اصلاحی کاوشوں کا عکسِ جمیل، مذہبی فکر کی تشکیل نو میں تہذیب الاخلاق کا کردار۔ سوال و جواب جو مقالہ نگاروں اور حاضرین کے درمیان تھے، اس میں بڑے دل چسپ مکالمے تھے۔

☆ دوسری نشست بہ عنوان ''سرسیّد احمد خان—علمی و ادبی خدمات'' (الف)

اس میں بھی چھ عدد مقالے پڑھے گئے۔ ''سرسیّد کے ادبی نظریات اور معاصر ادبی صورتِ حال''، ''سرسیّد احمد خان: ایک عبقری''، ''نیرنگِ خیال کے نو آبادیاتی تناظر میں سرسیّد احمد خان بطور مثالی کردار''، ''امام بخش صہبائی اور سرسیّد احمد خان''، ''سرسیّد احمد خان اردو ادب میں جدیدیت کا نقشِ اوّل''، ''سرسیّد احمد خان، رجحان ساز ادبی

شخصیت''۔ پورے پاکستان سے مقالہ نگار شرکت کے لیے اس جلسے میں آئے تھے۔

☆ تیسری نشست ''سرسیّد احمد خان— ادبی ادارے اور علمی مراکز و شخصیات'' اس میں ''انجمن ترقیِ اردو اور سرسیّد احمد خان''، ''مصری جامعات میں مطالعۂ سرسیّد احمد خان''، ''تحریکِ سرسیّد میں سندھ کے مسلمانوں کا حصہ''، ''سرسیّد احمد خان اور مراد آباد''، ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اہداف و مقاصد اور اکیس ویں صدی''، ''سرسیّد احمد خان اور شبلی نعمانی کے باہمی تعلقات''۔ مقالہ نگار قاہرہ، خیر پور سندھ، لاہور، کینیڈا سے تشریف لائے تھے۔

☆ چوتھی نشست ''سرسیّد احمد خان: ادبی ادارے اور علمی مراکز و شخصیات'' (ب)۔ ''سرسیّد کی تحریر میں جدیدیت کی عکاسی''، ''برِصغیر کی علی گڑھ تحریک اور ایران کے دارالفنون میں مماثلت اور اہمیت''، ''بلوچستان پر سرسیّد احمد خان کے اثرات''، ''تحریکِ اتحادِ اسلامی: سیّد احمد خان اور علی گڑھ تحریک''، ''سرسیّد احمد خان اور علامہ اقبال کی ذہنی ہم آہنگی''، ''سرسیّد احمد خان اور اسماعیل گاسپرالی، تعلیمی خدمات کا موازنہ''۔ اس نشست کی مجلسِ صدارت میں ایک نام میرا بھی تھا سیّد صاحب۔ اس نشست میں تہران، کوئٹہ، کراچی، لاہور، ڈھاکا کے مقالہ نگاروں نے شرکت کی۔ ہم نے تو دہلی سے بھی ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کو مدعو کیا تھا، مگر آپ تو شاید واقف ہوں گے کہ وہ کیوں نہیں تشریف لا سکے۔

☆ پانچویں نشست کا عنوان تھا ''سرسیّد احمد خان: تعلیمی اور تانیثی تصورات''۔ مقالے کے عنوانات تھے: ''سرسیّد احمد خان اور تعلیمِ نسواں''، ''سرسیّد سے قبل ہندوستان کا تعلیمی نظام''، ''سرسیّد احمد خان کے عہد میں نسائی نقطۂ نظر''، ''اردو کی ابتدائی خواتین ناول نگاروں پر سرسیّد تحریک کے اثرات''، ''پاکستانی نظامِ تعلیم میں سرسیّد احمد خان بطور تدریس: اجمالی جائزہ''، ''سرسیّد کی تعلیمات اور ہمارا نظامِ تعلیم''۔ اس نشست میں بھی حاضری اور مقالہ نگاران کی نوک جھونک دل چسپ تھی۔

☆ چھٹی نشست ''سرسیّد احمد خان اور ادبی جہات''۔

مقالے کے عنوانات تھے''سرسیّد بطور ادبی نقاد: مابعد نوآبادیاتی تناظر میں''،''انیس ویں صدی میں جنوب ایشیائی مسلمانوں کی غرب شناسی: اردو سفرناموں کا سیاسی و سماجی مطالعہ''،''سرسیّد احمد خان کا سفرنامۂ پنجاب''،''سرسیّد کے اسلوب میں طنز کے رنگ''، ''سرسیّد 'مسافرانِ لندن' کے تناظر میں''،''عہدِ سرسیّد میں اردو ناول نگاری کے چار رجحانات''، ''سرسیّد کے سفرنامے 'مسافرانِ لندن' کی لاہور اور علی گڑھ کی اشاعتوں کا تقابل''۔

ملتان، اسلام آباد، فیصل آباد، لاہور اور کراچی کے مقالہ نگاروں نے بڑی محنت سے اپنے اپنے مقالے تحریر کیے اور پڑھے تھے۔

☆ ساتویں نشست''سرسیّد احمد خان اور سیاسی و ملی افکار''

مقالوں کے عنوان حسبِ ذیل تھے:''سرسیّد کی سیاسی فکر''''دوقومی نظریے کی اساس، مقصدیت، استحکامِ پاکستان''

ایک مقالہ انگریزی میں بھی تھا Sir Syed Ahmed Khan and Collective Time ''اسبابِ بغاوتِ ہند اور سرسیّد کا تاریخی شعور''،''برِصغیر کا نوآبادیاتی پس منظر اور سرسیّد احمد خان: تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ''،''پاکستانیت: سرسیّد کے قومی و ملی افکار کے تناظر میں''،''سرسیّد اور ڈاکٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر — انگریز نوازی کے تناظر میں سرسیّد احمد خان کی سیاسی فکر کا احاطہ''۔

☆ آٹھویں نشست''سرسیّد احمد خان اور تہذیب و ثقافت (الف)''

Reinterpretation, Reform, and Reconciliatory: Syed Ahmed Khan's Initiative in Interreligious Studies.

یہ مقالہ ہینز ورنر ویسلر کا تھا جو سویڈن سے تشریف لائے تھے۔

دوسرا مقالہ''سرسیّد احمد خان اور ہندوستان میں مسلم دانش کا ارتقا''۔

''فکرِ سرسیّد اور عصری تقاضے''،''ادب، تاریخ و ثقافت جنوبی ایشیائی تناظر اور سرسیّد احمد خان''،''تہذیب الاخلاق کی ادبی و تہذیبی حیثیت''۔''جنوبی ایشیا میں ہندو مسلم کلچر کے احیا میں سرسیّد کا کردار''،''سرسیّد احمد خان اور سائنٹفک سوسائٹی — ایک جائزہ''۔

''عہدِ سرسیّد میں صحافت اور اشتہاریات کا ارتقائی عمل''۔

اس نشست میں سوئیڈن، استنبول، سرگودھا، راول پنڈی، فیصل آباد، لیہ اور کراچی کے مقالہ نگاروں نے حصہ لیا۔

☆ نویں نشست کا عنوان تھا ''سرسیّد احمد خان اور تہذیب و ثقافت (ب)''

مقالے تھے ''سرسیّد دو ہم عصر چشتی مشائخ کی نظر میں''، ''سرسیّد کے عمرانی، تہذیبی اور تاریخی تصورات''، ''عصری سائنسی نظریات، مذہبی عقائد اور سرسیّد''، ''برِصغیر کی تہذیب و ثقافت اور سرسیّد کے نظریات مقالاتِ سرسیّد کی روشنی میں''، ''ہندو مسلم ثقافت پر سرسیّد کے اثرات''، ''سرسیّد بحیثیت سماج دوست''، ''مسلم معاشرے کا سماجی تحرک اور سرسیّد احمد خان''۔

☆ دسویں نشست کا عنوان تھا ''سرسیّد اور ادبی و تنقیدی نظریات''۔

مقالات کے عنوانات: ''جدید اردو شاعری پر سرسیّد تحریک کے اثرات''، ''سرسیّد دور میں اردو ادبی تنقید''، ''سرسیّد کے تنقیدی افکار کی عمرانی جہت''، ''سرسیّد احمد خان اور ادبی جمالیات''، ''اردو نثر پر سرسیّد کی علمی و ادبی مساعی کے اثرات''، ''مضامینِ سرسیّد میں داستانوی و نفسیاتی عناصر''، ''جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے تعلیمی ادارے''۔

☆ گیارھویں اور بارھویں نشست: ''سرسیّد احمد خان اور مشرقی علوم و فنون'' (الف اور ب)

مقالے تھے: ''مشرقی علوم پر سرسیّد کی تنقید''، ''افکارِ سرسیّد اور مسلمانانِ ہند''، ''سرسیّد احمد خان اور فارسی کی روایت''، ''سرسیّد اور رمی اردو''، ''سرسیّد کی فارسی تحریریں''، ''اردو زبان کی ترقی میں سرسیّد کا حصہ''۔

Literary Review of Sir Syed's Contribution in Education

''سرسیّد بحیثیت مؤرّخ''۔

''مسلمانوں کا ورثۂ اردو اور سرسیّد''، ''سرسیّد کے معاشرتی، اصلاحی نظریات اور ہمارا عہد''، ''جنوبی ایشیا میں مشرقی علوم اور سرسیّد احمد خان''، ''سرسیّد اور اردو زبان تہذیب الاخلاق کے تناظر میں''، ''سرسیّد کی ثقافتی و سماجی روشن خیالی''، ''اردو لغت نویسی کے ارتقا میں

سرسیّد کے لغتِ اردو زبان کا کردار''،''سرسیّد کا ترجمۂ قرآن''۔

☆ تیرھویں نشست:''سرسیّد احمد خان، تاریخ و سیاست''

''سرسیّد کی سیاسی خدمات''،''سرسیّد کا سائنسی شعور اور مذہب''،''سرسیّد اور اصولِ تاریخ نویسی''،''سرسیّد کی انگریز دوستی اور مسلم مفادات''،''مولوی ذکاء اللہ بحیثیت مؤرّخ''، ''سرسیّد کی عقلیت پسندی کی عصری معنویت''،''سرسیّد بطورِ مصلحِ اخلاق''۔

☆ چودھویں نشست:''سرسیّد احمد خان اور رسائل و جرائد''

''سرسیّد اور عہدِ جدید''،''صحیفہ اور سرسیّد شناسی کی روایت''۔

''سرسیّد کی ادبی و ثقافتی خدمات اور 'تہذیب الاخلاق' کا معاشرتی اصلاح میں کردار''، ''قومی زبان اور سرسیّد شناسی''،''سرسیّد اور امیر مینائی— ایک عہد دو روایتیں''، ''سرسیّد شناسی کی روایت میں 'افکار' کا حصہ''،''سرسیّد اور نذیر احمد کی فکری مماثلت اور مخالفت کے چند پہلو''۔

☆ پندرھویں نشست:''سرسیّد احمد خان افکار و اذکار''۔

''سرسیّد اور اکبر الہٰ آبادی: موافقت اور مخالفت''۔

سرسیّد کی محققانہ بصیرت:''سرسیّد احمد خان اور عصرِ جدید کے تقاضے''،''سرسیّد تحریک کی آفاقی اقدار''،''سرسیّد احمد خان کے افکار کا نوآبادیاتی مطالعہ''،''سرسیّد کا ذہنی ارتقا اور عصری شعور''۔

ان تمام نشستوں کے اختتام پر سوال و جواب کا حصہ بہت دل چسپ ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جامعہ کراچی کا آڈیٹوریم سرسیّد سرسیّد کی گردان کر رہا ہے۔ ان تمام تقاریب میں شہر کے علما، مشاہیر، ادبی شخصیات، اساتذہ کرام اور طالب علموں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

سیّد صاحب! لگتا تھا یہ شہر کراچی نہیں، علی گڑھ ہے۔ یہ جامعہ کراچی نہیں، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ہے۔ ہر طرف آپ کی تصاویر لگی تھیں۔ ڈھیروں بک اسٹال تھے جن میں آپ پر لکھی گئی بے شمار کتابیں فروخت ہو رہی تھیں۔ طالب علموں نے اپنی درسی کتابوں سے آپ کو اتنا نہ جانا ہوگا جتنا کہ ان نشستوں سے انھوں نے سیکھا۔

آپ نے تمام عنوانات پڑھ لیے ہوں گے، شاید آپ کی زندگی اور افکار کے کچھ پہلو رہ بھی گئے ہوں گے۔ آپ انسان تھے یا جن؟ یہ سوال اکثر ہمارے ذہن میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں اٹھا کرتا تھا۔ جواب تو آج تک نہیں ملا۔ آپ کی زندگی بے شک قابلِ رشک ہے، مگر مجھے تو ان لوگوں پر رحم آتا ہے جنھوں نے آپ کی درس گاہ کو نہیں دیکھا، علی گڑھ بھی نہیں گئے۔ میں بھی ان قابلِ رحم لوگوں میں سے ایک تھی، مگر ساری زندگی اس تمنا میں گزاری کہ کاش میں وہاں جاؤں جہاں میں پیدا ہوئی تھی، جہاں میرے آبا و اجداد نے بھی خدمات انجام دی تھیں، مگر شاید آپ اُن دشواریوں سے آگاہ نہیں جو ان دو ملکوں کے درمیان حائل ہیں۔

مجھے رشید احمد صدیقی کا جملہ یاد آتا ہے، انھوں نے کہا تھا، ''کسی معقول، باصلاحیت اور اپنے فن میں صاحبِ کمال آدمی سے ملاقات ہو اور یہ پتا چلے کہ اسے علی گڑھ سے اکتسابِ فیض کا موقع نہیں ملا تو بے اختیار اس پر ترس آتا ہے اور اس سے ہم دردی کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ اس نعمت سے کیوں اور کیسے محروم رہا۔''

سیّد صاحب ۲۰۱۴ء ۱۹رمئی والا دن میری زندگی کا ایک بہت اہم دن تھا جب میں نے اپنے شہر اور آپ کی درس گاہ میں پہلا قدم رکھا تھا۔ آپ کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے آپ سے ملاقات کرلی تھی۔ اب ہماری آپ کی دوستی بھی پکی ہوچکی ہے۔ میں نے دو خط آپ کو ارسال کیے ہیں۔ دیکھیے آپ کی سال گرہ ہم نے کس جوش اور جذبے سے منائی؟ پوری تفصیل آپ کو بھیج رہی ہوں۔

آخری اجلاس ''اختتامی اجلاس'' کے عنوان سے ہوا تھا جس میں بہت سوں نے اظہارِ خیال کیا، آپ کو خراجِ عقیدت پیش کیا، آپ کی مغفرت کی دعا بھی مانگی گئی، مگر اس موقعے پر میں یہ سوچ رہی تھی کہ حالی کی ''مسدسِ حالی'' نے تو کب کا آپ کو چھوٹے موٹے گناہوں کی سزا سے پاک کردیا ہوگا۔ آپ کو حالی بھی تو ملے ہوں گے، ہم سب کی طرف سے اُن کا شکریہ ادا کردیجیے گا کہ انھوں نے آپ کی بخشش کا سامان پہلے ہی کردیا تھا۔

سیّد صاحب! میرا یہ خط طویل ہوگیا ہے، جب کہ آپ کہتے ہیں خط مختصر اور جامع ہونے چاہییں، مگر یہ خط مختصر کیسے ہوسکتا تھا کہ آپ کے دو سو سالہ جشنِ پیدائش سے متعلق

ہے، مگر ہاں، مجھے ایک بات کا ڈر ضرور ہے کہ صغیر افراہیم صاحب اس خط کے درمیان نہ آجائیں اور کاٹ چھانٹ کرنے لگیں، کیوں کہ یہ خط ''تہذیب الاخلاق'' کی معرفت آپ کو ارسال کررہی ہوں۔ کاش کہ آپ کا ای میل نمبر مجھے مل جاتا تب براہِ راست آپ کو روانہ کردیتی، صرف چندلمحوں میں آپ کومل بھی جاتا۔

پچھلے خط میں آپ کو بتایا تھا نا کہ آپ کے جانے کے بعد اب دنیا بہت تیز رفتار ہوگئی ہے۔ سائنس نے بڑی ترقی کرلی ہے، دنوں کے کام گھنٹوں اور گھنٹوں کے منٹوں میں ہونے لگے ہیں۔ نہ پوسٹ آفس ہے، نہ ڈاکیا۔ ہے بھی تو کہیں کہیں۔ ہم تو خیر لیٹر بکس سے بھی واقف ہیں، مگر آج کے بچے خط کا لفظ بھی نہیں جانتے۔ ساری معلومات اور گفتگو کو ''میل'' کہتے ہیں۔ اب Mail کے معنی وہ نہیں رہے جو آپ کے زمانے میں تھے، ہاں البتہ دونوں کی اسپیلنگ میں ضرور فرق ہے۔

سیّد صاحب! صغیر افراہیم صاحب کی ایک شکایت اور آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔ ماہِ اکتوبر کے شمارے میں انھوں نے میرا خط جو آپ کے نام ہے، شائع کردیا تھا، لیکن آج تک وہ شمارہ انھوں نے مجھے نہیں بھیجا ہے، بلکہ ۲۰۱۴ء سے آج تک گنتی کے صرف چند شمارے بھیجے ہیں، جب کہ میں نے زندگی بھر کا ''زرِ رفاقت'' جمع کرایا ہوا ہے، اگر ہو سکے تو آپ انھیں تاکید کردیں۔ ویسے وہ تاکید بھی مسکرا کر سنتے ہیں اور خوش اسلوبی سے ٹال دیتے ہیں۔

سیّد صاحب! زندگی رہی تو آپ سے پھر مخاطب ہوں گی، ورنہ آمنے سامنے کی ملاقات تو ایک دن ہونی ہی ہے، مگر ڈر ہے کہ وہاں بھی ہندوستان اور پاکستان والوں کے درمیان ایک اونچی سی دیوار نہ حائل ہو۔ ہم اپنا ہرا پاسپورٹ اور وہ اپنا ترنگا جھنڈا لہراتے رہیں اور دونوں للچاتے رہیں۔

آپ کی سعادت مند، آپ کی مداح
نوشابہ صدیقی بنتِ حسن عبداللہ علیگ
ساکن منٹو E، علی گڑھ

○

ہماری جامعہ... جامعہ کراچی☆

ساٹھ کی دہائی شروع ہوچکی تھی میں کالج سے انٹر کر کے فارغ ہوئی تھی اور جامعہ کراچی اپنے بازو پھیلائے مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

اُن دنوں شہر سے بارہ میل پرے یہ البیلی بستی جنگل میں منگل کا سماں پیش کرتی۔ کراچی کے ہرایک طالب علم کے گھر سے قصداً دور بنائی گئی۔ جو ایک ہی راستے سے گزر کر ملتی اور یہ کہتی سنائی دیتی:

ان ہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

ایک پتلی، سیدھی اور سنسان سڑک جس کے دونوں اطراف خاردار جھاڑیاں تھیں۔ ہاں ایک مقام پر نئے نئے داخل ہونے والے پولیس کے سپاہیوں کا ٹریننگ سینٹر بھی تھا جہاں سے جب طالب علموں سے لدی اور ایک طرف کو جھکی بس گزرتی تو بس کے اندر ٹھنسے ہوئے لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ چیخ پڑتے About turn اور سارے سپاہی ایک دم سے اباؤٹ ٹرن ہوجاتے۔ انسٹرکٹر حیران کھڑا رہ جاتا اور بس کے اندر کے طالب علم تالیاں بجاتے۔ ایک ہاتھ سے ڈنڈا تھامنے والے طالبِ علم منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتے

☆۔ ۳۱/اکتوبر ۲۰۰۹ء یونی کیرین کے جلسے میں پڑھا گیا۔

اور ہم جیسے مسافر جن کا ایک پیر بس کے پائیدان پر اٹکا، دوسرا پیر ہوا میں جھول رہا ہوتا۔ ایک ہاتھ سے ڈنڈا تھامے اور دوسرے ہاتھ میں کتابیں اٹکی۔ حسرت سے سوچتے ہم نہ تالی بجا سکتے ہیں نہ منہ سے آواز نکال سکتے ہیں کہ ہمارے ہونٹ بس کی تیز رفتاری کے خوف سے جڑے ہوتے۔

اس بات کا ہم اعتراف کرتے ہیں کہ علم کے سفر میں جان سے گزرتے ہوئے جتنی آیۃ الکرسی ہم نے دل ہی دل میں اُن دنوں پڑھی بعد میں آج تک اتنی تعداد پوری نہ کر پائے۔

ہماری بس پھونس کے ایک ٹوٹے پھوٹے ہوٹل والے بس اسٹاپ، جسے کسی منچلے نے میٹروپول اسٹاپ کا نام دے دیا تھا، سے روانہ ہوتی۔ اور ہم براستہ کشمیر روڈ کشمیر فتح کرنے کا عزم لیے جامعہ پہنچ جاتے۔

جامعہ پہنچتے پہنچتے ہمارے ہاتھ سرخ، چہرہ زرد، ہونٹ سفید اور پنجوں کی جان نکل چکی ہوتی۔ جامعہ کی زمین پر سب سے پہلا قدم ہمارا ٹکراتا تب دوسرا پیر جو سارے راستے ہوا میں لہراتا رہتا ساکت ہونے کے سبب زمین پر ٹکنے سے انکار کر دیتا۔ ہم بس کی دیوار سے ٹیک لگا لیتے اور جب دوسرے پیر میں جان آجاتی اور پہلے پیر کی سوجن کم ہوجاتی تب آرٹس فیکلٹی کی واحد راہ داری سے گزرتے ہوئے آخری سرے تک جا پہنچتے جہاں شعبۂ معاشیات ہمارا منتظر ہوتا۔

یہاں پہنچ کر ہمارے جسم میں توانائی آجاتی کہ ہم آرٹس فیکلٹی کے سب سے بڑے شعبے کے سب سے جونیئر طالبِ علم کے طور پر داخل ہوئے تھے۔

نوٹس بورڈ پڑھنا ہمارے معمولات میں پہلے نمبر پر آتا۔ اس پر کبھی کوئی خوش گوار خبر نہیں ملتی۔ ٹیسٹ ٹیوٹوریل کی تاریخیں یا پچھلے اعمال نامے کا حساب نمبروں کی صورت میں لکھا ملتا جسے پڑھنا لازمی اور جسے بھگتنا ضروری تھا۔

سندھی، بنگالی، جنرل ہسٹری، انٹرنیشنل ریلیشنز، جرنلزم، معاشیات اور پھر سیاسیات کے شعبوں پر مشتمل اس راہ داری کے پیچھے کلاس رومز کی لائن لگی ہوئی تھی جہاں ہرے گاؤن والے ڈراؤنے استاد ہماری جان نکالنے پر مامور تھے اور ہمارے منتظر ہوتے۔

کلاس روم کے قصوں کی تو بھرمار ہے اور کیوں نہ ہو۔ جہاں ہیرائی صاحب ہوں، بابا مطلوب الرحمٰن ہوں، قاضی فرید، پروفیسر خورشید احمد، قمر الدین صدیقی، جعفر فخر الدین اور

ڈاکٹر احسان رشید جیسے اساتذہ جامعہ پر صرف اس لیے اتارے گئے کہ انھیں ہم میں معاشیات کی بے کیف داستانوں کا مصالحہ بھرنا تھا۔ آڑی ترچھی لکیروں والے ڈائیگرام سے قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ اور طلب و رسد کے بے فیض گورکھ دھندوں میں اُلجھا کر روز ہمیں سولی پر چڑھانا مقصود تھا۔

ان دنوں ہم نے اپنی تمام تر اجتماعی دانائی کو بروئے کار لاکر فیصلہ کرلیا تھا کہ ڈاکٹر احسان رشید کے طور طریقوں پر عمل کرکے اپنی زندگی دانش وری کی نذر نہیں کریں گے۔ جو معاشیات پر لکھی جانے والی سب سے موٹی اور وزنی کتاب A History of Economic Thought کو راہ داری سے گزرتے ہوئے آنکھوں سے لگا کر پڑھتے پڑھتے کبھی دائیں اور کبھی بائیں کھمبے سے ٹکراتے اور انتہائی عاجزی اور انکساری کے ساتھ ہر ہر کھمبے سے انگریزی میں معذرت کرتے۔

اگر ہم بابا کو بھی لگے ہاتھوں یاد کرلیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بابا کا خطاب پشت در پشت، ہم تک پہنچا تھا اور ہم پورے احترام سے انھیں بابا مطلوب ہی پکارتے۔ وہ کلاس روم میں یوں داخل ہوتے جیسے سینیٹ کا چیئر مین کروفر سے اجلاس میں شرکت کے لیے اس وقت داخل ہوتا ہے جب صدرِ مملکت بیرونِ ملک دورے پر روانہ ہونے والے ہوں کہ اس کے بعد تو انھیں ہی قائم مقام صدرِ گرامی قدر کے عہدے پر فائز ہونا ہوتا۔ ہاتھ میں رجسٹر جو سر سے اونچا سلام کے جواب کے طور پر استعمال ہوتا۔ بھری کلاس جہاں ہر طالب علم اپنی حاضری کے بعد کلاس سے باہر نکل جاتا اور آخری چند طالب علم نکلنے کے لیے اُس وقت کا انتظار کرتے جب وہ برسوں پرانی فائل کھولنے پر آمادہ ہوجاتے۔ ان کی نظریں نیچی ہوتیں اور طالب علم دبے قدموں سرک جاتے۔ وہ حسبِ عادت اپنی نگاہیں کلاس روم کے سامنے والی دیوار پر لٹکا کر پبلک فنانس کا وہ لیکچر سناتے جسے انھوں نے سالوں پہلے ہمارے سینئرز کو بھی سنایا تھا۔

اکثر ان کے حصے میں خالی کلاس آتی جہاں وہ پوری ذمے داری کے ساتھ اپنا فریضہ یوں انجام دیتے کہ رول نمبر ایک سے شروع کرتے اور نمبروار آخری طالب علم کا نمبر پورے خشوع وخضوع سے پکارتے جواب بھلا انھیں کہاں سے ملتا۔ وہ ہر ایک کو غیر حاضر قرار دیتے

اور پچاس منٹ کلاس روم میں کھڑے ہونے کے بعد گھنٹا بجتے ہی اسٹاف روم کی طرف روانہ ہوجاتے۔ جانے کا انداز بھی آنے والے انداز سے مختلف نہ ہوتا خواہ انھیں راستے میں کوئی بھی طالب علم نہ ملے۔ ایسا ہر بدھ کے دن ہوتا جب طالبات خواتین کا رعایتی فلم شو دیکھنے شہر کے مختلف سینما گھروں میں ہوتیں اور لڑکے لڑکیوں کے بغیر سونے سونے کلاس روم میں جانا ضروری خیال نہ کرتے۔

ہمیں ان دنوں بھی کلاس روم کے خشک لیکچر سے زیادہ اپنے پیارے پیارے ساتھی ہی اچھے لگتے۔ ان کے علاوہ مٹی دھول اور فراٹے دار ہوا بھی ہر وقت ہمارے ساتھ ساتھ رہتے تھے کہ میلوں پھیلی جامعہ کی زمین پر بس جھاڑیاں ہی جھاڑیاں اُگی تھیں جن کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہوا سے جب ہمارے دوپٹے اُڑ جائیں تب وہ اپنی خاردار بانھوں میں اُسے یوں دبوچ لیں کہ اب نکالو تو جانیں کی آوازیں فضا اور ہوا میں گونجنے لگتیں۔ ہم بھی سمجھ دار تھے کہ جب ہمارا دوپٹا تیز ہوا سے مقابلہ نہ کرسکا اور اُڑتا اُڑتا نظروں سے غائب ہوگیا اور بہت دور کسی جھاڑی میں اٹک گیا تو نجمہ کاظمی کے ایک دوپٹے سے دو دوپٹے بنائے گئے اور اس میں سے ایک دوپٹا ہم پر بج گیا۔ تب دوسرے دن سے سر پر اوڑھا ہوا دوپٹا تو بال پن میں اٹک گیا، لیکن بائیں جانب کندھے پر آتے آتے اسے ہم نے سیفٹی پن سے جکڑنے کا عمل شروع کردیا تھا۔

ہمیں یہ بھی یاد آتا ہے کہ ۱۹۶۲ء کا سال شروع ہوا تھا۔ ہم سیکنڈ ایئر آنرز میں آکر اب قابلِ عزت طالبِ علم بن چکے تھے، کہ ہمارے علم میں شعبے کے سپرنٹنڈنٹ ملک صاحب نے یہ اضافہ کیا کہ اب کالا گاؤن ہماری قسمت میں لکھا جانے والا ہے اور جب اس کا پہلا گٹھڑ یونین کے نگراں اور ہمارے صدرِ شعبہ قاضی فرید کے دفتر میں لاکر رکھا گیا تب ہم نے ان کی ہی وساطت سے یہ شرف حاصل کیا کہ جامعہ میں گاؤن پہننے والے پہلے طالبِ علم کے طور پر تاریخ میں جگہ پاگئے۔

مگر اس کالے گاؤن نے ہمارے سفید کپڑوں کو چھپا دیا کہ ہم سفید کپڑوں کی وجہ سے انفرادیت حاصل کرچکے تھے اور خاصے جانے پہچانے جانے لگے تھے کہ ہماری کھڑی کا

اسٹریپ، چپل، بالوں کے ربن اور کاپی کتاب کے کور تک سفید ہوتے تھے بعد میں کچھ اور لڑکیوں نے ہمارا ساتھ دیا جس میں راشدہ افضال، سعدیہ صدیقی اور فائزہ صدیقی کارواں بنانے کا سبب بنیں۔

ان سفید کپڑوں کے سبب ہمیں پہلے سال احتراماً ''مادرِ ملت'' کا خطاب ملا۔ دوسرے سال ''تاج محل''، پھر ''سنو وائٹ'' اور آخری سال ''کفن پوش'' کے نام سے پکارے جانے لگے۔

جامعہ میں خوشیاں کم اور مصائب زیادہ تھے۔ جامعہ کی چاٹ میں ریت، مٹی اور کنکر کی آمیزش سے زیادہ ہمیں شکایت یہ تھی کہ اس میں دیگر فروٹ کم اور پپیتے کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ ایک تو ہمیں اس پھل سے سخت چڑ تھی اور دوسری بات یہ کہ یہ سستا پھل چار آنے میں سیر بھر مل جاتا۔ چار آنے اور سیر بھر ہم نے یوں کہا کہ اُن دنوں اعشاری نظام اور کلو کا لفظ ایجاد نہیں ہوا تھا۔

اُس زمانے میں دو پٹیوں والی چپل فیشن میں بھی داخل تھیں اور بوہری بازار سے پانچ روپے میں مل بھی جاتی تھی۔ جو ایک مہینے چلتی اور پھر دوسرے مہینے سے ہر تین چار دن بعد ٹوٹنا شروع ہوجاتی۔ جامعہ میں کوئی موچی نہیں تھا۔ ہم اپنے ساتھ لائی ہوئی باریک باریک کیلوں سے اپنی مدد آپ کرلیا کرتے۔ کیلیں ٹھونکنے کے لیے پتھروں کی جامعہ میں بہتات تھی۔

ہم نے اپنی دوست صنوبر نجم الدین کی پناہ میں آکر اُس وقت کے رجسٹرار نجم الدین صاحب سے گزارش بھی کی تھی کہ جامعہ میں موچی ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ بات کہنے میں ہمیں کئی دن لگے تھے کہ اُن دنوں رجسٹرار کی پوسٹ پر آج کے رئیس علوی جیسے مہربان لوگ فائز نہیں ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ فون کا نہ ہونا بھی ایک المیہ تھا، حالاں کہ ہم میں سے نوّے فی صدی طالب علم ایسے تھے جن کے گھر فون نہیں ہوتا تھا، لیکن ہمیں دس فی صد لوگوں کا خیال تھا، اور ہم اس کے حصول کے لیے شیخ الجامعہ اشتیاق حسین قریشی کے پاس خود بہ نفسِ نفیس گئے کہ بزمِ معاشیات کی ایک تقریب میں انھیں ہماری تقریر بہت پسند آئی تھی ان کی کالی عینک میں چھپی آنکھیں جانے ہمیں دیکھ بھی رہی تھیں یا نہیں، مگر ہم نے اپنی آواز اُن تک پہنچادی تھی۔

بہرحال ہماری مقبولیت کے باعث اور ہماری درمندانہ التجا کے باعث مشفق اور محترم شیخ الجامعہ نے لفٹ کے پاس ڈبا نما فون دیوار پر آویزاں کرادیا، جو اکثر خراب رہا کرتا اور ہمارا ایک آنے کا دانے دار سکہ بھی ہضم کرجاتا جس کا ہمیں ہفتوں ملال رہتا۔

ان تینوں مطالبوں پر عمل کچھ آسان نہ تھا کہ ہمیں روزنامہ ''جنگ'' کے طالب علموں کے صفحے پر ''جامعہ کی چاٹ۔ موچی اور فون'' کے عنوان سے مضمون بھی لکھنا پڑا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ اُن دنوں ابھی نثار زبیری نفسیاتی شعبے میں شعور لاشعور کی گتھیاں سلجھا رہے تھے اور طلبہ کا صفحہ ابھی ان کی دسترس میں نہیں آیا تھا، ورنہ وہ ہماری عظیم الشان کامیابی میں شریک قرار دے دیے جاتے۔

مضمون کی مقبولیت کے بعد پوسٹ آفس کی دیوار سے ٹیک لگا کر ایک موچی بٹھا دیا گیا جس کا حلیہ کچھ یوں تھا کہ اس کے بال کندھے تک آتے موچھیں غیر ضروری طور پر بڑی اور بڑھی ہوئی انتہائی بے ترتیب لمبی ڈاڑھی۔ یا تو وہ منہ اوپر اٹھاتا نہیں تھا اور ہر وقت جوتوں کی خرابی دور کرنے کے لیے جھکا رہتا، یا اگر چہرہ اٹھاتا تو ہم ڈر کر نظریں نیچی کرلیتے۔ اسے وہ ہمارا اپنے لیے احترام سمجھتا۔ آج سوچتے ہیں کہ اس حلیے والے شخص کو تو ہم بآسانی ٹی وی میں دیکھے ہوئے خودکش بم بار کا نام دے سکتے ہیں۔ اگر وہ آج تک زندہ ہو اور ابھی تک موچی ہو اور اب بھی جامعہ کے موچی کے طور پر خدمات انجام دینا چاہتا ہو تو اسے رینجرز بھلا جامعہ تک پہنچنے کی اجازت کیوں کردیں گے؟ ہمارا حلیہ تو ماشاء اللہ ابھی تک طالب علمانہ ہے، مگر رینجرز ہمیں بالکل نہیں پہچانتے اور ہمیں بھی اپنی اس جامعہ میں آزادنہ داخلے کی اجازت نہیں دیتے جہاں ہم نے برسوں بادشاہت کی ہے۔

بہرحال ذکر ہورہا تھا محترم موچی صاحب کا کہ اس تک ایک ہاتھ میں چپل لٹکائے پہنچتے پہنچتے ہمارا ایک عدد پاؤں لہولہان ہوچکا ہوتا وہ تو شکر ہے کہ دونوں چپل کبھی ایک ساتھ نہیں ٹوٹیں۔ شاید یہ چپلوں کی اپنی کوئی خفیہ تھیوری ہو جو ہمیں بالکل اسی طرح کبھی سمجھ میں نہیں آئی جیسا کہ معاشیات کی بیشتر تھیوری بطورِ خاص Theory of Consumer Surplus جہاں بے چارے Consumer کو وہ فائدہ ہوتا ہے جو اُسے کبھی ہوا ہی نہیں ہوتا ہے۔

خیر، اب ہم اگلی کامیابی کی طرف چلتے ہیں جو چاٹ والے کے حوالے سے تھی کہ اب پیپتے کی مقدار کم کر کے خربوزے یا کیلے کی مقدار بڑھا دی گئی تھی اور فروٹ چاٹ والا ہمیں قلم والا معتبر طالب علم سمجھ کر اکثر چاٹ کا پیالہ مفت فراہم کر دیتا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے مضمون سے اس کے ٹھیلے کی شہرت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا اور اسی لیے بلامعاوضہ اشتہاری مہم کے ذریعے اب سائنس فیکلٹی والوں تک اُس کی دھوم پہنچ چکی تھی۔ ہم اس کی فراہم کردہ مفت چاٹ بخوشی قبول کر لیتے، لیکن جسے کھانے کے بعد غیرت میں آجاتے اور اپنے بڑکپن کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے لوہے کے اس پیالے میں اکنی ڈال دیا کرتے جس میں پانی بھرا ہوتا اور کئی ایک سکے اس میں پہلے سے ڈولتے ہوتے۔ یہ پیالہ اس کا کیش باکس تھا جسے اُن دنوں ہم اپنی زبان میں گلک کہا کرتے۔ یہ راز آج تک راز ہے کہ اس میں پانی کیوں ہوتا تھا؟

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم چاٹ والے کی نظروں سے بچ کر لائبریری تک جاتے کہ ہر وقت تو ہمارے پاس کرائے کے علاوہ ایک آنے کی مزید بھاری رقم نہیں ہوتی تھی۔

لائبریری کے ساتھ ساتھ ہمیں شعبۂ تصنیف و تالیف میں رُکنے کا بھی شوق تھا کہ وہاں ش صحیٰ نام کے جغرافیے کے ایک معروف استاد بیٹھے ملتے کہ وہ ہماری بڑی بہن کے استاد تھے اور اردو کالج میں پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی میں وہاں لے جائی جاتی اور ان کی کلاس میں بیٹھ کر جغرافیے کے نہ سمجھ میں آنے والے لیکچر سنا کرتی۔ جامعہ جاتے جاتے میں بڑی اور وہ اور بڑے ہوگئے تھے۔ اب وہ کرسی پر بیٹھتے اور میں ان کے سامنے کھڑی ہو کر ان کی شاعری خاص طور سے ان کی سانیٹ سننے کی فرمائش کرتی۔ وہ مجھے باذوق سامع سمجھتے ہوئے کبھی کبھار سنا دیا کرتے اور مجھ پر شادمانی طاری ہو جاتی۔

جامعہ میں جتنی دوستی ہماری لڑکیوں سے تھی اتنی ہی لڑکوں سے بھی تھی۔ مجھے یہ کبھی اچھا نہیں لگا کہ ہمیں دو صنفوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ ہم تو بس طالب علم تھے، مگر میجر آفتاب کی لاٹھی جب راہ داری کے ایک سرے سے سناٹے میں ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ اپنا سفر شروع کرتی تو آخری کونے تک اک گونج سنائی دیتی ایسے جیسے رمضان کی ساکت اور نیند

بھری راتوں میں سحری کے لیے اٹھانے والے کی آواز آتی ہے، ''لڑکے لڑکیوں میں تین فٹ کا فاصلہ رکھو''۔ پھر حمید چھاپرا، فاروق بنگالی، سعید جعفری، بلال سوریا، سبحان اللہ خان، شمی فاروقی، محمد احمد قریشی، فاروق ارشد یا اور بھی ہمارا کوئی پیارا ساتھی ہوتو ہم تین فٹ کے فاصلوں میں بٹ جانے پر مجبور ہوجاتے۔ زیبا، عابدہ، زینب، رئیس، محمودہ اور شمیم کوہاٹی ایسے فاصلے کی سخت ترین مخالف ثابت ہوئیں۔

ہاں کچھ اور چیزیں بھی اس وقت اچھی نہیں لگتی تھیں۔ بعض اساتذہ کے لیکچر، ایشو ہونے والی کتابیں، بھری ہوئی بسیں، اپنی کم مائیگی، گرلز کامن روم کا وجود، لائبریری سے لی ہوئی بھاری بھرکم کتابیں، بے وقت کا ٹن ٹن بجتا گھنٹا اور پھر کبھی ٹیسٹ اور کبھی ٹیوٹوریل، لیکن آج پینتالیس برس گزر جانے کے بعد وہاں کی گرد، تیز ہوا، لدی ہوئی بس تین فٹ کا فاصلہ یادوں میں مترنم آواز کا روپ دھار جاتا ہے۔

دن گزر جاتے ہیں وقت ایک سا نہیں رہتا۔ ایسا ہی جیسے چہرے کی نمودار ہوتی ہوئی لکیریں، کمر کا جھک جانا، آنکھوں پر چشمہ چڑھ جانا، چشمے کا نمبر بڑھ جانا، ہاتھ پاؤں کا کپکپانا، ڈاکٹروں سے راہ و رسم کا بڑھنا، کانووکیشن سے ڈگریاں وصول کر لینے کے غرور کے بعد جامعہ سے دور ہوجانا آج ہمیں کتنا دکھی کرگیا ہے۔ ہمارے بہت سے ساتھی ہم سے جیتے جی چھوٹ گئے ساری ہوائیں ساری فضائیں بدل گئیں۔

اب ہمارے پاس گاڑی ہے، مگر جامعہ کی بس کا مزہ بھلائے نہیں بھولتا۔ ہمارے پاس پیسا ہے، مگر ایک آنے کے حصول کا مزہ کہیں گم ہوگیا ہے۔ چپل ٹوٹ جاتی ہے ہم اسے پھینک دیتے ہیں۔

فون ہمارے پاس پرس میں ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ شہر میں ہوا ہی نہیں چلتی دوپٹے میں پن لگانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ اساتذہ جو ہمیں زندگی کا درس دیتے تھے، چھپ گئے۔ ان کی آوازیں اب تک کانوں میں آتی ہیں۔ بہت یاد آتی ہیں۔

ہاں وہ عمارت تو اپنی جگہ موجود ہے ہمیں اس کے در و بام سے اب بھی محبت ہے کہ ہماری نوجوانی کے قہقہوں کو وہ اپنے اندر سمیٹے اور سموئے ہوئے ہے، مگر بستیاں تو اپنے مکینوں

سے پہچانی جاتی ہیں۔ ہر بستی اور ہر شہر کی اپنی خوش بو اور اپنی روشنی ہوتی ہے جو وہاں کے بسنے والوں کی محبت اور خلوص سے جنم لیتی ہے۔

جامعہ تو موجود ہے، لیکن آج جامعہ ہم سے دور ہے۔ آج ہم سب اپنے اپنے دور کے بہت سے ساتھی ایک ساتھ جمع ہیں۔ باوجود اس کے کہ چہار دیواری دوسری ہے، مگر اس کی خوش بو اور روشنی ہم یہاں بھی محسوس کر رہے ہیں اور اسے یاد کر رہے ہیں اپنی جامعہ کو اپنے زمانے کی جامعہ کو۔

آج ۳۱/اکتوبر ۲۰۰۹ء کا دن ہے۔ آج صدرِ مملکت کے اعلان کے باعث گھڑی کی سوئی ایک گھنٹا پیچھے کردی جائے گی۔ ہم اپنی کلائی کی گھڑی کا بھی وقت تبدیل کردیں گے، لیکن ہم سوچ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو سارے جہان کا صدر ہے، کیا کبھی یہ فیصلہ نہیں سنا سکتا کہ ہم سب اپنے اپنے گھروں کے کیلنڈر پینتالیس سال پیچھے کرلیں اباؤٹ ٹرن ہوجائیں، ساٹھ کی دہائی پھر سے آجائے۔ وہی جامعہ ہو۔ وہی ہم ہوں۔

کالے گاؤن ہوں۔ ہرے گاؤن ہوں۔ ہمارے پیارے پیارے ساتھی ہوں۔ وہی ہوائیں وہی فضائیں ہوں اور میجر آفتاب کی لاٹھی کی ٹک ٹک کی آواز ہو۔ تین فٹ کے فاصلے کا حکم ہو، مگر دل ایک ساتھ دھڑک رہے ہوں۔ ہم جامعہ کی عظیم الشان عمارت کو نظروں میں سجا کر جی جان سے کہہ رہے ہوں:

اے وادیِ جمیل مرے دل کی دھڑکنیں
آداب کہہ رہی ہیں تری بارگاہ میں

○

تبصرہ

کتاب : چشمِ نم
مصنفہ : نوشابہ صدیقی
ضخامت : ۲۷۰ صفحات
سالِ اشاعت : ۲۰۱۵ء
قیمت : ۵۰۰ روپے
پبلشرز : رب پبلشرز، مہر ٹیرس اسٹریٹ-۶، برنس روڈ، کراچی
مبصر : ریاض الرحمٰن شیروانی
اشاعت : کانفرنس گزٹ علی گڑھ

محترمہ نوشابہ صدیقی کا قدیم وطن غازی پور ہے۔ ان کے دادا مولوی ابوالحسن اور والد حسن عبداللہ کا علی گڑھ سے قریبی تعلق رہا تھا جو ایم اے او کالج سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے دور ضیاء الدین احمد تک پھیلا ہوا تھا۔ مولوی ابوالحسن ایم اے او کالج کے اسسٹنٹ سیکریٹری رہے تھے اور نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب محمد اسحاق خاں، نواب سر مزمل اللہ خاں شروانی سب کے ساتھ کام کیا تھا اور ان کی خوش نودی حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی وائس چانسلری میں وہ یونی ورسٹی کورٹ اور ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہے۔

نواب صدر یار جنگ سے ان کے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ وہ جب علی گڑھ آتے تو ہمیشہ ان کے مستقر حبیب منزل میں قیام کرتے۔ حسن عبداللہ صاحب نے مسلم یونی ورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ وہ مولانا سیّد سلیمان اشرف کے درسِ قرآن میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ مولانا سلیمان اشرف اور پروفیسر رشید احمد صدیقی دونوں انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ رشید صاحب نے ان پر مضمون بھی لکھا تھا جو ''گنج ہائے گراں مایہ'' میں شامل ہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں اسٹیورڈ (پراپرٹی آفیسر) ہوگئے تھے۔ یہیں ۱۹۴۶ء میں چالیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا اور ان کی تدفین مسلم یونی ورسٹی کے قبرستان میں ہوئی۔ وہ اپنے والد کے تنہا بیٹے تھے، لیکن ان کے والد (مولوی ابوالحسن) نے یہ صدمہ جس صبر و استقامت سے برداشت کیا وہ ایک سچے مومن کی نشان دہی کرتا تھا۔ حسن عبداللہ صاحب کے انتقال کے وقت نوشابہ صدیقی صاحبہ کی عمر صرف دو سال تھی، لیکن وہ باپ کی کمی ہمیشہ اس حد تک محسوس کرتی رہیں کہ وہ ان کی زندگی کا ایک بڑا ہی جز بن گیا۔ غازی پور کا ذکر آیا ہے تو یہ عرض کرنا بے جا نہیں ہوگا کہ اس نے مسلم یونی ورسٹی کو تین ممتاز وائس چانسلر دیے ہیں: سر شاہ محمد سلیمان، پروفیسر عبدالعلیم جو مولوی ابوالحسن کے بھتیجے ہوتے تھے اور موجودہ نائب صدر جمہوریۂ ہند عزت مآب محمد حامد انصاری۔ غازی پور یوں بھی مردم خیز خطہ ہے۔ اس کی عظمت کے اظہار کے لیے ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر سیّد محمود اور ڈاکٹر شوکت اللہ شاہ انصاری کے نام کافی ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد نامعلوم مولوی ابوالحسن کن وجوہ سے کراچی منتقل ہوگئے۔ نہ غازی پور میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، نہ ابوالحسن صاحب سیاسی آدمی تھے اور نہ ان کی عمر ایسی تھی کہ وہاں جاکر انھیں جاہ و منصب کی خواہش ہوتی۔ نوشابہ صدیقی صاحبہ نے زیرِ تبصرہ کتاب میں اس کی توجیہ یہ کہہ کر کی ہے کہ وہ ہجرت پر مامور تھے، مجبور نہیں۔ ممکن ہے اس کی بشارت انھیں خواب میں ہوئی ہو۔ اس وقت نوشابہ صدیقی بچی تھیں۔ اس لیے ان کی پرورش اور تعلیم کراچی ہی میں ہوئی اور انھوں نے باقی زندگی وہیں بسر کی اور کر رہی ہیں۔ وہ معاشیات کی استاد رہیں۔ کراچی یونی ورسٹی میں ان کے استاد پروفیسر احسان رشید صدیقی

بھی تھے، انھوں نے زیرِتبصرہ کتاب میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ احسان رشید صاحب سے کہا تھا کہ آپ کے والد میرے والد کے استاد رہے تھے اور آپ میرے استاد رہے۔

نوشابہ صدیقی صاحبہ نے تعلیم حاصل کی، معلم رہیں، شادی ہوئی، خانہ داری کے فرائض انجام دیے، بچوں کی پرورش و پرداخت کی، سماجی اور علمی و ادبی کام کیے، لیکن وہ اپنے دادا اور والد کی سرزمین کو کبھی نہیں بھولیں۔ غازی پور اور وہاں کے اعزہ کے ساتھ دلی تعلق تو رہا ہی، لیکن سب سے زیادہ ان کے خیالات میں وہ مقامات بسے رہے جن سے انھیں ان کے والد کا تعلق رہا تھا اور ان میں سرِفہرست علی گڑھ تھا، کیوں کہ یہاں ان کے والد نے تعلیم ہی نہیں پائی تھی اور ملازمت ہی نہیں کی تھی، یہاں ان کی قبر بھی تھی۔

زیرِ تبصرہ کتاب (''چشمِ نم'') محترمہ نوشابہ صدیقی کا ہندوستان کا سفرنامہ ہے۔ ہمارے خیال سے اس کا دوسرا نام باپ کی تلاش بھی ہوسکتا ہے، کیوں کہ ان کے اس سفر کا حاوی جذبہ یہی تھا۔ یہ سفر ۲۰۱۴ء میں اس وقت ہوا جب وہ دنیا کے دھندوں سے فارغ ہوچکی تھیں۔ انھوں نے خود لکھا ہے: ''دوسروں کے لیے جینے کا وقت ختم ہوگیا، اب میں اپنے لیے جینے نکل پڑوں گی۔'' اور ان کے نزدیک اپنے لیے جینے کا مطلب تھا اپنے باپ دادا سے وابستہ مقامات کی زیارت۔ وہ ساٹھ سال کے بعد ہندوستان آرہی تھیں۔

انھیں ویزا تین مہینے کا ملا تھا، لیکن انھوں نے ہوائی جہاز کا واپسی کا ٹکٹ پندرہ دن ہی کا لے لیا، کیوں کہ ''وہاں بھلا کون میرا منتظر ہے''، لیکن ہندوستان مہمان نواز ہے، وہ ان لوگوں کو بھی نہیں بھولا ہے جو اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ ان کا بھی مشتاق رہتا ہے۔ ''مگر یہ کیا ہوا کہ پندرہ دن تو لمحے بھر میں گزر گئے۔ ابا کی قبر روز مجھے آواز دیتی تھی۔ سرسیّد کی درس گاہ نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ابا کی درس گاہ نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور حسن منزل، صمد منزل (غازی پور) نے میری آنکھوں میں ڈھیروں آنسو بھر دیے۔ اپنے گاؤں کے اُجڑے کھیت شکوہ کررہے تھے، 'تم دیر سے آئیں۔'''

اللہ رے ہجرت کا کرب۔ آگے لکھتی ہیں: ''میں نے جب شعوری طور پر آنکھیں کھولیں ایک اَن دیکھی دنیا میں جیتی رہی ہوں۔ یہ خواہش ہر وقت میرے دل میں کہیں نہ

کہیں چھپی رہی کہ میں وہ دنیا دیکھوں جہاں میرے آباو اجداد نے زندگی گزاری۔'' ان کے اندر یہ خواہش تو رہی، لیکن اصلی جذبہ یہ تھا کہ جو نعمت ان سے دو سال کی عمر میں چھن گئی تھی، جہاں جہاں اس کے نقشِ قدم پڑے تھے وہاں وہاں ان کے قدم بھی پہنچ جائیں۔ بہرحال وہ کراچی سے اڑیں اور صرف دو گھنٹے میں دہلی پہنچ گئیں۔ ہمارے دونوں ملکوں کے فاصلے کتنے قریب ہیں، لیکن کتنے دور ہوگئے ہیں۔ دہلی آکر ان کا پہلا سابقہ جامع مسجد سے پڑا اور پہلا منظر ان کے سامنے یہ آیا: ''...... صفیں بچھی ہوئی تھیں، نمازی خشوع و خضوع کی کیفیت میں تلاوت کررہے تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں تسبیح تھی اور دانے شمار کررہے تھے۔'' گویا اس لحاظ سے آج بھی ہندوستان، پاکستان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دہلی میں انھیں لال قلعہ، قطب مینار، خواجہ نظام الدین اولیا کا آستانہ سب اپنی شان اور اپنا تقدس دکھاتے ہوئے ملے۔ ان مقامات پر بھی وہ ان قدموں کے نقوش کو نہیں بھولیں جن کی تلاش میں وہ نصف صدی سے زیادہ کی مدت میں ہندوستان آئی تھیں۔

اور پھر وہ آنسو بہاتی ہوئی اس شہر میں آگئیں جو ان کی ''اوّلین ترجیح'' تھا۔ وہ شہر وہ تھا جس کے بارے میں، ان کے بقول، شاعر نغمہ سرا تھا:

سرشار نگاہ نرگس ہوں ، پابستۂ گیسوے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن ، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

وہ علی گڑھ آکر یونی ورسٹی گیسٹ ہاؤس نمبر ایک میں ٹھہر گئیں۔ انھوں نے گیسٹ ہاؤس کے کمرہ نمبر سات میں سامان رکھ کر مئی کی گرم دوپہر میں پہلا کام یہ کیا کہ یونی ورسٹی قبرستان کی راہ لی کہ ان کا اصلی مقصود وہی تھا اور وہاں پہنچ کر وہ اپنے ابا (حسن عبداللہ صاحب) کی قبر تلاش کرنے لگیں۔ شہرِ خموشاں میں ۲۰۱۴ء میں ۱۹۴۶ء کی تلاش کتنا دشوار کام تھا۔ یہ داستان سناتے ہوئے ان کا لہجہ بہت جذباتی ہوگیا ہے۔ اس تلاش میں کئی گھنٹے گزر گئے، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئیں تاہم مایوس بھی نہیں ہوئیں۔ انھیں بانیِ درس گاہ سرسیّد احمد خاں کا ''امید پر معرکۃ الآرا مضمون'' یاد تھا۔ اگلی صبح وہ پھر وہاں پہنچ گئیں اور تلاش پھر شروع کردی۔ اب اس تلاش میں رفیق گورکن بھی ان کے ساتھ شریک ہوگیا تھا۔ بالآخر

تلاش کامیاب ہوئی۔ من جدّ وجد اور جوئندہ یابندہ۔ ایک قبر کے پاس بیٹھ کر انھوں نے جھاڑیاں صاف کیں۔ قبر کا پتھر کالا ہوگیا تھا، اسے بھی کسی نہ کسی طرح صاف کیا۔ ''ابھی ایک لفظ ہی صاف ہوکر سامنے آیا تھا کہ میری چیخ اس قبرستان میں بلند ہوئی۔'' انھوں نے زندگی میں ایک کام یہ بھی کیا تھا کہ اپنے والد کی ڈائریوں کی مدد سے ان کا کلام مرتب کرکے شائع کرادیا تھا۔ وہ حسن تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے ان کے مجموعۂ کلام کا نام ''افکارِ حسن'' رکھا تھا۔ وہ بطور نذرانۂ عقیدت قبر پر رکھ دیا۔ وہ تین دن علی گڑھ میں رُک کر دہلی کے لیے روانہ ہوگئیں، لیکن پھر آنے کے ارادے سے۔

وہ دہلی سے علی گڑھ، وہاں سے آگرہ، پھر علی گڑھ، اعظم گڑھ اور اپنے سابق وطن مالوف غازی پور کا سفر کرتی رہیں۔ ہر جگہ ان کی آؤ بھگت ہوئی۔ آگرہ سینٹ جانس کالج میں بھی ان کے والد نے تعلیم حاصل کی تھی اور کچھ عرصہ پڑھایا بھی تھا۔ وہ وہاں گئیں اور کالج کے پرنسپل الیگزینڈر لال نے دل کھول کر ان کا استقبال کیا۔ وہ آگرہ کالج بھی گئیں۔ وہاں بھی ان کے والد استاد رہے تھے۔ وہاں بھی پرنسپل راوت اور انگریزی کی استاد شاداں نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔ اگر کوئی شخص ہندوستان آئے اور آگرہ جاکر تاج محل نہ دیکھے تو وہ گویا ہندوستان آیا ہی نہیں۔ بہت سے تو صرف تاج محل دیکھنے کے لیے ہندوستان آتے ہیں۔ شاہ جہاں ہندوستان کو کیا دولتِ بے بہا دے گیا ہے۔ محترمہ نوشابہ صدیقی نے بھی تاج محل کی زیارت کی۔ تاج محل صرف ہندوستان ہی میں تعمیر ہوسکتا تھا، کہیں اور نہیں ہوسکتا تھا، کیوں کہ وہ انڈو پرشین تہذیب کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

علی گڑھ میں انھوں نے بہت کچھ دیکھا، بہت لوگوں سے ملیں۔ ان سب کا ذکر انھوں نے بہت اپنائیت اور فراخ دلی سے کیا ہے۔ انھوں نے علی گڑھ والوں کو بھی اپنی شخصیت اور اپنے جذبات سے بہت متاثر کیا۔ وہ معاشیات کی پروفیسر رہی ہیں، لیکن ان کی سادگی اور ان کا اندازِ گفتگو ذاتی فخر و مباہات سے یکسر خالی ہے۔ اگر انھیں فخر ہے تو اپنے آبا و اجداد پر، اور ان کا انکسار یہ ہے کہ وہ اپنے کو ان کے مقابلے میں ہیچ بتاتی ہیں،

حالاں کہ خود ان کے اپنے کارنامے بھی کچھ کم نہیں ہیں۔

آگرہ سے علی گڑھ ہوتی ہوئی وہ اعظم گڑھ چلی گئیں۔علی گڑھ سے اعظم گڑھ تک کا سفر انھوں نے ٹرین سے کیا۔لکھا ہے کہ وہ ٹرین میں چالیس سال کے بعد بیٹھی تھیں۔ٹرین کے سفر میں ان کے ذہن میں علی گڑھ کی یادیں پھر تازہ ہوگئیں۔انھوں نے اپنے ایک بھائی کا ذکر کیا ہے جو تعلیم منزل میں پیدا ہوئے تھے اور مصنفہ کے یہاں آنے سے پانچ ماہ قبل ان کا پچاسی سال کی عمر میں انتقال ہوگیا تھا۔اگر وہ حسن اختر تھے تو ان کا اور خاکسار تبصرہ نگار کا ایک سال آفتاب ہوسٹل میں ساتھ رہا تھا۔اس وقت راقم الحروف ایم اے کا طالب علم تھا اور وہ انٹرمیڈیٹ میں تھے۔مصنفہ نے ایک بات عجیب لکھ دی ہے کہ ''میرس روڈ اب زمیں بوس ہو چکا ہے۔'' ایسا بالکل نہیں ہے، الحمدللہ میرس روڈ تو اب ۱۹۴۶ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ آباد، پررونق اور روشن و تاباں ہے۔خیر، وہ اعظم گڑھ پہنچ گئیں جو ان کی ''بہن کا شہر تھا''، لیکن اس شہر سے ان کا ''کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا''۔البتہ انھیں وہاں پہنچ کر اپنے اردو کے استاد انجم اعظمی یاد آگئے۔وہ انھیں اپنے چند بہترین استادوں میں سے ایک قرار دیتی ہیں۔انھوں نے لکھا ہے وہ علیگ بھی تھے اور رشید احمد صدیقی کے شاگرد بھی۔یہ انجم اعظمی ہمارے بھی دوست تھے۔اعظم گڑھ میں مصنفہ کا قیام دو دن رہا اور وہ اپنی بہن اور ان کے بچوں کی مہمان داری سے بہت متاثر ہوئیں۔

اور اب وہ اپنے قدیم وطن غازی پور پہنچ گئیں۔وہاں بھی انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔وہ اپنے اعزہ سے اور ان کے اعزہ ان سے مل کر خوش ہوئے۔اپنے آبا و اجداد کی قدیم عمارتوں حسن منزل اور صمد منزل کی زیارت کی اور آنسو بہائے۔مکانوں کی رونق مکینوں سے ہوتی ہے۔جب مکین ان کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو شکست و ریخت ان کا مقدر بن جاتا ہے۔تاہم انھوں نے یہ دیکھا کہ غازی پور میں الحمدللہ مسجدیں آباد ہیں، تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی جاری ہے۔وہ اپنے آبا و اجداد کے گاؤں بھی گئیں۔انھوں نے دیکھا کہ وہاں کے

ہندو بھی ان سے مل کر اتنے ہی خوش ہوئے جتنے مسلمان۔

انھوں نے اپنے بزرگوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔ البتہ اکثر جگہ جذباتیت حاوی ہوگئی ہے۔ کتاب میں بعض جملے بہت خوب صورت اور خیال انگیز ہیں، مثلاً ''ہماری نئی نسل یاد رکھنے اور بھول جانے جیسے جذبے میں ہم سے یکسر مختلف ہے'' اور ''بچے کسی دوسرے ملک میں جاکر تیسرے درجے کے شہری بن کر زندگی گزار رہے ہوں گے۔'' دراصل آج کا سب سے بڑا المیہ دولت اور اقتدار کی ہوس ہے۔ وطن سے باہر جاکر آدمی بلاشبہ دوسرے اور تیسرے درجے کا شہری بن جاتا ہے، لیکن دولت ضرور ہاتھ آجاتی ہے، اور جب دولت اور اقتدار مل جائے تو نہ اقدار و روایات کی اہمیت رہتی ہے اور نہ کسی کو یاد رکھنا ضروری رہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ والدین اور دیگر متعلقین کو وقتاً فوقتاً پیسے بھیج دیے یا ان کی دیکھ بھال کے لیے کوئی ملازم رکھ دیا اور ذمے داری ختم ہوگئی، بلکہ اب تو اولڈ ایج ہوم نے اس کی بھی جگہ لے لی ہے۔

جب پروفیسر نوشابہ صدیقی اپنے سابق وطن سے رخصت ہو رہی تھیں تو ان کے ذہن میں خیال تھا ''کاش میں اسی گھر میں پلی بڑھی ہوتی، اسی شہر میں رہتی۔'' انھوں نے کراچی جیسے بڑے اور بارونق شہر میں بھرپور اور کامیاب زندگی گزاری ہے۔ پھر وہ کیا جذبہ ہے جس نے ان سے یہ لکھوایا ہے۔ انھوں نے یہ تو لکھا ہے کہ ہم ہجرت پر مامور تھے، لیکن یہ پتا نہیں لگتا کہ کیوں مامور تھے؟ بہرحال ذہنی کیفیت یہ تھی: ''ان چاروں موسموں کے نام کے علاوہ مجھے پانچویں موسم کا کوئی پتا نہیں تھا، مگر اسی لیے میرے وجود نے چیخ چیخ کر کہا ہاں مجھے اس کا نام معلوم ہے۔ یہ درد کا موسم ہے۔ یقین جانیے میرا سارا جسم ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔''

غازی پور سے وہ دہلی آگئیں۔ دہلی میں انھوں نے مسلمانوں اور اردو کے حوالے سے جو دیکھا، اس سے مایوس نہیں ہوئیں۔

لکھا ہے دہلی یونی ورسٹی کا شعبۂ فارسی بھی دیکھا جس کے صدر ہندو تھے۔ اچھا لگا کہ

ہندوستان میں ہندی کے علاوہ دیگر زبانیں بھی شوق سے پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ اور اردو اکیڈمی کا ذکر انھوں نے بہت تفصیل سے اور معرفانہ انداز میں کیا ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ کچھ تحریریں کچھ تصویریں ہیں، تیسرا حصہ آباو اجداد کے ذکر سے معمور ہے، چوتھے اور پانچویں حصے میں بھی بزرگوں کے ہی احوال ہیں۔ یہ سب معلومات بہت قیمتی ہیں۔ کتاب خوب صورت چھپی ہے، قیمت ہندوستان کے لحاظ سے تو زیادہ محسوس ہوتی ہے، ممکن ہے پاکستان کے لحاظ سے نہ ہو۔

○

حیرت یہ ہے کہ خود معاشیات کی استاد ہونے کے باوجود آمدنی میں دل چسپی رکھنے کی بجائے خرچ میں دل چسپی رکھتی ہیں۔ بچت کی تھیوری پر قطعی یقین نہیں۔ ان کا اپنا نظریہ یہ ہے کہ روپیا اپنی حیثیت میں کاغذ یا دھات کا حقیر سا ٹکڑا ہے۔ اسے اشیا کی صورت میں فوراً تبدیل ہو جانا چاہیے اور وہ اشیا کیا ہوں، کپڑے، کتابیں اور کراکری۔

پروفیسر صاحبہ نے صحافت سے آغاز کیا تھا۔ تدریس میں زندگی گزاری اور اب آخر میں پھر صحافت کی جانب آ گئی ہیں۔ سرسیّد احمد خان کا رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جو علی گڑھ سے سفر کرتا ہوا کراچی آ گیا ہے ''تہذیب'' کے نام سے ہر ماہ نکلتا ہے، اس کی مدیر ہیں۔

شاعر کی بہن، شاعر کی بیٹی، شاعر کی پوتی، شاعر کی پڑپوتی۔ آگے تک شجرۂ نسب کھنگا لیے تو شاعری سے جان نہیں چھوٹے گی۔ لہٰذا شاعری زیادہ پڑھتی ہیں، مگر خود کو نثر کا پابند کیا ہوا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد ''کالج کی تدریس کے چالیس سال'' میں گم ہو جانے کا ارادہ ہے۔ اپنی کتاب پر کسی سے مقدمہ لکھوانا پسند نہیں اور تعارفی تقریب سے بھی گریز کرتی ہیں کہ دو گھنٹے چار پانچ مقررین کی تعریف سے بھرپور تقریر بغیر منہ چھپائے سننا مشکل ترین کام ہے۔ یوں تو پروفیسر صاحبہ پر میں خود بھی ایک ضخیم کتاب لکھ سکتا ہوں، مگر یہ کام تو جان کی امان پانے کے بعد ہی ممکن ہے۔

نثار اختر